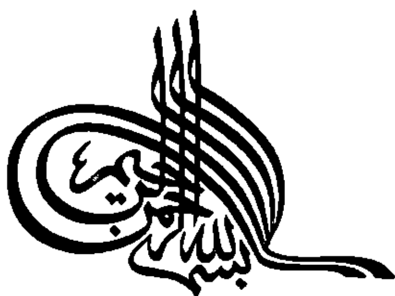
اسرائیل کی
دیدہ و دانستہ
فریب کاریاں



محترم پال فنڈلے کی معرکۃ الآرا کتاب
Deliberate Deceptions
کا اردو ترجمہ

مترجم: سعید رومی

اسرائیل کی دیدہ ودانستہ فریب کاریاں


بسم الله الرحمن الرحيم

سال اشاعت ۲۰۰۹ء

ISBN 81-87856-11-4

نام کتاب	: اسرائیل کی دیدہ ودانستہ فریب کاریاں
تالیف	: پال فنڈلے
مترجم	: سعید رومی
تعداد اشاعت	: ۱۰۰۰ (ایک ہزار)
اشاعت سوم	: ۲۰۰۹ء
قیمت	: ایک سو چالیس روپئے (Rs.140/-)
مطبع	: گلوریس پرنٹرس، دہلی ۔۹۲

ناشر

ملی پبلی کیشنز

ملی ٹائمز بلڈنگ، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی ۔۱۱۰۰۲۵

Tel:. +91-11-26945499, 26946246

Fax: +91-11-26945499

Email:militime@del3.vsnl.net.in

millitimes@gmail.com

www.millipublications.com

اسرائیل کی

دیدہ و دانستہ

فریب کاریاں

Deliberate Deceptions

مصنف

پال فنڈلے

مترجم

سعید رومی

ملّی پبلی کیشنز، نئی دہلی-۲۵

عرضِ ناشر

اہل یہود اس وقت ایک انتہائی خطرناک کھیل کھیل رہے ہیں۔ بظاہر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ دنیا ان کی مٹھی میں آ گئی ہے۔ تسخیر عالم کے اس منصوبے میں انہیں یہ کامیابی اس لئے نہیں ملی کہ وہ خیر امت ہیں بلکہ انہوں نے بزور بازو شاطرانہ اسکیموں کے ذریعے یہ کامیابی حاصل کی ہے۔ افسوس ہوتا ہے کہ جس امت کو کبھی خود رب کائنات نے سیادت عالم کے منصب پر فائز کیا تھا وہ اپنے کھوئے ہوئے منصب کو دوبارہ حاصل کرنے کے لئے نبوی منہج کے بجائے شیطانی راستے پر چل نکلی۔ اہل یہود کی اس گمرہی کے نتیجے میں نہ صرف یہ کہ وہ خود ہدایت سے دور ہوئے بلکہ پوری دنیا فتنہ و فساد سے بھر گئی۔

بات دراصل یہ ہے کہ اہلِ یہود کے فقہی علوم نے انہیں یہ باور کرایا ہے کہ وہ خدا کی برگزیدہ اور منتخب قوم ہیں اور یہ کہ ان کے لئے غیر یہودی قوموں کی جان و مال اور ان کی عزت و آبرو کچھ بھی معنی نہیں رکھتی۔ لہٰذا قوم یہود کی برتری اور ریاست اسرائیل کے استحکام کے لئے جو بھی اخلاقی یا غیر اخلاقی قدم اٹھایا جائے گا وہ سب یہودی ربائیوں اور فقیہوں کے نزدیک درست ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ اس وقت پوری دنیا میں اہل یہود کے مذہبی افراد اپنے مقاصد کے حصول کے لئے ہر قدم اٹھانے کو تیار ہیں۔

جب سے پال فنڈلے کی کتاب *They Dare to Speak Out* علامہ سعید رومی کے اردو ترجمے کے ساتھ منظرِ عام پر آئی ہے اہل یہود کی خفیہ پراسرار دنیا سے سریت کا حجاب چاک ہوگیا ہے۔ 'شکنجۂ یہود' جو اس کتاب کی اشاعت سے پہلے آپ کے ہاتھوں میں پہنچ چکی ہے کہنے کو محض ایک ترجمہ ہے لیکن فاضل مترجم نے اس کے ترجمے میں جو خونِ جگر استعمال کیا ہے اس کی نظیر اردو کے خالص علمی اور ادبی ترجموں میں بھی نہیں ملتی۔ اس کتاب کی اشاعت سے اردو دنیا میں اہلِ یہود

کے سلسلے میں دلچسپی کا ایک نیا باب رقم ہوا ہے۔

یہ محض اللہ کا فضل ہے کہ فاضل مصنف کی ایک دوسری کتاب Deliberate Deceptions کا اردو ترجمہ شائع کرنے کی سعادت حاصل ہو رہی ہے۔ آپ جوں جوں کتاب پڑھتے جائیں گے اندازہ ہوگا کہ آپ ایک پراسرار دنیا میں داخل ہو رہے ہیں۔ البتہ اس دنیا کی سیر کے دوران ہمیں عملی زندگی سے تعلق ٹوٹتا نہیں محسوس ہوتا اور ہم محسوس کرتے ہیں کہ یہ پراسرار کردار جو شب و روز ہمارے اردگرد حرکت میں ہیں عام جانے پہچانے چہرے ہیں، جنہیں ہم مختلف ناموں اور منصب کے حوالے سے اعزاز و احترام کا حقدار سمجھتے رہے ہیں۔ پال فنڈلے کی حیثیت ایک محرمِ رازِ درونِ مے خانہ کی ہے اس لئے انہوں نے جو کچھ لکھا ہے اس پر معروضیت کی چھاپ نمایاں ہے۔ جو لوگ قرآن مجید میں اہلِ یہود سے متعلق تنقید سے واقف ہیں انہیں اس کتاب کو پڑھتے ہوئے مانوسیت کا احساس ہوگا۔ یہ وہی اہلِ یہود ہیں جو کبھی " فاذهب انت و ربک فقتلآ اِنّا هٰهُنا قٰعِدون" کہہ کر راست تصادم سے پیچھے ہٹ گئے تھے آج بھی اہلِ یہود اپنی تمام جنگیں دوسروں کے کندھوں پر بندوقیں رکھ کر لڑ رہے ہیں۔ بظاہر تو یہ اسکیم کامیاب نظر آتی ہے لیکن جو لوگ تاریخ سے معمولی واقفیت رکھتے ہیں ان کی نگاہیں دیکھ رہی ہیں کہ اس کھیل کا انجام کیا ہونے والا ہے۔ یہودیوں نے کبھی یوروپ کی حکومتوں کو مالی تعاون کے ذریعے اپنا ہم نوا بنایا تو کبھی مشرقی یوروپ میں معیشت کو یرغمال بنانے کی کوشش کی۔ مشرقی یوروپ اور جرمنی میں انہیں جس نفرت کا سامنا کرنا پڑا اس کے تذکرے سے پوری یہودی قوم آج بھی سراسیمہ ہو جاتی ہے۔ افسوس کہ اس صورتحال کا گہرا تجزیہ کرنے اور اس سے سبق لینے کے بجائے یہودی دانشور اور ربائی اسے محض anti-semitism کہہ کر رد کر دیتے ہیں۔ اب دیکھئے دنیا کی سب سے عظیم قوت اور سب سے زیادہ وسائل والی حکومت امریکہ کے پالیسی سازوں کو اہل یہود نے جس طرح شکنجے میں لے رکھا ہے اس کا ردعمل کس طرح سامنے آتا ہے۔ اس کتاب کا مطالعہ صرف حال کو ہی نہیں بلکہ مستقبل کو سمجھنے میں بھی مدد دیتا ہے۔ خدا کرے تمام کھلی آنکھوں والے انسان اہلِ یہود کے اس خطرناک کھیل کے اسرار و عواقب سے آگاہ ہو سکیں۔

کوثر فاطمہ

یکم مئی ۲۰۰۳ نئی دہلی

فہرست

حصہ اول: فتح اور قیام ریاست

حصہ دوم: تصادم اور ملی بھگت

حصہ سوئم: اندیشہ ہائے امن

❋ ❋

دیباچہ طبع ثانی

واشنگٹن میں ۱۳ستمبر ۱۹۹۳ء کی صبح ''وائٹ ہاؤس'' کے جنوبی لان میں تیرہ سو مہمانوں کا جمگھٹا تھا۔ ان میں امریکہ کی مشرق وسطیٰ پالیسی کے دیرینہ نکتہ چیں... جن میں میرا بھی شمار ہے... اور اتنے ہی حمایتی بھی موجود تھے... اس دن ہم سب کے حوصلے بلند تھے اور اس سادہ چبوترہ پر اپنی اپنی نشست پر براجمان ہونے سے پہلے ہم گرم جوشی سے باہمی تبادلہ خیال کر رہے تھے۔

صدر کلنٹن نے ہمیں اسرائیل کی حکومت اور تنظیم آزادی فلسطین کے مابین طے پا جانے والے معاہدہ کی دستخطوں کی تقریب کا مشاہدہ کرنے کے لیے مدعو کر رکھا تھا۔ یہ معاہدہ جو ناروے کے ایک سفارت کار کی کوششوں سے خفیہ طور پر طے پایا تھا۔ کئی مبصرین کے خیال میں عرب/ اسرائیل تنازع کے سلسلہ میں ایک تاریخی پیش رفت کا حامل تھا۔ گذشتہ جمعرات کے اس اعلان نے کہ فلسطینی رہنما یاسر عرفات اور اسرائیلی وزیر اعظم اضحاک رابن اس تقریب میں بنفس نفیس شرکت کریں گے ساری قوم کو گرما دیا تھا۔

جب ایک مسکراتا ہوا باوقار عرفات، صدر کلنٹن اور رابن کے ہمراہ وہائٹ ہاؤس سے برآمد ہوا تو حاضرین نے پر تپاک خیر مقدم کیا۔ چند روز پہلے تک تو امریکی اور اسرائیلی حکام اس کو دہشت گرد قرار دے کر اس سے گریزاں تھے!

چبوترے پر اس جذبات سے بھرپور تقریب میں جب صدر کلنٹن نے اپنے بازوؤں کی جنبش سے ان دیرینہ حریفوں کو باہم ایک مصافحہ میں یکجا کیا تو یہ جنگ عظیم کے بعد گویا ایک عظیم ترین علامتی تصویر تھی۔

یہ ایک عظیم لمحہ تھا...!

یہ ایک عظیم تھیٹر بھی تھا جس کا مسودہ اور حرکات و سکنات گذشتہ ہفتے نہایت احتیاط سے لکھے گئے تھے اور جن کی مشق کر لی گئی تھی۔ یہ سب کچھ ایک صدارتی نمائندے کی زیر ہدایت ہو رہا تھا۔

رابن اور یاسر عرفات کے ہمزادوں کی مدد سے صدر کلنٹن نے اپنے حصہ کی اچھی طرح مشق کی تھی! تقریب کے اختتام پر اسے دونوں لیڈروں کے درمیان کھڑے ہوکر باری باری دونوں سے ہاتھ ملانا تھا۔ پھر ایک قدم پیچھے ہٹ کر اپنے بازوؤں کو اس انداز سے جنبش دینی تھی جیسے عرفات اور رابن کو باہم مصافحہ پر آمادہ کررہا ہو۔

تقریب بعینہٖ متوقع طور پر وقوع پذیر ہوئی کلنٹن کے مہمانوں اور اس وقت تک دنیا کے ٹیلی ویژن ناظرین کے سب سے بڑے گروہ کو یقین تھا کہ یہ تاریخ ساز واقعہ ایک اصناف بھری صلح کا پیش خیمہ ثابت ہوگا۔ اس معاہدہ میں فلسطینیوں کو پی ایل او کی قیادت میں پہلے غزہ کی پٹی اور جیریکو میں خود اختیاری اور بعد ازاں تمام غرب اردن میں سیلف رول کا پروگرام درج تھا۔ مشرقی یروشلم کے بارے میں بات چیت اور دیگر بنیادی امور پر تصفیہ کی بات چیت اپریل ۱۹۹۶ء سے پہلے پہلے شروع ہونی تھی!

یہ دستخط کرکے رابن اور عرفات دونوں نے بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ دیا تھا! عرفات چونکہ اس معاہدے کی پرجوش تعبیر کرتے ہوئے اسے آزاد فلسطینی ریاست کے قیام کی جانب ایک پہلا قدم تصور کرتا تھا۔ لہٰذا جو یہودی آبادکاران مقبوضہ علاقوں میں رہائش پذیر تھے وہ اسے اپنے گھروں کے لیے ایک سنگین خطرہ تصور کرتے تھے۔ ۱۹۹۴ء میں لیکڈ پارٹی جو انتخاب ہار چکی تھی وہ بھی اس احتجاج میں شامل ہوگئی اور اس قدر واویلا مچا کہ رابن کی اسرائیلی پارلیمنٹ میں مہین سی اکثریت معدوم ہوتی نظر آنے لگی!

فلسطینیوں کا احتجاج جس میں مقبوضہ علاقوں کے اندر حماس جیسی منظم تحریک بھی شامل تھی کافی بنیادی اور دیرپا تھا۔ عرفات کو کئی ممتاز پی ایل او لیڈران کی امداد سے محروم ہونا پڑا۔ ان کا خیال تھا کہ یہ سب ایک اسرائیلی پھندا ہے جس سے ارض فلسطین اور فلسطینیوں پر اسرائیلی کنٹرول ایک جائز قانونی قبضہ کا حق حاصل کرکے آزاد فلسطینی ریاست کے قیام کو دور از کار بنادے گا۔ انہی میں سے ایک ایڈورڈ سعید بھی تھا۔ وہ کولمبیا یونیورسٹی میں بطور ایک فلسطینی نژاد پروفیسر کے کام کررہا تھا۔ ''دی نیشن'' کے ۱۴ر فروری ۱۹۹۴ء کے شمارہ میں اس نے لکھا: ''جزوی آزادی یا محدود خودمختاری ایک واہمہ کے سوا کچھ نہیں۔ سیاسی آزادی کے بغیر نہ حاکمیت کا وجود ہوتا ہے اور نہ ہی حقیقی آزادی کا...'' بعض لحاظ سے عرفات کا یہ فیصلہ ایک جان پر کھیل جانے والا عمل تھا۔ کویت پر عراقی قبضہ کے خلاف اتحادیوں کی جنگ کے موقع پر اس کے ردِعمل نے اس کے اقتصادی قلعے کو منہدم کردیا تھا اور اب اسے

کہیں سے بھی قابل ذکر امداد کی توقع نہ تھی۔ امریکہ میں وقفہ وقفہ سے ہونے والی امن بات چیت کی بیل منڈھے چڑھتی دکھائی نہ دیتی تھی اور ایک ایسی تنظیم جس کی بنیاد تیونس میں ہو لیکن اسرائیل اور امریکہ دونوں ہی اسے درخورِ اعتناء نہ سمجھیں ایک لاتعلق سی شے بن کر رہ گئی تھی۔ ایسے حالات میں عرفات نے خفیہ طور پر پیش کی گئی اسرائیلی تجاویز پر صاد کیا حالانکہ اس سے اس کی تنظیم کو خطرہ لاحق تھا اور اس کے آزاد فلسطینی ریاست کے خواب کو دھچکا لگ سکتا تھا۔

وائٹ ہاؤس میں عرفات اور رابن دونوں نے خوشنما الفاظ سے کلنٹن کی راگنی میں اپنی لے ملائی۔ اس سے جو نغمہ فزا ماحول بنا اس کا اثر آج تک باقی ہے۔ سال بھر ہونے کو آیا لیکن امریکہ میں خوش فہمی کا دور دورہ اب تک ہے۔ اسے وہی ذرائع ابلاغ زندہ رکھے ہوئے ہیں جو ہر وقت اسرائیل کی دریا دلی اور مستقل مزاجی کے گن گاتے رہتے ہیں اور فلسطینیوں میں کیڑے نکالتے رہتے ہیں۔ امریکنوں کو یہ یاد دہانی کروائی جاتی تھی کہ نظم الاوقات میں تاخیر کے باوصف اسرائیل نے سیاسی قیدوں کو رہا کر دیا تھا، غزہ کی پٹی اور جیریکو میں پولیس کے فرائض فلسطینی افسران کے سپرد کر دیے گئے ہیں اور ان مقامات کے علاوہ چند دوسرے مقبوضہ علاقوں میں بھی محدود پیمانے پر فلسطینیوں کو حق خود اختیاری کی بعض تنظیمیں بنانے کی اجازت دے دی تھی۔

اس ہما ہمی میں یہ بھلا دیا جاتا کہ اسرائیل اب بھی فلسطینیوں کے حقوق کو غصب کئے بیٹھا ہے۔ مئی ۱۹۹۴ء میں اس نے بیروت کے نواح سے ایک فلسطینی لیڈر کو اغوا کیا تھا۔ جنوبی لبنان میں شام کی سرحد پر اندھا دھند بمباری کر کے بیسیوں شہریوں کو ہلاک کیا تھا اور مقبوضہ علاقے میں یہودی آبادکاریوں نے ظلم و ستم کا بازار گرم کر رکھا تھا۔ ان سب کو تبدیلی حالات کی ناگزیر قیمت کہہ کر نظر انداز کر دیا جاتا تھا۔

۲۵ر جولائی ۱۹۹۴ء کو ان امیدوں کو اور بھی بڑھاوا ملا جب اردن کے شاہ حسین اور وزیر اعظم رابن نے ایک باہمی دستاویز پر دستخط کر کے صدر کلنٹن سے دونوں ممالک کے لیے مزید امداد کا وعدہ لیا۔ ''مبارک! سلامت!'' کے اس شور و غوغا میں اس دستاویز سے صرف یہی ہوا کہ دونوں ممالک کے درمیان حالت مخاصمت کا خاتمہ ہونے کا اعتراف باضابطہ طور پر ہو گیا جو کہ سالہا سال سے ایک طے شدہ حقیقت تھی! ذرائع ابلاغ نے رابن، شاہ حسین کے مصافحہ کی اصل اہمیت کو بالکل نظر انداز کر دیا۔ یہ ایک طویل عہد کا خاتمہ تھا جس کے دوران ماسوا مصر کے دوسرے تمام عرب ممالک نے اسرائیل کے

ساتھ براہ راست معاہدہ کرنے سے انکار کردیا تھا جب تک کہ وہ فلسطینیوں کے حقوق بحال نہ کرے۔

درحقیقت یہ عہد نو ماہ پیشتر اس وقت ختم ہو چکا تھا جب عرفات نے بحیثیت پی ایل او سربراہ کے خفیہ طور پر اسرائیل سے معاہدہ طے کرلیا تھا۔ تمام عرب ممالک میں صرف اسی تنظیم کو فلسطینیوں کے حقوق کی واحد جائز نمائندہ تنظیم تسلیم کیا جاتا تھا۔ عرفات نے یہ شرائط تسلیم کرتے وقت دوسرے عرب لیڈروں سے صلاح مشورہ تو درکنار انہیں مطلع کرنا ضروری نہ سمجھا تھا۔ چونکہ پی ایل او آزادانہ طور پر اسرائیل کے ساتھ سودا کرچکی تھی۔ لہٰذا اب اردن کی طرح تمام دوسرے عرب ممالک بھی ایسا کرنے میں آزاد تھے۔

نقادوں کا یہ خیال ہے کہ رابن نے عرفات کو اپنے دام میں پھنسا کر فلسطینیوں کی پشت پر موجود عرب اتحاد کو پارہ پارہ کردیا۔ صاف ظاہر ہے کہ اس معاہدے سے اسرائیل کے اس دیرینہ خواب کی تعبیر کو مزید تقویت ملی کہ وہ تمام عرب ممالک سے الگ الگ تصفیہ امن کرسکے۔ عرب اتحاد برائے مسئلہ فلسطین اب ایک قصہ پارینہ ہے۔ فلسطین اب بالکل تنہا کھڑا ہے۔ اسے اسرائیل اور اس کے اتحادی امریکہ کے رحم وکرم پر اور بھی زیادہ انحصار کرنا ہے۔ جیسا پہلے کبھی نہ تھا!

شاہ حسین/ رابن ملاقات سے کہیں پہلے مقبوضہ علاقوں میں بپھرے جذبات پر حقیقت غلبہ پا چکی تھی۔ اب وہاں مایوسی، قنوطیت اور سنکی پن کا دور دورہ تھا۔ بہت سے فلسطینی اس حق خود انتظامی کو ایک ڈھکوسلہ قرار دیتے ہیں جس سے اسرائیل کو فلسطین کا تیا پانچا کرنے کی مزید مہلت ملے گی۔ اس عمل میں اہم ٹھکانوں پر واقع یہودی بستیوں کی تعمیر وتوسیع کے درمیان شاہراہوں کا جال بچھانا اور مشرقی یروشلم میں عرب آبادی کے گرد پھندے کو تنگ کرنا شامل ہے۔ اسرائیل کا مقصد فلسطینیوں کو چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں منقسم کرکے بیرونی دنیا کے ذہن سے محو کرنا اور ان کے اپنی ریاست اور عزت نفس کے حصول کو عملاً ناممکن بنا دینا ہے۔ ایک طرف تو امریکی ذرائع ابلاغ اس امن معاہدہ کا ڈھنڈورا پیٹتے ہیں اور اسی کی آڑ میں اسرائیل کے ان تمام درشت اقدامات کو نظرانداز کردیا جاتا ہے جو وہ اپنے مقصد کے حصول کے لیے روبہ عمل لارہا ہے۔ ایک انتہائی اقدام وہ بندش ہے جو مارچ ۱۹۹۳ء سے عائد کی گئی ہے۔ اس کے تحت تمام فلسطینی باشندوں کو چاہے وہ غزہ اور جیریکو کے داخلی خودمختار علاقوں میں ہی کیوں نہ رہتے ہوں!... بالکل قیدیوں کی مانند چھوٹے چھوٹے محصور قصبوں میں رکھنا تھا جہاں انہیں بیرونی ملازمت، تجارت اور سفر کی قطعاً آزادی نہ تھی۔ اس وقت جب کہ یہ

لکھا جا رہا ہے... یعنی رابن، عرفات مصافحہ کو پورا سال گزر جانے کے بعد... یہ تذلیل آمیز اور تباہ کن پالیسی اب بھی نافذ ہے اور تمام فلسطینیوں کے لیے مقبوضہ علاقوں میں بطور ایک عذاب مسلط ہے۔ اس سے جنوبی افریقہ کے بانٹستان علاقوں کی نظر بندی کی یاد تازہ ہو جاتی ہے جو نسلی امتیاز کی پالیسی ختم ہونے سے پہلے موجود تھی۔ ''مڈل ایسٹ انٹرنیشنل'' کے ۱۰ر جون ۱۹۹۴ء کے شمارے میں مائیکل جیسن نے لکھا: ''جیریکو اور غزہ میں رہائش پذیر فلسطینیوں کی حالت زار جنوبی افریقہ کے ان سیاہ فام باشندوں سے کہیں بدتر تھی جنہیں ان کے اپنے علاقوں میں نظر بند کر دیا گیا تھا۔''

اسرائیلی حکومت دوسرے تیا پانچا کرنے والے اقدامات پر بھی عمل پیرا ہے۔ مثال کے طور پر کہیں فلسطینیوں کی نقل و حرکت پر پابندی ہے۔ یعنی دن رات کا کرفیو نافذ ہے۔ یہ چیز بطور ایک کنٹرول نافذ کرنے والے عمل کے اس پابندی سے بھی بڑھ کر ہے جو علاقہ بندی سے کی جاتی ہے۔ اس بارے میں تمام اسرائیلی یاد دہانیوں کے برعکس اس کا نفاذ صرف فلسطینیوں پر ہوتا ہے۔ ۷ر مارچ ۱۹۹۴ء کو اسرائیلی وزیر خارجہ شمعون پیریز نے CNN کو انٹرویو دیتے وقت دنیا کے کروڑوں ناظرین کو یہ سفید جھوٹ باور کرانے کی کوشش کی تھی کہ کرفیو کا نفاذ یہودی آبادکاروں اور فلسطینیوں پر یکساں طور پر ہوتا ہے... ''... اگر عربوں پر کرفیو نافذ ہوگا تو یہودی آبادکاروں پر بھی اس کا نفاذ ہوگا''... جب ایک نامہ نگار نے اسے بتلایا کہ یہودیوں پر کرفیو کا نفاذ نہیں کیا جاتا تو پیریز کا اصرار تھا۔ ''ہم یکساں برتاؤ کرتے ہیں!'' پیریز کے اس اصرار کے باوجود یہودی آبادکاران پابندیوں سے مستثنیٰ اور آزادی سے گھوم پھر سکتے ہیں۔ علاوہ ازیں انہیں اسرائیلی شہری قوانین کے تحت زیادہ آزادیاں حاصل ہیں جب کہ فلسطینیوں کو درشت فوجی قوانین کے تحت زندگی گزارنا ہوتی ہے۔ لیبر کے مقابلے میں لیکڈ پارٹی کے زمانہ میں بھی تیا پانچا کرنے کا عمل جاری ہے۔ لیکڈ والے عالمی رائے عامہ کی اعلانیہ دھجیاں اڑاتے ہیں جب کہ لیبر حکومت کے تحت... رابن کے اپنے اعتراف کے بموجب... یہ تشدد چپ چپاتے اور دھوکہ دہی سے عمل میں لایا جاتا ہے۔

۱۹۹۰ء کے خزاں میں اپنی اس سیاسی مہم کے دوران جس نے دو سال بعد اسے پھر وزیر اعظم بنا کھڑا کیا۔ رابن نے کھلے عام اس دغا فریب کا اعتراف کیا جس سے اس نے امن کے راستے میں روڑے اٹکائے تھے۔

ان دنوں وزیر اعظم ٹیزاق شامیر کی لیکڈ پارٹی اپنی نئی آبادکاریوں پر شیخی بگھار رہی تھی۔ اس کا

خیال تھا کہ یہ پالیسی یہودی آبادکاروں میں مقبول تھی اور الیکشن کے دن زیادہ ووٹ کھینچنے کا سبب بنے گی۔ شامیر نے اس بارے میں کبھی بھی معذرت خواہانہ رویہ اختیار نہ کیا تھا۔ مختلف اوقات میں اس نے کئی کئی آبادیوں کی افتتاحی تقاریب میں حصہ لیا جو خاص طور پر ایسے دنوں میں رکھی جاتیں جب کہ ان کا ایک کڑا ناقد یعنی امریکی وزیر داخلہ جیمز بیکر اپنے سرکاری دورے پر اسرائیل آیا ہوتا۔

۱۹۹۰ء کی انتخابی مہم کے دوران رابن نے بھی اپنی چالاکی کو خیرباد کہہ دیا۔ اس نے رائے دہندگان کو بتلایا کہ لیکڈ پارٹی نے شامیر کی انتظامیہ کے اقتدار میں آنے سے کہیں پہلے آبادکاری کے میدان میں پیش رفت شروع کی تھی۔ البتہ یہ سب کچھ قدرے چالاکی اور عیاری سے کیا گیا تھا تاکہ امریکی حکومت کو نکتہ چینی کا موقع نہ ملے!

ایک اسرائیلی اخبار ''داور'' کے ۱۸؍اکتوبر ۱۹۹۰ء کے شمارے میں لیکڈ کی شیخیوں کے بارے میں رابن کا جواب یوں درج ہے۔ ''اپنی تمام تر خامیوں کے باوجود لیبر پارٹی نے (یہودی نوآبادیوں کو وسعت دینے میں) اپنا بھرپور کردار ادا کیا ہے اور اب بھی وہ لیکڈ کے مقابلے میں ایسا کرنے کی زیادہ اہل ہے۔ ہم نے کبھی یروشلم کے بارے میں بات نہیں کی۔ ہم نے صرف وہ کر دکھایا جو ہم چاہتے تھے۔ یہ ہم ہی تھے جنہوں نے اس کے مضافاتی علاقے میں تعمیرات کیں۔ امریکنوں نے ایک لفظ بھی منہ سے نہ نکالا۔ کیونکہ ہم نے یہ تعمیرات چالاکی سے بنائیں۔'' وہ جن مضافات کا ذکر کر رہا تھا وہ مشرقی یروشلم کے اردگرد فلسطینیوں سے زبردستی ہتھیایا ہوا علاقہ تھا جس پر یہودی بستیاں تعمیر کی گئیں۔ اس حیران کن لیکن قدرے غیر معروف انکشاف حقیقت میں تو رابن اپنا کلیم مشرقی یروشلم کے ماوراء بھی کر سکتا تھا۔ غزہ اور مغربی کنارے کی بیشتر موجودہ اور تمام تر یہودی بستیاں اس وقت بسائی گئی تھیں جب لیبر حکومت پر برسراقتدار تھی۔

رابن کا یہ اعتراف ان لوگوں کے لیے ایک معقول جواب ہے جو یہ کہتے ہیں کہ یہ بستیاں لیکڈ پارٹی کے دورِ حکومت کی ایک ناپسندیدہ وراثت ہیں۔ اگر لیبر حکومت برقرار رہتی تو یوں نہ ہوتا۔

آبادکاری کے معاملے میں اصل فرق صرف یہ ہے کہ لیبر پارٹی لیکڈ سے زیادہ مکارانہ طرز عمل اختیار کرتی ہے۔ جب رابن وزیر اعظم بن گیا تو اس نے ''آبادکاری پر قدغن'' کا اعلان تو کیا لیکن اندرخانے وسعت جاری رکھی۔ اس نے Plan Sheve پر عمل شروع کرا دیا۔ یہ شمعون شیو کے نام سے موسوم تھی جو وزیر اعظم کے سیکرٹریٹ میں ڈائریکٹر جنرل تھا۔ اس پلان میں ان بستیوں کی توسیع اور رابطہ

سڑکوں کی تعمیر کو نہایت مکاری سے ''ترقی و توسیع'' کے خوش نما لیکن گمراہ کن الفاظ میں چھپا دیا گیا تھا۔

یروشلم میں واقع ''فلسطینی انسانی حقوق اطلاعاتی مرکز'' کا کہنا ہے کہ ''(رابن کے دور میں) بستیوں کی تعمیر میں کوئی وقفہ یا ٹھہراؤ نہیں تھا۔ اس کی بجائے صرف ایریل شیرون کے مقبوضہ علاقوں سے فلسطینیوں کو نکال باہر کر کے قبضہ مکمل بنانے کی بجائے اب حکمت عملی سے ان علاقوں کا کنٹرول سنبھالنے اور قبضہ مستحکم کرنے، چنیدہ علاقوں کو اسرائیل میں ضم کرنے اور فلسطینی علاقوں کو پارہ پارہ کر کے یہودی بستیوں کے نرغے میں لانا جیسے اقدامات شامل ہیں۔''

جب رابن نے یہ اعلان کیا کہ اسرائیل یہودی نو آبادکاروں کی سرکاری امداد روک رہا ہے تو یہ فریب پھر ابھرا۔ امریکہ میں اس اعلان نے تہلکہ مچا دیا۔ اس سے امریکی صدر جارج بش کو اپنے آخری صدارتی ایام میں وہ بہانہ ہاتھ آیا جس کے باعث اس نے اسرائیل کو دس ارب ڈالر کے قرضے کی گارنٹی پاس کروائی اس سے اور باتوں کے علاوہ نو آبادکاروں کی بستیوں میں توسیع کی سہولت میسر ہوئی۔ درحقیقت یہ اعلان ایک فریب تھا۔ رابن حکومت نے ۷۶ مختلف نو آباد یہودی بستیوں کو فیاضانہ معتد بہ امداد جاری رکھی۔ یہ ساری بستیوں کا تقریباً نصف ہیں۔ چھ آبادیوں میں امداد کی سطح اٹھارہ ہزار ڈالر تک تھی۔ جو جگہ مغربی یروشلم میں ایک لاکھ پینتالیس ہزار ڈالر مالیت رکھتی تھی وہ نو آبادکاروں کو صرف ساٹھ ہزار ڈالر میں مہیا کی جا رہی تھی۔

رابن نے مشرقی یروشلم اور اس کے مضافات کو بالخصوص اس جمود سے استثناء دے رکھا تھا۔ اس علاقے میں نو آبادکاروں کو پانچ سال تک میونسپل ٹیکس معاف ہیں اور بعد ازاں رعایتی نرخ وصول کئے جاتے ہیں۔ یہ اسی امتیازی سلوک کا نتیجہ ہے کہ مشرقی یروشلم میں رہائش پذیر فلسطینی دوسرے باشندوں کے مقابلے میں پانچ گنا زیادہ ٹیکس ادا کرتے ہیں۔

مشرقی یروشلم... جسے عام طور پر عرب یروشلم پکارا جاتا ہے... میں رہنے والے فلسطینیوں کی حالت دوسرے مقبوضہ علاقوں کے باشندوں سے کہیں بدتر ہے۔ ۱۹۶۷ء کی جنگ کے بعد مشرقی یروشلم میں شامل ۱۱۷۶۲۵ ایکڑ عرب علاقے کو مغربی یروشلم میں ضم کر دیا گیا تھا۔ یروشلم مرکز اطلاعات کے بموجب اس میں سے صرف ۱۳٫۵ (ساڑھے تیرہ) فیصد علاقہ عرب باشندوں کے لیے مختص کیا گیا تھا۔ یہ ذرا سا علاقہ بھی ٹکڑوں میں بٹا ہوا الگ الگ وہ علاقہ تھا جہاں پہلے ہی کثیر آبادی اور اژدہام تھا۔

برخلاف اس کے مشرقی یروشلم کا ۴۲ فیصد علاقہ صرف یہودی بستیوں کے لیے مخصوص کر دیا گیا تھا۔ اس حصہ میں پچاس ہزار سے زائد سرکاری رہائشی یونٹ تعمیر ہو چکے ہیں اور ۲۲۰۰۰ مزید بنانے کا

پلان ہے۔ اسرائیل نے بقیہ مقبوضہ علاقہ یعنی تقریباً ۴۲ فیصد کو ماحولیات کے تحفظ کے بہانے خالی رکھا ہوا ہے جو وقت آنے پر مزید بستیوں کی تعمیر کے لیے مہیا کردیا جائے گا۔

اسرائیل بتدریج ایسے قوانین کا گھیرا تنگ کیے چلا جاتا ہے جن سے مشرقی یروشلم میں فلسطینیوں کا رہنا دشوار تر ہوتا جائے۔ پچاس ہزار سے زائد کو یہ بہانہ کرکے کہ وہ ۱۹۶۷ء میں گھروں پر موجود نہیں تھے یا کہیں قریب ہی کسی دوسرے مقام پر منتقل ہوگئے تھے، وقتی طور پر مستقل رہائشی اقامہ دینے سے محروم کردیا گیا۔ بیرونی ممالک سے یونیورسٹی کی تعلیم حاصل کرکے لوٹنے والے نوجوانوں کو اکثر اپنے اقامتی حقوق سے محرومی کا سامنا ہوتا ہے۔ مشرقی یروشلم میں بچھڑے خاندانوں کا ملاپ دوسرے تمام مقبوضہ علاقوں سے کہیں زیادہ وقت طلب ہے۔ صرف وہی فلسطینی شہر میں آزادانہ آجاسکتے ہیں جو یہ ثابت کرسکیں کہ وہ خود یا ان کے والدین ۱۹۶۷ء سے مشرقی یروشلم میں رہائش پذیر ہیں۔ بقیہ صرف تب ہی داخل ہوسکتے ہیں جب ان کے پاس خصوصی داخلے کا اجازت نامہ ہو۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مقبوضہ علاقوں کے فلسطینی باشندے اپنے مذہبی رسومات ادا کرنے کے لیے بھی مشرقی یروشلم میں داخل نہیں ہوسکتے۔ یہ اس قدیم اسرائیلی اعلان کی کھلی نفی ہے کہ مذہبی اداروں تک جانے کی ہر کسی کو کھلی آزادی ہوگی۔

مشرقی یروشلم میں واقع ۹۱ فیصد ذاتی تعمیر شدہ مکانات یا تو غیر معیاری ہیں یا پرہجوم لیکن اسرائیلی قبضہ کی وجہ سے ان میں بہتری ناممکن بنادی گئی ہے۔

اسرائیلی حکام سال بھر میں کوئی ۱۵۰ کے قریب فلسطینیوں کو مکانات کی تعمیر کے پرمٹ جاری کرتے ہیں۔ چاہے اس سے ان اکیس ہزار خاندانوں کو جو بے گھر ہیں کتنی ہی مشکلات کا سامنا کیوں نہ ہو۔ ان میں سے کچھ غاروں، خیموں یا عارضی جھونپڑوں میں رہ رہے ہیں۔ اس کے برخلاف یہودی آبادکاروں کو تعمیر پرمٹ اور سرکاری امداد بغیر کسی مشکل کے میسر ہیں۔

قصہ مختصر یہ کہ رابن اپنی اسی پالیسی میں لگاتار پیش رفت کررہا ہے جس کے ذریعے چھوٹے چھوٹے قصبہ جات بسائے جارہے ہیں جنہیں اسرائیلی حکام نہایت آسانی سے کرفیو لگا کر علاقہ بندی کرکے یا دوسرے اقدامات سے مؤثر طور پر کنٹرول کرسکتے ہیں۔

اسرائیل کی نسلی علیحدگی پسندی ترقی کی طرف گامزن ہے! ایسی ہی ''مکاری'' سے کام لیتے ہوئے رابن کی حکومت ساٹھ کروڑ ڈالر کی لاگت کا ایک شاہراہ منصوبہ اور نئی بستیاں تعمیر کررہی ہے۔ یہ سب مقبوضہ علاقے میں ہورہا ہے اور ہر دفعہ فلسطینی علاقے کی ضبطی اور ان کے رہائشی مکانات اور فارموں کی تباہی کے احکامات جاری کیے جاتے ہیں۔ اس منصوبے کے لیے تقریباً تمام رقم فراہم

کرنے والی ایجنسی یعنی امریکی حکومت چوں بھی نہیں کرتی! رابن عرفات مصافحے کے تین ماہ بعد بھی یعنی دسمبر ۱۹۹۳ء میں اسرائیل نے صرف ۹۰۰۰ ایکڑ اراضی ضبط کی!

یہ نئی شاہراہیں اسرائیل کے لیے دہرا کام دیتی ہیں:

اول: ان کی مدد سے یہودی نوآبادکار یروشلم سے اپنی ان بستیوں میں آنا جانا یا باہم ایک بستی سے دوسری میں جانا، بغیر فلسطینی شہروں، دیہاتوں سے گزرے انجام دے سکتے ہیں۔ اس سے ان کا اسرائیل کے سیاسی نظام کا اٹوٹ انگ بننے کا عمل ترقی پاتا ہے۔

دوم: یہ فلسطینیوں کی آمد و رفت میں مؤثر رکاوٹ کا کردار ادا کرتے ہیں۔ یہ رکاوٹ اس اسرائیلی فرمان کے ماتحت اور بھی ناقابل عبور بن جاتی ہے کہ ان سڑکوں کے متصل کوئی بھی غیر یہودی کاروبار نہیں کرسکتا۔

ان یہودی بستیوں اور ذرائع آمد و رفت کی تعمیر سے فلسطینیوں کی آبادی ۶ مختلف الگ الگ ٹکڑوں میں بانٹ رکھنا آسان ہوجاتا ہے۔

۱- ایک شمالی علاقہ جس میں نابلوس اور جنین سب سے بڑی آبادی ہیں۔

۲- یروشلم کے عین شمال میں وقع رملہ اور متعلقہ مضافات پر مشتمل علاقہ۔

۳- مشرقی یروشلم جہاں ایک لاکھ پچپن ہزار فلسطینی ان چھوٹے چھوٹے بٹے ہوئے قطعات اراضی پر ٹھونسے گئے ہیں جو اب ایک لاکھ ساٹھ ہزار یہودی آبادکاروں کا مسکن ہیں۔ رابن جن مضافاتی یہودی بستیوں کا گھیرا ''مکاری'' سے لیبر حکومت کے دور اقتدار میں تعمیر کرنے کا دعویٰ کرتا ہے۔ وہ ان کو دوسرے ملحقہ فلسطینیوں سے مزید الگ تھلگ کرنے کا باعث ہیں۔

۴- ایک جنوبی علاقہ ھیبرون پر مشتمل ہے۔

۵- غزہ کی پٹی کا شمالی حصہ جس میں آبادی کا بڑا مرکز غزہ شہر ہے۔

۶- غزہ کی پٹی کا جنوبی حصہ جس میں خان یونس اور رفع بڑی بستیاں ہیں۔ غزہ کی پٹی دیکھنے میں تو ایک ہی علاقہ نظر آتی ہے لیکن نتظارم کی ایک ہزار ایکڑ پر مشتمل بستی میں تعینات فوجی دستہ اسے نہایت آسانی سے شمالاً جنوباً تقسیم کرسکتا ہے۔

فلسطینیوں کا مستقبل انتہائی تاریک ہے۔ اگر اسرائیل اپنے تمام وعدے وفا بھی کردے تو مندرجہ ذیل ٹھوس حقائق اپنی جگہ قائم رہیں گے۔

فلسطینیوں کی سیاسی زندگی کے تمام اہم پہلو کلیتاً اور لگاتار اسرائیلی حکومت کے کنٹرول میں

رہیں گے۔ ان معاہدوں میں اسرائیل کے لیے جو اختیارات مخصوص کیے گئے ہیں وہ اس قدر وسیع اور گہرے ہیں کہ ان کو ظلم کا جائز قانونی ہتھکنڈہ اور فلسطین کا تیا پانچا کرنے کا قانونی جواز کہہ سکتے ہیں۔ پی ایل او تو صرف برائے نام ایک معاہداتی فریق ہے۔ ان کے اور اسرائیل کے درمیان قوت کے لحاظ سے زمین و آسمان کا فرق ہے۔ تبھی تو اسرائیلی وزیر خارجہ شمعون پیریز نے مارچ ۱۹۹۴ء میں صاف گوئی سے برملا کہا کہ ''پی ایل او بھلا ہمیں کیا دے سکتی ہے۔ ان کے پاس نہ زمین ہے نہ کوئی اختیار اور نہ کوئی اور شے!''

تمام تر مقبوضہ علاقے اسرائیل کی مہیب فوجی قوت کے نرغے میں گھرے رہیں گے۔ جو بھی اقدامات حکومت خود اختیاری کے لئے کئے جائیں اسرائیل کو تمام ایک سو ساٹھ متفرق یہودی بستیوں کے تقریباً دو لاکھ ترپن ہزار پانچ سو یہودیوں کی حفاظت کا حق حاصل رہے گا۔ یہ تمام بستیاں مقبوضہ علاقے میں جگہ جگہ موجود ہیں اور اس کے علاوہ مشرقی یروشلم پر بھی ان کا حق رہے گا۔ عملی طور پر اسرائیلی فوج کو تمام مقبوضہ علاقے پر... بشمول غزہ کی پٹی کے... یورش کرنے کا حق حاصل رہے گا۔

اس مہلک نسل پرستانہ شق کا مطلب رابن/عرفات کے مصافحہ کے پانچ ماہ بعد ظاہر ہوا جب ایک یہودی آبادکار بیروچ گولڈ شائین نے ھیبرون کی مسجد میں ایک خودکار مشین گن سے فائرنگ کرکے ۲۹ نمازیوں کو قتل کر ڈالا۔ سرکاری تحقیقاتی کمیشن کے روبرو بیان دیتے اس مسجد کی سیکورٹی ڈیوٹی پر موجود اسرائیلی اہلکار نے انکشاف کیا کہ انہیں یہودی آبادکاروں پر فائر نہ کرنے کی سرکاری ہدایات ہیں۔ چاہے وہ اس گولڈ شائن کی مانند فلسطینیوں پر بلا اشتعال گولیاں کیوں نہ برسا رہا ہو! ھیبرون کے سپرنٹنڈنٹ پولیس مائر طیار نے اعترافی بیان میں کہا کہ ایسے حالات میں اسرائیلی سپاہیوں کو ہدایت ہے کہ وہ ''حفاظت میں رہ کر اختتام کا انتظار کریں۔ پھر اس آبادکار کو روکیں لیکن گولی چلائے بغیر کسی دوسرے طریقے سے!''

حکومت خود اختیاری مل جانے پر جو معمولی سی بہتری حالات زندگی میں آنا ممکن ہے اس کا انحصار بھی ان نازک شقوں پر ہے جو کسی وقت بھی معدوم ہو سکتی ہیں۔ یہ معاہدات صرف دو ہی افراد یعنی عرفات اور رابن کی ذاتی تحویل میں ہیں اور دونوں کو اپنے اپنے حلقہ انتخاب میں زبردست مخالفت کا سامنا ہے۔ ان میں سے ایک کا بھی سیاسی میدان سے انخلاء اس معاہدہ کے لیے خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔

اس معاہدہ امن میں فلسطینیوں کے بنیادی مطالبات کا تو ذکر ہی نہیں!

مقبوضہ علاقوں میں یہودی بستیوں کا بنانا، فلسطینیوں کی ایک آزاد خودمختار ریاست کا قیام جس کا

دارالخلافہ مشرقی یروشلم ہو اور تمام پناہ گزینوں کی وطن واپسی کا حق ان تمام معاملات کا تصفیہ کئے بغیر مستحکم، پائیدار امن ممکن نہیں لیکن ان تمام کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ صرف اور صرف امریکہ ہی ایک ایسا ملک ہے جو اسرائیل کو ان معاملات میں تصفیہ کرنے پر مجبور کر سکتا ہے لیکن اس نے اسرائیل کو غیر مشروط اقتصادی اور فوجی امداد کا سیلاب جاری رکھا ہوا ہے اور اندھی سیاسی امداد کر رہا ہے۔

ان معاہدات میں سب سے زیادہ مایوس کن بات یہ ہے کہ ان کی روشن ترین اور رجائیت پر مبنی تعبیر بھی فلسطینیوں کو ایک غیر ملک کے غلام، محکوم طبقے سے زیادہ کا درجہ عطا نہیں کرتی۔ ان میں ذرہ بھر اس بات کی طرف اشارہ نہیں کہ یہ مظلوم لوگ کبھی آئندہ مستقبل بعید میں بھی وہ حقوق حاصل کر پائیں گے جو بطور ''ابنِ آدم'' ان کا حق ہیں۔ پچھلی نصف صدی سے کس طرح انہیں ان حقوق سے محروم رکھا گیا۔ یہی اس کتاب کا مرکزی نقطہ ہے!

امریکی حکومت ان معاہدوں کی کڑی شرائط کی حمایت کر کے اور حقیقی خود اختیاری اور قیام ریاست کے امکان کو لگاتار معدوم کرنے کی حمایت کر کے فلسطینیوں کی آزادی کی مخالفت کر رہی ہے جو امریکہ کے اصولوں اور روایات سے انحراف ہے۔ یہ ایک انتہائی شرمناک حرکت اور ایک گھناؤنی سازش ہے۔ یہ فلسطینیوں کے لیے انتہائی تذلیل اور سختی کا باعث بن رہی ہے جب کہ انہوں نے کبھی ہمارے خلاف جنگ نہیں کی۔ یہ شرائط ان سے بھی زیادہ کڑی ہیں جو ہم نے جاپانیوں اور جرمنوں پر دوسری عالمگیر جنگ کے بعد عائد کی تھیں۔

ہمارا رویہ اس دوغلے پن کو ظاہر کرتا ہے جو ہم اقوام متحدہ کے منشور کی حمایت کر کے اپناتے ہیں۔ اس سے ہماری حکومت کی دوسرے ممالک کے ساتھ خارجہ پالیسی کے میدان میں اخلاقی رہنمائی کرنے کی اہلیت پر زبردست چوٹ پڑتی ہے۔ اب یہی مثال لے لیں کہ ۱۹۹۴ء کے موسم بہار میں ہمارے اسرائیل نواز جھکاؤ نے ہماری حکومت کو ریاکاری کے اتنے نچلے درجے تک اترنے پر مجبور کر دیا کہ بین الاقوامی لیڈران اس سے محظوظ بھی ہوئے ہوں گے اور دل گرفتہ بھی۔ امریکی حکومت نے اسرائیل نواز حلقوں کے دباؤ کے زیر اثر شمالی کوریا کو اس کے جوہری تنصیبات کے بین الاقوامی معائینے سے انکار پر فوجی دخل اندازی کی دھمکی دے ڈالی۔ ان حلقوں کا خیال تھا کہ اغلباً عراق اور ایران شمالی کوریا سے جوہری ہتھیار خرید لیں گے لیکن اس کے ساتھ وہ اسرائیل کو اس بات پر آمادہ نہ کر سکا کہ وہ بھی ایسا ہی بین الاقوامی معائنہ قبول کرنے پر رضامند ہو جائے اور اپنی ان کوششوں سے باز آ جائے جو وہ جوہری ہتھیار بنانے کے لیے کر رہا ہے۔ یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہ تھی۔

انسانی حقوق کی خلاف ورزی کے بارے میں فکرمند لوگوں کو بڑی ستم ظریفی لگتی ہے کہ اسرائیل امریکہ کی بے تحاشہ امداد حاصل کر کے ایک بھونڈا اور نیا نسلی تفریق کا نظام وضع کر رہا ہے جب کہ جنوبی افریقہ اسی ملک امریکہ کے معتد بہ دباؤ کے باعث اپنا پرانی نسلی تفریق کا نظام منہدم کرنے میں مصروف ہے!

ہمارے شہریوں کو آخر کار اپنی حکومت کے ان برے اقدامات کا کفارہ ادا کرنا ہی پڑے گا۔ فلسطینیوں کا ہمارے اوپر یہ حق بنتا ہے کیونکہ اسرائیل ان عرب علاقوں پر لگاتار قبضہ، فلسطینی عوام کو غلامی میں جکڑے رکھنا اور معاہدہ امن کی شقوں کے ماتحت ان خلاف ورزیوں کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔ اگر اسے حکومت امریکہ کی غیر مشروط زوردار حمایت حاصل نہ ہو!

یہ ذمہ داری ہم پر بھی عائد ہوتی ہے۔ ہمیں اپنی حکومت کی راست بازی کو بحال کرنا ہی پڑے گا۔ تاکہ وہ صرف مشرق وسطیٰ میں ہی انصاف نہیں بلکہ تمام دنیا میں اپنے قابل قدر مفادات کو بڑھاوا دینے کے لیے اخلاقی برتری قائم رکھ سکے۔

اسرائیل کو فلسطینیوں کے بارے میں اپنی بنیادی رویے میں تبدیلی لانے پر مجبور کرنا ہی ہوگا۔ اس معاہدہ امن میں آخری حل کے لیے بہت زیادہ تاخیر روا رکھی گئی ہے اور اس دوران فلسطین کا تیا پانچہ کرنا جاری ہے۔ لہٰذا یہ معاہدہ انصاف کی بجائے ظلم کا ہتھیار ثابت ہو رہا ہے۔

مشرقی یروشلم کی حیثیت کا تعین، نو آبادیاں، پناہ گزیں اور آزاد ریاست کا قیام جیسے مسائل کو ایجنڈا کی تہہ سے نکال کر اوپر لانا چاہیے۔ یہ اہم اور فوری اہمیت کی تبدیلی صرف امریکی عوام ہی اپنی حکومت کے ذریعے اسرائیل کو مجبور کر کے لا سکتے ہیں۔ اس میں انہیں حکومتی امداد (جو اسرائیل کو دی جا رہی ہے) کو بطور ایک مؤثر ہتھیار کے استعمال کرنا ہوگا تاکہ اسرائیل اس تبدیلی کو مناسب اہمیت دے۔

ہمیں یہ مطالبہ کرنا چاہیے کہ یہ امداد صرف اور صرف مطلوبہ تبدیلی ظاہر ہونے پر ہی منحصر ہوگی۔ کلنٹن حکومت کے اداروں میں ایوان نمائندگان میں اسرائیلی لابی کے اثر و رسوخ کو دیکھتے ہوئے یہ کام انتہائی دشوار نظر آتا ہے۔ امریکی عوام کو ایک زوردار اور بھرپور احتجاج کرنا ہوگا۔

ہمارا فرض بالکل واضح ہے کیونکہ ہم فلسطینیوں کی حالت زار کی ذمہ داری سے دامن نہیں چھڑا سکتے۔ وزیر اعظم رابن کے چیئرمین عرفات اور شاہ حسین کے ساتھ مصافحے ہماری ذمہ داری کو کم نہیں کرتے بلکہ مزید بڑھا دیتے ہیں۔ ہمیں یہ فوری کام سرانجام دینا ہی ہوگا۔

❄ ❄

پیش لفظ

(طبع اوّل)

عرب اسرائیل مناقشہ میں ریاست ہائے متحدہ امریکہ (آئندہ "USA" کو صرف امریکہ ہی لکھا جائے گا) کے لیے مہیب خطرات پوشیدہ ہیں اور ان میں زیادہ تر ہمارے خود کردہ ہیں! یہ نقصانات ان معاشی خساروں کے ماوراء ہیں جو ہماری حکومت اسرائیل کو اربوں ڈالر ہر سال دے کر اور ٹیکس اور تجارت میں مراعات بہم پہنچا کر دے رہی ہے۔ اس کے بدترین نتائج میں سے ایک امریکہ کا ان تمام خلاف ورزیوں میں ملوث ہونا ہے جو اسرائیل حقوق انسانی کے خلاف مدّت مدید سے وسیع پیمانے پر روا رکھے ہوئے ہے۔ اسرائیل کا عرب مقبوضہ علاقوں پر کنٹرول برقرار رکھنے اور ان کا استحصال کرنے میں جو کردار ہے اس میں امریکہ مرکزی کردار ادا کرتا ہے۔ ان میں غرب اردن، مشرقی یروشلم، غزہ کی پٹی، جنوبی لبنان اور جولان کی پہاڑیاں تمام تر عرب علاقے ہیں۔ ہماری حکومت اسرائیل کو غیر متزلزل طور پر معاشی، سیاسی اور فوجی امداد مہیا کرتی ہے جب کہ وہ لگاتار بین الاقوامی قانون کی دھجیاں اڑاتے ہیں۔ ان علاقوں پر اپنا غاصبانہ قبضہ جو اکثر ظالمانہ بھی ہوتا ہے برقرار رکھتے ہیں۔ وہ تقریباً بیس لاکھ عرب آبادی پر نہ صرف اپنا فوجی اقتدار مسلط رکھتے ہیں بلکہ اپنے ان تمام اعمال کو اپنی دیدہ دانستہ فریب کاریوں کے دبیز پردہ تلے چھپائے رکھتے ہیں۔

امریکہ کی اس ملی بھگت سے نہ صرف عرب عوام پر مصائب ٹوٹتے ہیں بلکہ اس کا پہلا شکار تو مشرقِ وسطیٰ میں امریکہ کے لیے خیر سگالی کا جذبہ ہے جو معدوم ہو رہا ہے۔ ایک وہ بھی زمانہ تھا کہ عربوں اور اسرائیلیوں میں امریکہ کی مقبولیت اور عزت یکساں طور پر پائی جاتی تھی اور کہاں اب یہ ہمارے سیاست دانوں کے لامتناہی اور انتہائی گھٹیا پن سے اسرائیل موافق گروہوں کی حمایت حاصل کرنے کی دوڑ میں گنوائی جا رہی ہے۔

یہ گٹھ جوڑ امریکی حکومت کے اس دوغلے معیار سے صاف جھلکتا ہے جو وہ ان قراردادوں کے نفاذ کے سلسلے میں روا رکھتی ہے جو اقوام متحدہ کی سیکورٹی کونسل نے مشرق وسطیٰ کے بارے میں منظور کی ہیں۔

جب عراق نے ۱۹۹۰ء میں کویت پر حملہ کر کے غاصبانہ قبضہ کرلیا تو امریکہ نے ایک بڑی کثیر القومی فوج اکٹھی کی اور خود اس کی سربراہی کر کے اقوام متحدہ کی اجازت اور جھنڈے تلے عراق کی یہ فتح منقلب کروائی برخلاف اس کے جب اسرائیل بین الاقوامی قانون کو اپنے پیروں تلے روندتا ہے تو امریکی حکومت ملامت کے چند الفاظ کہنے کے علاوہ کوئی عملی اقدام نہیں کرتی۔

مثال کے طور پر اقوام متحدہ کی سیکورٹی کونسل نے اسرائیل سے یہ مطالبہ کر رکھا ہے کہ وہ ان تمام مقبوضہ عرب علاقوں کو خالی کردے جس پر اس نے سالہا سال سے بزور شمشیر چھین کر قبضہ کر رکھا ہے۔ اسرائیل کے مشرقی یروشلم اور جولان کی پہاڑیوں پر قبضہ کی مذمت کی ہے اور مقبوضہ عرب علاقوں میں اسرائیلی رہائشی بستیاں تعمیر کرنے سے منع کیا ہے۔ حال ہی میں یعنی ۱۸ر دسمبر میں اسرائیل سے یہ مطالبہ کیا گیا ہے کہ وہ ۴۱۳ فلسطینیوں کی ملک بدری کے احکامات منسوخ کرے (اقوام متحدہ سلامتی کونسل قرارداد نمبر ۷۹۹)

بجائے اس کے کہ امریکہ اس معاملے میں... سیاسی، معاشی اور فوجی طور پر... اقوام عالم کو زوردار طریقہ سے اس قرارداد کا اسرائیل پر نفاذ کرنے کے لیے کہتا بلکہ راہنمائی کرتا اس نے اس کے بالکل برخلاف کیا۔ امریکہ نے اس الزام یافتہ حکومت، ریاست کی معاشی اور فوجی امداد بلا توقف جاری رکھی۔ عین اِنہی دنوں یعنی صدر کلنٹن کے جنوری ۱۹۹۳ء میں اقتدار سنبھالنے سے ذرا ہی پہلے بش انتظامیہ نے عراق کی بالکل غیر معروف خلاف ورزیوں کا بہانہ تراشتے ہوئے اس پر فوجی محاذ آرائی کی کہ وہ بعد از جنگ ''نوفلائی زون'' کی خلاف ورزیوں کا مرتکب ہوا ہے۔ سعودی عرب کے شاہ فہد نے اس دوغلے معیار پر افسوس کا اظہار کیا۔ ان کا کہنا تھا کہ اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کی ہر قرارداد پر عمل ہونا چاہیے۔ اس کا تعلق فلسطینیوں سے ہو یا خلیج کی صورت حال سے!

اسرائیل تک میں امریکی جذبہ خیرسگالی کو زک پہنچ رہی ہے کیونکہ وہاں بھی شہریوں کی روز افزوں تعداد اس امریکی دوغلاپن کو امن کی راہ میں رکاوٹ تصور کرتی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اگر امریکی حکومت کی لامتناہی معاشی اور اور فوجی امداد ان کی حکومت کو میسر نہ ہوتی تو وہ کبھی کا اپنی افواج کو مقبوضہ علاقہ سے واپس بلا چکے ہوتے اور عرب ریاستوں کے ساتھ معمول کے پر امن تعلقات

استوار کر چکے ہوتے۔ امریکہ کے لیے یہ بوجھ مزید بھاری اور بڑھتے ہوئے خطرے کا باعث بنتا جائے گا کیونکہ امن کے فقدان سے عرب/ اسرائیل تنازعے کا بڑھنا ایک یقینی امر ہے۔ یہ مناقشہ ایک ایسے علاقے سے تعلق رکھتا ہے جو انتہائی مذہبی، معاشی، سیاسی اور فوجی آویزش کے سنگھم کی حیثیت رکھتا ہے۔ ان تمام کا تعلق امریکہ کے انتہائی اہم مفادات سے وابستہ ہے۔ ان مفادات کا تعلق دونوں فریقوں سے ہے اوران کا تحفظ صرف عربوں یا اسرائیل کی حمایت سے ممکن نہیں۔

کانگریس میں گزارے گئے ماہ و سال نے ہی مجھے مشرق وسطیٰ کے مسائل سے پہلی مرتبہ روشناس کروایا۔ غیر ملکی دوروں، سرکاری بیانات کے مطالعے اور ذاتی ملاقاتوں سے مجھے تقریباً ان تمام شخصیتوں سے براہِ راست سابقہ پڑا جو مشرق وسطیٰ کی پالیسی بنانے میں کوئی کردار رکھتے تھے۔ ان کے بارے میں لابی کرتے تھے یا ان کے نسلی روابط تھے اس علاقے سے۔ اسی میں امریکہ اسرائیل پبلک افیئر ز کمیٹی بھی شامل تھی۔ یہ وہ طاقتور لابی گروپ ہے جو کیپٹل ہل پر اسرائیلی ریاست کے مفاد کی نگہداشت کرتا ہے۔ مجھے بارہ عدد وفاقی انتخابات میں بطور امیدوار کھڑے ہونے کا تجربہ بھی حاصل ہے۔ آخری دو میں مجھے اس طاقتور اسرائیل نواز گروپ کے ہدف اول ہونے کا اعزاز حاصل ہوا۔ ان انتخابی مہموں نے مجھے ایک نئی آگاہی بخشی کہ ہمارے داخلی عوامل کس طرح خارجہ پالیسی پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ جب جنوری ۸۳ء میں نے کانگریس کو الوداع کہا تو میں اپنے آپ کو معصومیت سے اسرائیل اور عرب ریاستوں کے بارے میں ایک ماہر تصور کرتا تھا۔

میری تعلیم صحیح معنوں میں تو اس وقت شروع ہوئی جب میں نے اپنی کتاب ''وہ جرأتِ اظہار کرتے ہیں۔ عوام اور ادارے اسرائیلی لابی کا سامنا کرتے ہیں۔'' کے سلسلے میں تحقیق و تفتیش شروع کی۔ میں جلد ہی آگاہ ہوا کہ میرے کانگریس کے تجربے نے تو مجھے ایک سطحی علم بخشا تھا کہ اسرائیل نواز گروپ کس طرح مشرق وسطیٰ پالیسی سازی پر اور عوام کے اسرائیل کے بارے میں رویہ پر اثرانداز ہوتے ہیں۔

یہ اثر و نفوذ امریکہ کے طول وعرض میں زندگی کے ہر شعبے... کیا ذاتی کیا عوامی... اور ہر حکومتی ادارہ میں گھر کر چکا ہوا ہے۔ کیپٹل ہل پر تو اس قدر قوی ہے کہ وہاں کبھی عرب/ اسرائیل تنازعہ پر معنی خیز بحث ہو ہی نہیں پائی۔ سوائے ورجینیا کے رابرٹ بائرڈ، ریاست کیسا کے باب ڈول، ریاست اوہائیو کے جیمز ٹریکائیٹ (خورد) اور ویسٹ ورجینیا کے نک۔ جو۔ راحل کے اور کوئی بھی نمائندہ

(دونوں ایوانوں میں) اسرائیل کے برتاؤ پر انگلی نہیں اٹھاتا۔ ایک سابقہ انڈر سکریٹری آف اسٹیٹ جارج بال کا کہنا ہے: ''جہاں تک مشرق وسطیٰ پالیسی کا تعلق ہے تو کانگریس ایک پالتو پلوں کے ایسے گروہ ہونے کا مظاہرہ کرتی ہے جو اشارہ ملنے پر اسرائیل لابی کے ہاتھ میں پکڑے گول چھلے میں سے چھلانگتی ہے۔''

امریکی کانگریس سال بسال جو رقم اسرائیل کو خیرات کرتی ہے اگر اسے ساری اسرائیلی آبادی پر تقسیم کیا جائے تو ہر فرد عورت، مرد اور بچہ کے حصہ میں ایک ہزار امریکی ڈالر آتے ہیں۔ وفاقی بجٹ میں اور تمام معاملات میں کمی ہوتو ہو اسرائیل کو جو تحفہ عطا ہو رہا ہوتا ہے اسی پر کوئی چون و چرا نہیں ہوتی۔ مجھے اپنے دورانِ نمائندگی یہ ادراک ہوا کہ اسرائیل کی امداد ہمارے اپنے سوشل سیکورٹی اور طبی امداد پروگرام سے بھی زیادہ متبرک ہے۔

انتظامیہ میں بھی اسرائیل کی گرفت اسی قدر مضبوط ہے۔ اقوام متحدہ میں ہمارے نمائندے اور ایک معتبر سفارت کار ڈونلڈ میک ہنری کا کہنا ہے کہ ''اسرائیلی لابی کے زیر اثر ہماری حکومت مشرق وسطیٰ میں اپنے قومی مفاد کا تحفظ نہیں کر سکتی۔''

''وہ جرأتِ اظہار کرتے ہیں'' میں یہی بیان کیا گیا ہے کہ لابی یہ اثر و نفوذ کیسے پیدا کرتی اور قائم رکھتی ہے اور کیوں؟ اس کتاب کو جو زبردست پذیرائی نصیب ہوئی۔ وہ اس کتاب کے انکشافات سے بھی زیادہ حیرت انگیز ہے۔ مجھے اب تک ایک لاکھ[1] سے زائد قارئین کے پیغامات بذریعہ ڈاک اور فون موصول ہو چکے ہیں۔ کچھ تو سارا ملک طے کر کے میرے گھر ملنے آئے۔ سبھی کو تشویش ہے اور وہ مشرق وسطیٰ کی پالیسی پر اس لابی کی گرفت سے گلو خلاصی چاہتے ہیں۔ ان میں سے بیشتر قارئین واشنگٹن میں قائم شدہ اس غیر جماعتی فلاحی ادارے ''کونسل برائے قومی مفاد'' کے بنیادی اراکین بنے جو ۱۹۸۹ء میں قائم ہوئی۔ اس کا خصوصی مقصد عوامی سطح پر مشرق وسطیٰ کی امریکی قومی پالیسی کا ترویج و تحفظ ہے۔

ان خطوط اور فون کالز نے اہم سوالات کو جنم دیا ہے۔ اقوام متحدہ نے صیہونیت کو نسل پرستی کے مترادف کیوں قرار دیا ہے؟ کیا اسرائیل کے دروازے تمام پناہ گزینوں کے لیے کھلے ہیں؟ کیا اسرائیل امریکی سلامتی کے لیے اہمیت رکھتا ہے؟ کیا اسرائیل امریکی قرضے واپس کرتا ہے؟ کیا اسرائیل کے عرب باشندوں کو یہودی شہریوں کے برابر سلوک ملتا ہے؟ کیا اسرائیل کا عرب اردن

[1] اب یہ تعداد تین لاکھ سے تجاوز کر چکی ہے... (مترجم)

اور غزہ کی پٹی کا قبضہ بین الاقوامی قانون کی خلاف ورزی ہے؟ ان فلسطینیوں پر اسرائیل تسلط کا کیا جواز ہے جو وہاں رہتے ہیں؟ عرب اسرائیل جنگ شروع کس کی جانب سے ہوئی؟ کیا روسی جمہوریاؤں سے آنے والے پناہ گزینوں کی اسرائیل میں آبادکاری اور مدد کے سلسلے میں امریکہ پر کوئی اخلاقی ذمہ داری عائد ہوتی ہے؟

اسرائیل کے حمایتیوں کے گمراہ کن پروپیگنڈہ کے زیر اثر امریکیوں کی اکثریت اغلباً یہ جواب دے گی کہ "اسرائیل ایک ایسی جمہوریہ ہے جو نسل پرستی سے اجتناب کرتی ہے۔ سب شہریوں کو یکساں برتاؤ مہیا ہے۔ امریکی حکومتی قرضوں کو بروقت ادا کرتی ہے۔ امریکہ کے ساتھ مشترکہ اقدار کی حامل ہے اور امریکی سیکورٹی کے لیے بہت اہم ہے۔ امریکہ نے چونکہ اسرائیل کو معرض وجود میں لانے کے لیے کردار ادا کیا ہے اور پناہ گزینوں کی حوصلہ افزائی کی ہے۔ لہٰذا اب اسرائیل کی مدد کرنا ہمارا اخلاقی فریضہ ہے۔ اسرائیل نے عربوں کے خلاف صرف دفاع میں لڑائی کی۔ اسے غربی کنارے اور غزہ کی پٹی پر مضبوط گرفت رکھنا ضروری ہے کیونکہ وہاں فلسطینی آباد ہیں جو اسے تباہ کرنا چاہتے ہیں" مجھے ملنے والے جوابات نے ان باتوں کو متزلزل کر دیا گو مجھے اپنے خیالات کی بنیادی صحت پر پورا اعتماد تھا لیکن ان کے مخزن/ذرائع میری دسترس میں نہ تھے اور نہ ہی یہ کسی ایک کتاب میں میسر تھے۔

۱۹۸۹ء میں اپنی کتاب "وہ جرأتِ اظہار کرتے ہیں" کے دوسرے ایڈیشن کی اشاعت کے بعد بھی میں نے اپنی تحقیق جاری رکھی۔ اس دوران جو ثقہ دستاویزات سامنے آئیں ان سے یہ حیرتناک انکشاف ہوا کہ امریکی اسرائیل تعلقات کے بارے میں جو عام فہم اعتقادات موجود ہیں ان کی غالب اکثریت جھوٹ پر مبنی ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ یہ ضعیف الاعتقادی خودرو نہیں ہے۔ یہ ایک ایسے گروہ کا کارنامہ ہے جو اپنی تمام تر قوت اور توجہ نہایت انہماک سے اس مسئلہ پر مرکوز کئے ہوئے ہے۔

ان مغالطوں کو برقرار رکھنے کی ضرورت اس لیے پیش آتی ہے کہ بہت سارے عیسائی اور یہودی اس اسرائیلی ریاست کے قیام کو احترام کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ ۱۹۴۸ء میں اس کا قیام دنیا کی تاریخ میں یہودیت کا ایک عظیم کارنامہ ہے۔ یہودیوں کے اس پرانے خواب کی تعبیر جس کو انہوں نے "اگلے سال یروشلم میں ملیں گے" کے نعرہ سے زندہ رکھا۔ دوسری عالمی جنگ کے دوران جب نازیوں نے یہودیوں کے صفایا کی ٹھانی تو اس نعرہ میں مزید زور پیدا ہوا۔

جب واشنگٹن ڈی سی میں واشنگٹن یادگار کے پہلو میں یہودیوں کی عالمگیر بربادی کے نئے میوزیم

کی نقاب کشائی ہوگی تو اس قابل نفرت نسل کشی مہم کو عوامی ذہن میں دوام حاصل ہوگا۔ البتہ یہ عجب طنزیہ بات ہے کہ جس چیز میں امریکی حکومت کی ذرّہ بھر ذمہ داری نہ تھی۔ یعنی نازیوں کا یورپی یہودیوں کا صفایا کرنے کی مہم۔ وہ ہماری ایک قومی یادگار کا موضوع بن رہی ہے جب کہ کئی دوسری باتیں جن کی ذمہ داری سو فیصد ہماری حکومت پر عائد ہوتی ہے مثلاً غلامی، انڈین باشندوں کا قتل عام اور اب اسرائیلی خلاف ورزی برائے انسانی حقوق عرب باشندوں کے بارے میں... ان کو بالکل نظرانداز کیا جارہا ہے۔ باوجودیکہ بہت سے ممتاز امریکی یہودیوں نے اسرائیل کے قیام کی مخالفت کی تھی اور بعدازاں اس کے مذموم رویے پر آج تک امریکی یہودیوں کے ایک حلقے میں نکتہ چینی کی جارہی ہے۔ لیکن پھر بھی اسرائیل کا قیام بقیہ یہودیوں کے دلوں کی دھڑکن ہے۔ عام خیال یہی ہے کہ ایک یہودی ریاست مستقبل میں ہونے والی کسی بھی یہودی مخالف تحریک کے دنوں میں تمام یہودیوں کی جائے پناہ ثابت ہوگی۔

۱۹۸۳ء میں کیے گئے ایک یہودی جائزہ میں درج ہے کہ ''امریکہ کے یہودیوں میں اسرائیل کی حمایت کرنے کو اب بھی وہی درجہ حاصل ہے جو مصر سے بنی اسرائیل کی خلاصی اور یوم تشکر پر موم بتیاں جلانے کو ہے۔'' ربی آرتھر ہارنز برگ کا بھی یہی کہنا ہے کہ ''ہم اپنے آپ کو ایک عالمگیر قبیلے کا فرد تصور کرتے ہیں جس کا مرکزی نقطہ اسرائیل ہے۔ یہ ایک مذہبی جذبہ ہے۔ لیکن یہ ان یہودیوں میں بھی موجود ہے جو اپنے آپ کو لامذہب یا دہریہ سمجھتے ہیں۔''

''وال اسٹریٹ جرنل'' کے صفحات میں دانشور ارونگ کرسٹل اپنی اسرائیل کے ساتھ وابستگی کا یوں اظہار کرتا ہے۔ ''میں اتنا مرعوب کیوں ہوں؟ میں ایک رسمی قدامت پسند یہودی، نہیں ہوں۔ بس کم ازکم رسوم ادا کرلیتا ہوں۔ میں صیہونی بھی نہیں ہوں اور مجھے اپنی دومرتبہ اسرائیل یاترا میں کچھ خاص لطف و حظ حاصل نہیں ہوا پھر بھی میں اسرائیل کا پرستار ہوں کیونکہ میری روح کو یہ احساس ہے کہ اسرائیل کے ساتھ جو بیتے گی وہ یہودی تاریخ پر گہرا اثر مرتب کرے گی۔ اس سے اس بات کا فیصلہ ہوگا کہ ہماری آئندہ نسلیں کس قسم کی زندگی گزاریں گی۔''

حالیہ برسوں میں اسرائیل کو ایک پناہ گاہ سے زیادہ کا درجہ دیا گیا ہے۔ ایک اور دانشور اور یہودیت کا گہرا مشاہدہ رکھنے والا نون برگر یہودیوں کی مذہبی اجتماعات، رسوم میں شرکت کا حوالہ دیتے ہوئے کہتا ہے: ''بیشتر امریکی یہودیوں کے لیے اسرائیل مذہب کا درجہ اختیار کرچکا ہے۔'' اس کا نتیجہ

یہ ہوا ہے کہ امریکی یہودیوں کے رسمی لیڈران کے لیے اسرائیل کی غیر متزلزل اور اندھی پوجا ہی ان کے جذبات کا مرکزی نقطہ بن چکی ہے۔

بہرحال استثناء اب بھی موجود ہیں۔ تعلیمی، تجارتی اور صحافتی حلقوں میں اب بھی چند ممتاز پیشہ ور یہودی اسرائیل کے بارے میں بیباکی، اعتدال اور سوز دروں سے کام لے کر بولتے اور لکھتے ہیں۔ ان میں یہ مندرجہ ذیل شخصیات شامل ہیں: انھونی لیوس، مائیک ویلیس، روبرٹا، فیورٹینٹ، ریٹا ہوسر، ملٹن وائرسٹ، سیمور ہرش، مائیکل لرنر، نوم چومسکی اور فلپ کلٹزنک۔ یہ سب مشرق وسطیٰ پالیسی پر عوامی بحث میں قابل قدر اضافہ کرتے ہیں۔ لیکن اکثر ان کی آوازیں اس شور وغوغا میں دب جاتی ہیں جو ایسے امریکی برپا کرتے ہیں جو جذبات پرستی میں اندھے ہو چکے ہوتے ہیں۔

اسرائیل کو ان لاکھوں بنیاد پرست عیسائیوں سے بھی بھرپور سیاسی امداد حاصل ہوتی ہے جو اپنے مذہبی عقائد کی بناء پر اسرائیل کے بارے میں گمراہ کن حقائق کو تسلیم کر لیتے ہیں۔ ان کا اعتقاد ہے کہ موجودہ اسرائیلی ان انجیلی زمانہ کے یہودیوں کے وارث ہیں جنہیں اللہ نے چنیدہ و برگزیدہ قوم کہا تھا۔ ان کا کہنا ہے کہ اسرائیل کو مضبوط رکھنا بائبل کے بتلائے ہوئے ''یوم آخرت'' کے پلان کا حصہ ہے۔ وہ اس معاملے میں Anti-Semitic اور ''کیتھولک مخالف'' فرقوں کے اس یوم حشر کے اعتقاد پر اختلافات کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ جس میں ان تمام افراد کے خاتمے کی پیشین گوئی کی گئی ہے۔ اس میں تمام شامل ہیں... مع یہود کے... جو عیسائیت میں ''جنمِ ثانی'' نہ لے چکے ہوں! (مطلب یہ کہ صرف وہی بخشے جائیں گے جو اس بڑے دن کو عیسائیت پر ایمان لا چکے ہوں گے۔ بقیہ سب جہنم واصل ہوں گے... (مترجم)

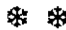
یہ بنیاد پرست عیسائی اور یہودی جو اسرائیل کو اپنا مذہب سمجھتے ہیں اسے ہر نکتہ چینی سے بالاتر جانتے ہیں۔ یہ اپنے جوش میں اسرائیل کے ہر نکتہ چیں کو Anti-Semitic اور ''خود سے نفرت کرنے والا یہودی'' قرار دیتے ہیں۔ یہ چیز دہشت زدہ کرنے کو کافی ہے۔ آزادیِ اظہار کا گلا گھونٹ دیا جاتا ہے اور معقول تحقیق وتجسس عنقا ہو جاتے ہیں۔ اس کے برخلاف اسرائیل کے اندر اس کے اپنے شہریوں میں اسرائیل پر تنقید عام بات ہے۔ عبرانی پریس جو اسرائیل کے اندر ایسی بحث کا بڑا ادارہ ہے اسرائیلی حکومت کی بد اعمالیوں سے بھرا پڑا ہوتا ہے لیکن امریکہ میں اس کا حوالہ شاذ و نادر ہی دیا جاتا ہے۔

اسرائیل کا بھرپور دفاع کرنے والوں میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو ایسا مذہبی بنیاد پر نہیں بلکہ

اس لیے کرتے ہیں کہ ان کے خیال میں اسرائیل، اس خطہ میں امریکہ کے فوجی، اقتصادی اور سیاسی مفادات کا رکھوالا ہے۔ سالہا سال سے وہ اسرائیل کو روسی جارحیت کے خلاف ایک مضبوط بند کا درجہ دیتے ہیں۔ آج وہ اسے ایران جیسے ممالک کی مذہبی انتہا پسندی کے خلاف ایک اچھا توڑ جانتے ہیں اور اس فوجی مداخلت کا اور ایک مؤثر توڑ بھی جو عراق کے صدام حسین کی شکل میں موجود ہے۔ میرے خیال میں وہ غلطی پر ہیں۔

اسرائیل کے بارے میں بیشتر غلط فہمیاں ان عیسائی اور یہودی مذہبی مبلغین نے پھیلائی ہیں جو سالہا سال سے انہیں ہوا دیتے آرہے ہیں۔ حتیٰ کہ لوگ انہیں حقیقت سمجھنے لگے۔ بیشتر امریکنوں کے لیے یہ دغا وفریب ہی اسرائیل کو مزید فوجی، اقتصادی اور سیاسی امداد کی بنیاد فراہم کرتا ہے۔ بہت سارے قارئین کو اسرائیل کی یہ صورت جو کہ داستان طرازیوں کی بجائے حقیقی باتوں پر مشتمل ہے چونکا کر رکھ دے گی۔

اگر عرب اسرائیل مناقشہ کی تاریخ آج رقم ہو تو یہ صاف ظاہر ہوگا کہ امریکی عیسائیوں اور یہودیوں کی بہت بڑی اکثریت اسرائیل کی غیر انسانی پالیسیوں کے بارے میں یا تو خاموشی کی مجرم ہے یا پھر بالواسطہ ایسی پالیسیوں کے عمل پذیر ہونے میں اعانت مجرمانہ کی ذمہ دار ہے۔ اس کتاب کا مقصد واحد ایسی معلومات فراہم کرنا ہے کہ حساس شہری اس سے متاثر ہو کر تبدیلی کا مطالبہ کریں۔



حصہ اول

فتح اور ریاست کا قیام

باب: ۱

فلسطین پر اسرائیلی دعویٰ

اسرائیلی فلسطین میں اپنی ریاست کے قیام کی بنیاد جن تین بڑے ماخذوں پر تعمیر کرتا ہے وہ ہیں اوّل — انجیل میں عہد نامہ قدیم کی میراث، دوم — ۱۹۱۷ء میں حکومت برطانیہ کا اعلان بالفور اور سوم — ۱۹۴۷ء میں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کی سفارش جس میں فلسطین کو عربوں اور یہودیوں میں تقسیم کرنے کے لیے کہا گیا تھا:

فریب "ہم اپنے قدرتی اور تاریخی حق کی بنیاد پر... (ہم) یہاں ارض اسرائیل میں ایک یہودی ریاست کے قیام کا اعلان کرتے ہیں۔ یعنی ریاست اسرائیل۔

(۱۹۴۸ء میں اسرائیل کا اعلانِ آزادی)

حقیقت:

تاریخی لحاظ سے یہودی فلسطین کے قدیم ترین باشندے نہیں ہیں اور نہ ہی انہوں نے وہاں اتنا عرصہ حکومت کی جتنی کہ کئی دوسری اقوام نے۔

جدید ماہرین آثار قدیمہ اب اس بات پر عام طور سے اتفاق کرتے ہیں کہ یہاں کے قدیم ترین باشندے یعنی ۳۰۰۰ قبل مسیح سے لے کر تقریباً ۱۷۰۰ قبل مسیح تک... کنعانی اور مصری تھے۔ جن کا ذکر قدیم کتب میں ملتا ہے۔ ان کے یکے بعد دیگرے دوسری اقوام مثلاً ہکسو، حطی اور فلسطینی آئے۔ یہودی حکومت کا عہد ۱۰۲۰ قبل مسیح سے شروع ہو کر ۵۸۷ قبل مسیح تک رہا۔ اس کے بعد اسرائیلیوں کو اسیرین، اہل بابل، مصریوں اور شامیوں نے روند ڈالا۔ حتیٰ کہ ۱۶۴ ق۔م میں عبرانی مکلعبیوں نے اقتدار جزوی طور پر بحال کیا۔ بہر حال ۸۳ ق۔م میں سلطنت روما نے یروشلم فتح کر کے ۷۰ء کے لگ بھگ یہودی معبد ثانی کو مسمار کر ڈالا اور یہودیوں کو دوسرے علاقوں میں منتشر کر دیا۔

مجموعی طور پر فلسطین کی پانچ ہزار سالہ دستاویزی تاریخ میں قدیم یہودیوں نے اسے یا اس کے

ایک بڑے حصہ کو محض چھ سو سال تک کنٹرول کیا یعنی کنعانیوں، مصریوں، مسلمانوں اور رومیوں سے بھی کم بقول امریکی ''کنگ کرین کمیشن'' ۱۹۱۹ء کے اس دو ہزار سال پیشتر قبضہ کو بنیاد بنا کر دعویٰ ملکیت کرنا سنجیدگی سے نہیں لیا جاسکتا!

۱۴ رمئی ۱۹۴۸ء کو تل ابیب میں جو میٹنگ ہوئی جس میں اس ''قدرتی اور تاریخی حق'' کے طور پر اعلان آزادی کیا گیا تھا اس میں صرف (۳۷) سینتیس افراد شریک ہوئے تھے۔ ناقدین کا کہنا ہے کہ ان کے اس اقدام کی بین الاقوامی عالمی قانون میں کوئی مستند حیثیت نہیں کیونکہ وہ اس وقت کی آبادی کی اکثریت کی نمائندگی نہیں کرتے تھے۔ درحقیقت ان میں سے صرف ایک فلسطین کا پیدائشی شہری تھا بقیہ (۳۵) یورپی ممالک سے تھے اور ایک یمن کا باشندہ تھا۔ بقول ایک فلسطینی دانشور عیسیٰ نخلح کے ''یہودی اقلیت کو ایک ایسے علاقے میں اپنی آزاد ریاست کے قیام کا اعلان کرنے کا کوئی حق نہیں تھا جہاں فلسطینی عرب قوم آباد تھی۔''

فریب: ''اسرائیل کا عالمی پیدائشی سرٹیفکیٹ'' انجیل کے وعدہ سے سچا ثابت ہوتا ہے۔''
(AIPAC ۱۹۹۲ء)

حقیقت:

قبائلی اور قومی امنگوں کے لیے خدائی امداد کو بنیاد بنانا دنیا کا ایک قدیم رواج رہا ہے۔ سمیریوں، مصریوں، یونانیوں اور رومنوں سبھی نے اپنی فتوحات کا سہرا الہامی فیضان کے سر باندھا ہے۔ بقول ایکا مؤرخ فرینک ایپ کے ''تمام مظاہر اور زندگی کو کسی خدا یا خداؤں کا مظہر تصور کیا جاتا تھا... عمدہ زمین، عمدہ قوموں کو عطا کی جاتی تھی اعلیٰ خداوند کی طرف سے۔'' موجودہ دور میں کوئی عدالت یا علمی ادارہ اس بناء پر کسی حق ملکیت کو جائزہ قانونی تسلیم نہیں کرے گا کہ اس کا سرچشمہ خدا کی ذات ہے۔ جو لوگ انجیل کو عطاءِ ربانی مانتے ہیں ان میں بھی ''ویز لے مذہبی مدرسہ'' کے ڈاکٹر ڈیوی بیگل جیسے لوگ موجود ہیں جو کہتے ہیں کہ قدیم یہودیوں نے الٰہی احکامات کی خلاف ورزی کر کے اپنے اس حق کو کھو دیا تھا۔

فریب: ''بالفور اعلان میں (یہودیوں کے فلسطین میں دوبارہ آباد ہونے کے) حق کو تسلیم کیا گیا تھا۔''
(اسرائیل کا اعلانِ آزادی ۱۹۴۸ء)

حقیقت:

اعلان بالفور میں جان بوجھ کر ایک ''قوم یہود'' کے قیام کی تصدیق نہیں کی گئی تھی۔ یہ اعلان

۲/نومبر ۱۹۱۷ء کو اس خط میں کیا گیا تھا جو برطانوی سکریٹری خارجہ لارڈ آرتھر بالفور نے برطانوی صیہونی فیڈریشن کے صدر لارڈ روتھ چائلڈ کو بھجوایا تھا۔ یہ بیان برطانوی کابینہ کا منظور شدہ تھا اور اس میں درج تھا ''فلسطین میں اہل یہود کے لیے ایک قومی وطن کے قیام کو ہزمیجسٹی کی حکومت پسندیدگی کی نظر سے دیکھتی ہے اور اس مقصد کے حصول کے لیے وہ اپنی تمام تر صلاحیتوں کو بروئے کار لائے گی لیکن یہ ملحوظ خاطر رکھنا ہوگا کہ کوئی ایسا قدم نہ اٹھایا جائے جس سے موجودہ غیر یہودی فلسطینی آبادیوں کے شہری یا مذہبی حقوق کو کوئی زک پہنچے اور نہ ہی کسی دوسرے ملک میں آباد یہودی آبادی کے سیاسی مرتبہ یا حقوق جو انہیں وہاں حاصل ہیں وہ متاثر ہوں۔''

۱۹۳۹ء میں ایک برطانوی وائٹ پیپر میں برملا کہا گیا کہ برطانیہ ''کا ہرگز یہ ارادہ نہ تھا کہ فلسطین کو اس کی عرب آبادی کی مرضی کے خلاف ایک یہودی ریاست میں تبدیل کر دیا جائے۔''

مغالطہ ''فلسطین ایک غیر آباد علاقہ ہے... ان لوگوں (یہودیوں) کے لیے جو بے خانماں ہیں۔''

(اسرائیل ضانگ ول۔ ابتدائی صیہونی ۱۸۹۷ء)

حقیقت:

۱۹۱۷ء میں اعلان بالفور کے وقت فلسطین میں کوئی چھ لاکھ عرب اور صرف ساٹھ ہزار یہودی آباد تھے۔ آئندہ تیس برس میں یہ فرق گھٹتا گیا خاص طور سے ہٹلر کی یہود مخالف (Anti-Semitic) (اس کا صحیح ترجمہ ''یہود مخالف'' نہیں ہے لیکن اب اسرائیلی اس کو انہی معنوں میں لیتے ہیں... مترجم) پالیسیوں کے باعث! بہر حال ۱۹۴۷ء میں جب اقوام متحدہ نے عندیہ دیا تو اس وقت بھی عربوں کی دو تہائی اکثریت تھی اور یہودی صرف ایک تہائی تھے... یعنی عربوں کی آبادی ۱۲۳۷۳۳۲ جب کہ یہودی صرف ۶۰۸۲۲۵ تھے۔ ضانگ ول کے ایک دوست اور پرانے صیہونی میکس ناردو کو جب یہ علم ہوا کہ فلسطین میں ۱۸۹۷ء میں بھی مقامی عرب آبادی موجود تھی تو اس کا کہنا تھا۔ ''ہم بے انصافی کر رہے ہیں!''

نہ صرف یہ کہ مقامی عرب آبادی موجود تھی بلکہ ان کا ایک تسلیم شدہ ڈھانچہ تھا جسے دوسرے تمام عرب امتیازی طور پر ''فلسطینی'' کہہ کر پکارتے تھے!

ان میں دانشور اور پیشہ ورانہ طبقات، سیاسی تنظیمیں اور ایک ترقی پذیر زرعی معیشت موجود تھی جو ایک جدید صنعت میں ڈھل رہی تھی۔ ایک دانشور جان کویگلے کے بقول ''عرب آبادی صدیوں سے

قائم چلی آ رہی تھی۔ انیسویں صدی میں کوئی خاص اندرونی نقل مکانی نہ ہوئی تھی'' !

فریب ''ہم اپنے حق... اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کی قرارداد کی رو سے (ہم) ارضِ اسرائیل میں ایک یہودی حکومت کے قیام کا اعلان کرتے ہیں۔ یعنی ریاست اسرائیل!''

(اسرائیل کا اعلانِ آزادی ۱۹۴۸ء)

حقیقت:

یہ صرف ٹرومین انتظامیہ کا زبردست دباؤ ہی تھا جس نے ۲۹ نومبر ۱۹۴۷ء کو اقوام متحدہ کی یہ تقسیم پلان جنرل اسمبلی سے منظور کروائی۔ اس کی حمایت میں ۳۳، خلاف ۱۳ ووٹ پڑے جب کہ ایک نمائندہ غیر حاضر تھا اور دس نمائندوں نے ووٹ نہ دیا۔ جو ممالک امریکی دباؤ کے سامنے گھٹنے ٹیک گئے وہ تھے فرانس، حبشہ، ہیٹی، لائبیریا، لکسمبرگ، پیراگوئے اور فلپائن۔ سابقہ سکریٹری آف اسٹیٹ سمر ویلز کا کہنا تھا: ''مسلم دنیا کے علاوہ ان ممالک پر امریکی حکام کا زبردست دباؤ... بلاواسطہ یا بالواسطہ طور پر ڈالا گیا جن کے بارے میں معلوم تھا کہ وہ اس تقسیم کے پلان کے مخالف ہیں یا گومگو کا رویہ رکھتے ہیں۔ مختلف نمائندوں اور گماشتوں کے ذریعے امریکہ نے اس بات کو یقینی بنایا کہ مطلوبہ اکثریت حاصل ہو کر رہے۔

یہ تقسیم پلان یعنی قرارداد نمبر ۱۸۱ فلسطین کو ''آزاد عرب اور یہود ریاستوں میں تقسیم کرتی ہے جب کہ یروشلم کو خصوصی شہر کی حیثیت حاصل ہوگی۔'' اسرائیل کے مستقبل کے وزیر خارجہ موشے شارط کا بیان تھا کہ اس قرارداد میں ''مستقل قوت نفاذ'' تھی اسرائیل کے اعلان آزادی میں اس کا تین مرتبہ حوالہ دیا گیا ہے کہ یہ قیام اسرائیل کی جائز قانونی بنیاد فراہم کرتی ہے۔ لیکن سیکورٹی کونسل کے برخلاف جنرل اسمبلی کو سفارشات کرنے کے علاوہ کوئی بھی اختیار حاصل نہیں۔ یہ اپنی سفارشات کو نافذ نہیں کر سکتی اور نہ ہی انہیں کوئی قانونی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ ماسوا اقوام متحدہ کے داخلی معاملات کے!''

عجب نہیں جو فلسطینیوں نے اس تقسیم پلان کو مسترد کر دیا۔ انہیں اس کا حق تھا کیونکہ یہ ایک تہائی آبادی کو... جس کا فلسطین کے پندرہویں حصہ سے بھی کم یعنی صرف ساڑھے چھ فیصد علاقے پر قبضہ تھا نصف سے زائد فلسطین عطا کر رہی تھی!

مزید براں فلسطینیوں کا یہ کہنا تھا کہ اقوام متحدہ کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ فلسطین کی آبادی کی

اکثریت کی مخالفت کے باوجود یہ تقسیم پلان منظور کرے۔ کچھ بھی ہو اس تقسیم پلان کو نامنظور کر کے فلسطینیوں نے اپنے آزاد ملک کے قیام کے حق سے دستبرداری قبول نہیں کی۔ ان کی مخالفت فلسطین کی سرزمین پر ایک یہودی ریاست کے قیام پر تھی نہ کہ اہل یہود کے بطور ایک قوم کے اپنے حقوق پر۔

یہودی لیڈر ڈیوڈ بن گوریان نے اپنے ساتھیوں پر زور دیا کہ وہ یہ تقسیم پلان منظور کر لیں کیونکہ بقول اس کے "تاریخ میں کچھ بھی حتمی اور آخری نہیں ہوتا... نہ حکومت کے بارے میں، نہ سرحدوں کے بارے میں اور نہ ہی بین الاقوامی معاہدوں کے بارے میں!"

صہیونیت کے ایک عظیم بنیادی رکن ناہم گولڈ مین نے اس حقیقت کو ذرا مختلف انداز میں یوں بیان کیا "ایسی اسرائیلی ریاست کا بھلا کیا مستقبل ہوگا جسے اگلے پچاس برس تک عرب دشمنوں کی مزاحمت کا سامنا ہو!"

فریب "اردن پہلے اسرائیل کا حصہ تھا!" (ایریل شیرون اسرائیلی وزیر تجارت ۱۹۸۹ء)

حقیقت:

اسلامی عثمانیہ سلطنت کی طویل تاریخ میں فلسطین کبھی بھی ایک علیحدہ مملکت یا انتظامی اکائی کے طور پر قائم نہیں رہا۔ جب مشرقی بحیرہ روم اور مصر و لبنان کا درمیانی علاقہ برطانیہ نے پہلی عالمی جنگ کے بعد ترکی سے چھینا جس کو ہم آج کل فلسطین کہہ کر پکارتے ہیں تو اس کے بیشتر حصے لبنان کے زیر انتظام تھے جب کہ یروشلم کو ایک خودمختار علاقے کی حیثیت حاصل تھی۔ تل ابیب یونیورسٹی کے ایک پروفیسر ہارون کلیمان کے بقول دریائے اردن کا مشرقی علاقہ یعنی شرق اردن ترکوں کے لیے ایک علاقہ ممنوعہ کی حیثیت رکھتا تھا۔ سلطنت عثمانیہ کی تقسیم کے وقت اسے یونہی چھوڑ دیا گیا تھا۔

۱۹۲۲ء میں جب لیگ آف نیشنز نے فلسطین کو برطانیہ کے اقدار میں دیا تو اس میں شرق اردن کا علاقہ میسوپوٹیمیا تک شامل تھا جو بعد میں عراق کہلایا۔ آج کل کے محاورہ میں اس میں اسرائیل، مغربی کنارہ، غزہ کی پٹی اور یروشلم شامل تھے۔ دسمبر ۱۹۲۲ء میں برطانیہ نے یہ اعلان کیا کہ وہ "ماوراء اردن ایک آزاد دستوری حکومت" کو تسلیم کرتا ہے اور ۱۹۲۸ء میں اس نے خصوصی طور پر دریائے اردن کے مغرب میں واقع علاقے کو فلسطین قرار دیا۔ برطانیہ صرف اس ارض فلسطین میں اعلان بالفور کے مطابق ایک آزاد یہودی ریاست کے قیام میں امداد کو اپنی ذمہ داری سمجھتا تھا۔

❀ ❀

باب: دوم

۱۹۴۸ء کی جنگ

۱۹۴۷ء کا اقوام متحدہ کا تقسیم فلسطین پلان یہودی اور فلسطینی مملکتوں کے قیام کی سفارش کرتا تھا۔ یہودی افواج نے فوراً ہی میدان سنبھال لیا۔ انہوں نے پہلے وہ علاقے قبضے کئے جو یہودیوں کے لیے مختص کئے گئے تھے اور بعد ازاں ان علاقوں میں بھی پھیل گئے جو فلسطینیوں کے لئے مختص کئے گئے تھے۔ ۲رجنوری ۱۹۴۹ء تک یعنی تقریباً سال بھر جنگ جاری رہی۔ اوّل عرصہ میں تو باقاعدہ یہودی افواج کا مقابلہ بے قاعدہ عرب دستوں سے رہا جب کہ دوسرے مرحلہ میں یہودی یونٹوں کا مقابلہ ان پانچ عرب افواج سے رہا جو ۱۴رمئی ۱۹۴۸ء کو قیام اسرائیل کا اعلان ہوتے ہی اگلے دن وہاں گھس آئی تھیں۔

فریب ''ہم یقیناً جنگ کے لیے تیار نہ تھے!'' (مسز گولڈا مائیر اسرائیلی وزیر اعظم ۱۹۷۵ء)

حقیقت:

اسرائیل کی جنگی تیاریاں تو ۲۹رنومبر ۱۹۴۷ء کے فوراً ہی بعد شروع ہوگئی تھیں یعنی جب اقوام متحدہ نے تقسیم پلان کا اعلان کیا۔ سترہ سے پچیس سال کی عمر کے تمام یہودیوں کو فوجی خدمات کے لیے اپنے نام درج کرانے کی ہدایت کی گئی۔ ۵ردسمبر ۱۹۴۷ء کو صیہونی لیڈر ڈیوڈ بن گوریان نے ''فوری ایکشن'' کا حکم جاری کیا جس کے تحت یہودی آبادیوں کو ان تین علاقوں میں پھیلا دینے کو کہا گیا جو اقوام متحدہ نے عرب فلسطینی ریاست کے لیے مختص کئے تھے۔ دسمبر کے وسط تک فلسطینی عربوں کے خلاف ایک باقاعدہ فوجی ایکشن شروع ہوگیا۔ اس فوجی پلان کو ''جمل'' کا نام دیا گیا۔ اس کا مقصد وقت حاصل کرنا تھا تاکہ یہودی افواج کو متحرک کرکے وہ اہم چوکیاں قبضہ میں کر لی جائیں جو انگریز خالی کرکے جا رہے تھے اور دوسرا مقصد عرب آبادی کو تشدد کرکے مطیع بنانا تھا۔ پہلا اہم حملہ ۱۸ردسمبر کو ہوا جس میں یہودی انڈر گراؤنڈ ''ہگانہ'' فوج کے ''طوفانی دستوں'' نے حصہ لیا جس کا نام Palmach Troops تھا۔ یہ حملہ ایک فلسطینی گاؤں خصاص پر جو شمالی گیلیلی میں واقع ہے رات کے

وقت کیا گیا۔ اس میں پانچ افراد اور پانچ بچے مارے گئے اور پانچ مزید زخمی ہوئے۔

وہاں پر تعینات برطانوی مبصر کرسٹوفر سائیکس کا کہنا ہے کہ خصاص پر حملہ اس جدوجہد کی ایک نئی جہت کا عکاس تھا۔ اس جدوجہد میں اب ''اکا دکا چھاپوں اور جوابی چھاپوں کی بجائے باقاعدہ حملوں اور ظلم کا چلن تھا۔''

۱۹ دسمبر کو بن گوریان نے حکم دیا کہ یہودی دستوں کو پوری قوت سے حملہ کرنا چاہیے: ''ہر حملہ میں فیصلہ کن ضرب لگائی جائے جس سے گھر تباہ ہوں اور آبادی بے خانماں ہو جائے'' چنانچہ پیشتر اس کے کہ ۱۵ مئی ۱۹۴۸ء کو پانچ عرب افواج فلسطین میں داخل ہوں صیہونی اپنی جنگی حکمت عملی میں کافی پیش رفت کر چکے تھے!

فریب ''یہودیوں پر مکمل جنگ مسلط کی گئی تھی!'' (جیکب نطور۔ صیہونیت ۱۹۷۹ء)

حقیقت:

۱۹۴۷ء کے اقوام متحدہ تقسیم پلان کے چند ہفتوں کے اندر اسرائیل کی فوج حرکت میں تھی۔ صیہونیوں کا باقاعدہ طے شدہ فوجی حملہ ''جمل'' پلان کے مطابق وسط دسمبر میں شروع ہوا۔ اوائل مارچ ۱۹۴۸ء میں یہودی اپنی Plan-Dalet پر عمل کر رہے تھے۔ جس کا مقصد گیلیلی اور تل ابیب و یروشلم کے درمیان واقع علاقہ پر قبضہ کرنا تھا جو اقوام متحدہ تقسیم پلان کی رو سے ایک فلسطینی ریاست کا حصہ ہوتا۔ گویا پانچ عرب افواج کے داخلے سے کہیں پیشتر یعنی ۱۵ مئی تک اسرائیل اپنی اقوام متحدہ کی طے کی گئی حدود سے باہر فلسطین کا معتد بہ حصہ فتح کر چکا تھا۔

اس کے برخلاف عرب سالار تو پہلی مرتبہ ۳۰ اپریل ۱۹۴۸ء کو باہمی طور ملے تاکہ فوجی مداخلت کا طریق کار طے کر سکیں۔ ایک اسرائیلی تاریخ دان سمہا فلاپن کا کہنا ہے کہ اتنے دن گزر جانے پر بھی عرب لیڈران انتہائے ناامیدی میں ایک ایسے فارمولے کی تلاش میں تھے جو ان کا بھرم بھی رکھ لے اور فوجی اقدام بھی نہ کرنا پڑے! ۱۳ مئی کو مصر میں امریکی سفیر نے عربوں کی پست ہمتی کی اطلاع دی اور لکھا: ''باخبر حلقوں کی یہ رائے ہے کہ اس وقت عرب کسی بھی ایسی بات کو مان لیں گے جو ان کا بھرم رکھ لے اور کھلی جنگ نہ ہو!''

اردن کے جنگی مقاصد یہودی حکومت کے قیام یا تقسیم فلسطین کے خلاف ہرگز نہ تھے۔ اس نے تو تقسیم کی پلان تسلیم کر لی تھی۔ اس کا مقصد اسرائیل کو وہ علاقے فتح کرنے سے باز رکھنا تھا جو تقسیم

کے پلان کی رو سے یہودی ریاست کا حصہ نہ تھے۔ ایک اسرائیلی تاریخ دان ابراہیم سیلا کے بقول اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ "عرب لیجن" (اردن کی فوج) کی تقریباً ساری جنگیں یہودی علاقہ سے باہر ہوئیں۔ اس میں یروشلم کی لڑائی بھی شامل ہے۔

یکم جون کو اسرائیل کے اقوام متحدہ وفد نے اعلان کیا کہ اسرائیل کے قیام کے بعد دو ہفتہ کی لڑائیوں کے دوران اس نے اپنی اقوام متحدہ کی طے کردہ سرحدوں کے ماوراء ۴۰۰ مربع میل زائد علاقہ ہتھیا لیا ہے اور اب اسرائیل کی اقوام متحدہ والی مقرر کردہ سرحدوں کے اندر کوئی لڑائی نہیں ہو رہی۔ اس اعلامیہ میں کہا گیا "اسرائیل کی ریاست کا علاقہ اب ہر قسم کے حملہ آوروں سے پاک ہے!"

فریب "(عربوں کو) ہتھیاروں میں قطعی برتری حاصل تھی۔ ان کے پاس افرادی قوت کی بہتات تھی۔ چاہے وہ رضاکار ہوں یا لڑائی کی اہلیت رکھنے والے ہوں!"

(یگال ایلن۔ اسرائیلی نائب وزیراعظم ۱۹۷۰ء)

حقیقت:

فلسطینی یہودیوں کے پاس ان کے عرب ہمسایوں یا دوسرے فلسطینیوں کے مقابلہ میں بہتر اسلحہ موجود تھا۔ گو ظاہراً سرکاری طور پر یہودیوں اور عربوں دونوں کے لیے امریکہ اور زیادہ تر یورپی ممالک میں اسلحہ خریدنے پر پابندی لگی ہوئی تھی لیکن ۱۹۴۸ء کے اوائل میں یہودیوں کو زیکوسلاویکیہ سے چوری چھپے اسلحہ کے معتد بہ ذخائر مہیا کئے گئے تھے۔ ان میں سے صرف ایک معاہدے میں ۲۴۵۰۰ رائفلیں ۵۰۰۰ ہلکی مشین گنیں، ۵ کروڑ چالیس لاکھ گولیاں اور ۲۵ جرمن ساخت کے جنگی ہوائی جہاز تھے۔ ۱۵ مئی ۱۹۴۸ء کو باقاعدہ جنگ شروع ہونے سے پہلے ہی عربوں کے مجموعی ۱۱۳ بکتر بند گاڑیوں، ۴۰ مارٹر گنوں اور ۱۰۲ توپوں کے مقابلے میں اسرائیل ۸۰۰ بکتر بند گاڑیاں، ۸۷۰ مارٹر گنیں اور ۴ فیلڈ گنیں میدان میں اتارنے کے قابل ہو گیا تھا۔

اس عرصہ میں امریکی ممانعت کی خلاف ورزی کرتے ہوئے یہودیوں کو امریکی صہیونیوں سے بھی بڑی تعداد میں اسلحہ فراہم کیا گیا۔ یہ اسلحہ مہیا کرنے والوں میں مالدار امریکی یہودیوں کا ایک گروپ شامل تھا جس کا سرغنہ نیویارک کا ایک کروڑ پتی صنعت کار رووڈلف۔ جی۔ سونے بورن تھا۔ دو مزید گروپ متحدہ ڈسٹری بیوشن کمیٹی اور سروس ایئرویز تھے۔ جس کا سربراہ ایک امریکی یہودی ایڈولف ولیم شوومر تھا جو پہلے TWA کا فلائٹ انجینیئر تھا۔ ایک اور بڑا کھلاڑی آسٹرین نژاد ٹیڈی

کولیک تھا۔ وہ اسرائیلی خفیہ اسلحہ خریداری کا نیویارک میں سرغنہ تھا وہ بعد ازاں یہودی مغربی یروشلم کا میئر بنا۔

شومر اور اس کی ہوائی کمپنی ان چند یہودی زیر مین گروپوں میں شامل تھی جن پر واقعی غیر قانونی تجارت کرنے پر مقدمہ چلایا گیا۔ لاس اینجلیز کی وفاقی عدالت نے اسے مجرم ٹھہرایا۔ ۱۹۵۰ء میں اسے دس ہزار ڈالر جرمانہ کیا گیا کیونکہ اس نے اسرائیل اور دوسرے مالک کو ہوائی جہاز اور ان کے فالتو پرزے مہیا کئے تھے۔ بعد ازاں یہی شومر اسرائیل کی ہوائی جہازوں کی کمپنی یعنی اسرائیل ایئر کرافٹ انڈسٹری کا سربراہ بنا۔ یہ شخص ۱۹۸۵ء مین صدر ریگن کے دور حکومت میں ایران/کونٹر افضیحتے میں بطور ایک بڑے کھلاڑی کے نمودار ہوا تھا۔

فریب ''ہمارے دشمن بیس گنا عددی برتری رکھنے کے باوجود ہمیں قوت کے بل پر شکست دینے میں ناکام رہے۔'' (خائم وائزمین۔ ۱۹۴۸ء میں اسرائیل کا عارضی عبوری صدر)

حقیقت:

۱۵ رمئی ۱۹۴۸ء کو جنگی افواج پانچ عرب ممالک نے مل کر میدان میں اتاری تھیں۔ اسرائیلی تربیت یافتہ فوج اس سے زیادہ تھی۔ تمام دوران جنگ یہی حال رہا۔ اگلے مورچوں میں لڑنے والی تربیت یافتہ اسرائیلی فوج کی تعداد ۲۷۴۰۰ پر مشتمل تھی جب کہ اس کے مقابل عرب ریاستوں کی فوج ۱۳۸۷۶ تھی۔ ۲۸۰۰ مصر، ۴۰۰۰ عراق، ۷۰۰ لبنان، ۱۸۷۶ء شام اورمشرقی اردن سے صرف ۴۵۰۰ فوجی تھے۔

۱۸ رمئی کو امریکی انٹیلی جنیس (فوجی) کے مطابق ۴۰۰۰۰ یہودی سپاہیوں اور ۵۰۰۰۰ ملیشیا والوں کا مقابلہ ۲۰۰۰۰ عرب افواج اور ۱۳۰۰۰ چھاپہ ماروں سے تھا۔ بقول اسرائیل تاریخ دان سمہا فلاپن کے اسرائیلیوں کو زیادہ تعداد کا سامنا نہیں تھا۔ اس بارے میں اعداد پر اختلاف رائے ہونے کے باوجود زیادہ تر مبصروں کا اس پر اتفاق ہے۔

فریب ''(۱۹۴۸ء میں عرب اس قدر طاقتور تھے) زیادہ تر فوجی ماہرین کی رائے میں اسرائیل کے جلد روندے جانے کی توقع تھی۔''

(ٹیرینس پریٹی اور بی۔ ڈنین ''اخراج ثانی'' ۱۹۷۶ء)

حقیقت:

اسرائیل کو فوجیوں اور اسلحہ میں جس قدر برتری حاصل تھی اس کے باعث کسی بھی مبصر کو اس

بات میں ذرہ بھر شک نہ تھا کہ وہ جنگ جیت جائے گا۔ امریکہ کے سکریٹری آف اسٹیٹ جارج مارشل نے جنگ کے آغاز سے ایک دن پیشتر ہی تمام امریکی سفارت خانوں کو یہ اطلاع دے دی تھی کہ عرب افواج کمزور ہیں اور اسرائیل کا مقابلہ نہیں کرسکیں گی۔ اسے زیادہ تشویش اس بات پر تھی کہ اگر یہودیوں نے اپنے انتہا پسندوں کے کہنے میں آکر عربوں کی طرف نفرت انگیز رویہ اپنایا تو پھر جو یہودی ریاست قائم ہوگی وہ بغیر لگاتار بیرونی امداد کے زندہ نہ رہ سکے گی۔

جنگ پھوٹ پڑنے سے دو دن پہلے یعنی ۱۳ رمئی کو مصر میں امریکی سفیر نے رپورٹ بھیجی کہ عربوں کو غیر ممالک سے اسلحہ حاصل کرنے میں ناکامی ہوئی ہے اور ان کے حوصلے پست ہیں۔ بقول اس کے ''اندیشہ یہ ہے کہ غالباً عرب افواج کو یہودیوں کے ہاتھوں شکست فاش ہوگی!''

اردن کے شاہ عبداللہ نے برابر انتباہ کیا ''یہودی بے حد طاقتور ہیں۔ جنگ کرنا ایک غلطی ہوگا۔'' برطانوی نژاد گلب پاشا جسے افسانوی شہرت حاصل تھی، کا کہنا تھا ''میں نے (اردن کی حکومت) کو یہ اطلاع دینے کا کوئی موقعہ ہاتھ سے نہ جانے دیا کہ شرق اردن کے پاس یہودی ریاست سے جنگ کرنے کے لیے مطلوبہ وسائل میسر نہیں!''

سمہا فلاپن کا کہنا تھا ''عربوں کے ارادے اور اہلیت کے بارے میں ایک یہودی ایجنسی کی رپورٹ کے مطابق عرب سپہ سالاروں نے اپنی اپنی حکومتوں کو فلسطین میں فوج کشی اور کسی طویل جنگ کے خطرات سے آگاہ کردیا تھا۔ ایک پاکستانی فوجی مؤرخ سید علی العدروس کا کہنا تھا کہ جہاں تک پیشہ ورانہ فوجی معاملات کا تعلق ہے عربوں کے پاس کسی قسم کا پلان نہ تھا۔

تقریباً چالیس سال گزرنے کے بعد ایک اسرائیلی مورخ بنی مورس کے بقول فلسطین کی یہودی آبادی وہاں کی عرب آبادی سے کہیں زیادہ منظم اور طاقتور تھی۔

فریب ''ہماری جنگِ آزادی کے دوران ہمارے بھی دہشت گرد گروہ تھے... مثلاً اسٹرن اور ارگن... لیکن ان میں سے کسی نے بھی وہ بدنامی حاصل نہ کی جو عربوں نے ہمارے مقابلے میں کی۔'' (مسز گولڈا مائیر۔ اسرائیلی وزیر اعظم ۱۹۷۲ء)

حقیقت:

۴۸-۱۹۴۷ء میں جب اسرائیل کا آغاز ہوا تو فلسطین میں ہر طرف دہشت گردی کا دور دورہ تھا جو کہ زیادہ تر صہیونی ہی روا رکھ رہے تھے۔ یہودی لیڈر ڈیوڈ بن گوریان نے اسرائیل کی اپنی ذاتی

تاریخ میں یہ رقم کیا ہے کہ "۱۹۴۶ء سے لے کر ۱۹۴۷ء تک فلسطین کے مقامی یہودیوں پر مقامی عربوں کی طرف سے شاید ہی کوئی حملہ ہوا ہو۔" لیکن جونہی ۱۹۴۸ء میں جنگ بھڑکی تو دونوں جانب سے دہشت گردی میں اضافہ ہوا لیکن صیہونی دہشت گردوں کے منظم اور بار بار حملوں کا عربوں کے پاس کوئی توڑ نہ تھا۔ ۱۹۴۸ء میں ایک برطانوی میجر آر۔ ڈی۔ ولسن کا کہنا تھا "انہوں نے عرب دیہاتوں پر وحشیانہ حملے کئے اس دوران وہ بغیر ذرّہ بھر تمیز کئے عورتوں اور بچوں تک کو ہلاک کر دیتے۔"

صیہونی دہشت گردی زیادہ تر دو گروہوں نے برپا کی جن کے نام "ارگن" اور "لے ہی" (اسٹرن) گینگ تھے۔ ان میں یروشلم کے کنگ ڈیوڈ ہوٹل کا ۱۹۴۶ء کا دھماکہ بھی شامل ہے جس میں ۹۱ لوگ ہلاک ہوئے جس میں اکتالیس عرب، اٹھائیس برطانوی اور سترہ یہودی تھے۔ ۱۹۴۷ء میں دو برطانوی سپاہیوں کو پھانسی پر لٹکا دیا گیا جنہیں پھندے لگا کر قابو کیا گیا تھا۔ ۱۹۴۸ء میں عربوں کے سیمی رگمیس ہوٹل پر یروشلم میں حملہ کیا گیا جس میں عورتوں، بچوں سمیت بائیس عرب ہلاک ہوئے۔ ۱۹۴۸ء میں ہی دیر یاسین کے عرب شہر میں ۲۵۴ مردوں، عورتوں اور بچوں کا قتل عام کیا گیا۔ ۱۹۴۸ء میں دوایمیا گاؤں میں بیسیوں شہریوں کو ہلاک کیا گیا۔ ۱۹۴۸ء میں اقوام متحدہ کے نمائندہ خصوصی اکاؤنٹ برناڈوٹ (سویڈن کا باشندہ) کو بھی ہلاک کیا گیا۔ ارگن کا سربراہ مناخم بیگن تھا جب کہ اسٹرن گینگ کے لیڈروں میں ٹیزاق شامیر شامل تھا۔ یہ دونوں حضرات بعد ازاں باری باری اسرائیل کے وزیر اعظم بنے!

فریب "ہم عربوں کو خانہ بدر نہیں کرنا چاہتے۔ نہ ہی ان کی زمین ہتھیانا چاہتے ہیں اور نہ ہی وراثت سے محروم کرنا۔" (۱۹۱۵ء میں ڈیوڈ بن گوریان کا بطور ایک صیہونی کے بیان)

حقیقت:

۱۹۴۸ء میں جنگ کے بعد عرب علاقے فتح ہونے پر یہودیوں نے فلسطینیوں کی املاک کو لوٹا بھی اور ضبط بھی کیا۔ ایک اسرائیلی مؤرخ ٹام سجف کے بقول لوٹ مار بہت تھی۔ اس نے ایک عینی شاہد اسرائیلی مصنف موشے سمیلینسکی کا حوالہ دیتے ہوئے کہا "ہر کوئی لوٹ مار کے لیے باؤلا ہو رہا تھا۔ نہ صرف افراد بلکہ مختلف گروہ، فرقے، عام عورتیں اور بچے تک مال غنیمت جمع کرنے میں مشغول تھے" کابینہ کے ایک وزیر ہارون چیز لنگ نے شکایتاً کہا کہ "جب یہ لوگ کسی بستی میں داخل ہوتے اور زبردستی کسی انگلی سے انگوٹھی یا کسی کے گلے سے زیور اترواتے تو یہ ایک بہت سنگین مسئلہ بن جاتا... بہت سے لوگ یہ گناہ کر رہے تھے!"

فلسطین کے اصلی بارہ لاکھ باشندوں میں سے تقریباً دو تہائی ملک بدر ہو کر پناہ گزین بن چکے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ عربوں کے لیے یہ جنگ ''سانحۂ عظیم'' تھی۔

نیویارک ٹائمز کے مراسلہ نگار اے میکارمک کے مطابق اسرائیلی انتہائی سرعت رفتاری کے ساتھ علاقے کی آبادکاری کر رہے ہیں۔ اگر اسی رفتار سے یہ آمد جاری رہی یعنی سالانہ دو لاکھ تو وہ دن دور نہیں جب نو وارد لوگ ان پناہ گزینوں کی تعداد سے بڑھ جائیں گے۔

۱۹۷۳ء میں ایک اسرائیلی دانشور اسرائیل شہاک نے ایک معلوماتی تجزیہ کیا تو پتہ چلا کہ ۱۹۴۹ء میں جو ۴۷۵ فلسطینی بستیاں اسرائیل کی خود ساختہ سرحدوں کے جال میں پھنس گئی تھیں۔ ان میں سے صرف نوے اب باقی ہیں۔ بعد ازاں دوسرے جائزوں میں یہ ثابت ہوا کہ یہ تعداد چار سو سے بھی زائد تھی۔

بقول شہاک یہ گاؤں مکمل طور پر اجاڑے جا چکے تھے۔ گھر مسمار، چار دیواریاں منہدم حتی کہ قبریں اور ان کے کتبے تک مٹائے جا چکے تھے۔ یوں سمجھئے کہ کوئی پتھر سلامت نہ چھوڑا گیا۔ اب سیاحوں کو یہ بتایا جاتا ہے کہ یہ سب صحرا اور غیر آباد تھا۔

فریب ''اسرائیلی توسیع پسندی کے خلاف بہترین شہادت اسرائیلی تاریخ میں وہ انخلاء ہیں جو انہوں نے ۱۹۴۸-۱۹۵۶-۱۹۷۳ء اور ۱۹۸۲ء کے مقبوضہ علاقوں سے کیے۔''

(امریکن اسرائیل پبلک افیئرز کمیٹی ۱۹۹۲ء)

حقیقت:

۱۹۴۸ء کی جنگ کے دوران برطانوی سفارت کار سر ہیوڈاؤ نے لکھا ''صاف بات تو یہ ہے کہ یہودی توسیع پسند ہیں'' اسرائیل نے ۱۹۴۸ء کی جنگ میں جو علاقہ ان سرحدوں کے باہمہ قبضہ میں کیا جو اقوام متحدہ نے تقسیم فلسطین پلان میں مقرر کی تھیں۔ اس کا معتد بہ حصہ انہوں نے آج تک خالی نہیں کیا۔ اس پلان کے مطابق یہودی ریاست کا رقبہ صرف ۵۸۹۳ مربع میل یعنی فلسطین کے رقبہ کا ۵۶٫۴۷ فیصد تھا لیکن ۱۹۴۸ء کی جنگ کے خاتمہ پر ۸۰۰۰ مربع میل یعنی ۷۷٫۴ فیصد رقبہ پر اسرائیل کا قبضہ تھا۔ یہ بات بھی اہمیت کی حامل ہے کہ اسرائیل نے اپنے اعلان آزادی میں سرحدوں کا ذکر نہیں کیا تھا اور نہ ہی اس یہودی ریاست نے کبھی اپنی واضح سرحدوں کی اعلانیہ نشان دہی کی ہے۔ اسرائیل نے فلسطین کے اس حصہ پر قبضہ قائم رکھا جہاں ۴۷۵ فلسطینی گاؤں اور شہر آباد تھے اب ان کی

اکثریت ویران ہے یا عنقریب ہو جائے گی۔

اس کے مقابلہ میں جب اقوام متحدہ کا تقسیم پلان ۲۹ر نومبر ۱۹۴۷ء کو منظور ہوا تو صرف ۲۷۹ یہودی بستیاں پورے فلسطین میں تھیں!

بطور وزیر دفاع موشے دایان نے ۱۹۶۹ء میں اسرائیلی طالب علموں کی ایک جماعت کو بتلایا ''اس ملک میں ایک بھی ایسی بستی تعمیر نہیں ہوئی جس میں پہلے عرب نہ بستے ہوں۔'' درحقیقت اسرائیلیوں نے کل ۱۷۹۳۱۶ ہاؤسنگ یونٹوں میں سے ۱۵۸۳۳۲ کو ضبط کر لیا تھا۔ اس میں گھر اور اپارٹمنٹ دونوں شامل ہیں جو جائیداد یہودیوں نے قبضہ میں لی۔ اس میں کم از کم دس ہزار دوکانیں اور ایک ہزار گودام تھے۔ یہودیوں کے ۹۰ فیصد باغات آملہ اور سنگترہ کے ۵۰ فیصد باغات عربوں سے چھینے ہوئے ہیں۔ یہ ضبطی اتنی عظیم اور قیمتی تھی کہ ان باغات کی آمدنی سے ۱۹۴۸ء سے لے کر ۱۹۵۳ء تک اسرائیل کو اس توازن ادائیگی کی مشکلات سے حل میں مدد ملی جو وہاں کے باشندوں کو درپیش تھیں۔ یہ بات دانشور آئن لسلک نے لکھی ہے۔

۱۹۶۷ء کی جنگ کے بعد سارے کا سارا فلسطین، غرب اردن کا علاقہ، غزہ کی پٹی اور شام کی جولان کی پہاڑیاں اور مصر کا جزیرہ نما سینائی یعنی مجموعی طور پر ۲۰۸۷۰ مربع میل کا علاقہ اسرائیلی فوج کے زیر نگیں تھا۔

مارچ ۱۹۷۸ء میں اسرائیل کے لبنان میں ''آپریشن لطانی'' سے اس کی سرحدیں پھر پھیل گئیں اور اس میں اس کا خود ساختہ ''حفاظتی خطہ'' جو جنوبی لبنان میں تھا شامل کر لیا گیا[1]۔

یہ تقریباً تین سے چھ میل چوڑی پٹی ہے جو اسرائیل کی سرحد کے ساتھ ساتھ لبنان کے اندر واقع ہے۔ ۱۹۸۲ء میں لبنان پر حملہ کے بعد اسرائیل نے یہ ''حفاظتی پٹی'' بعض جگہوں پر بڑھا کر بارہ میل تک کر دی تھی۔ بعض اسرائیلی اسے اسرائیل کا مقبوضہ ''شمالی ساحل'' پکارتے ہیں۔ گو اسرائیل نے بعد ازاں مصر کا جزیرہ نما سینائی معاہدہ امن کے بدلے مصر کو واپس کر دیا لیکن بقیہ تمام عرب علاقوں پر اس کا قبضہ تا حال قائم ہے۔ جو اس نے بزور شمشیر چھینے تھے۔ صرف شام کا شہر Quneitra واپس کیا گیا جسے خالی کرنے سے پہلے مسمار کر دیا گیا۔

---

[1] یاد رہے کہ یہ وہی علاقہ ہے جو اسرائیل نے حال ہی میں خالی کر دیا ہے۔ لیکن شام کو جوان کی پہاڑیاں واپس کرنے پر ابھی تیار نہیں... (مترجم)

باب: ۳

فلسطینی پناہ گزین

عرب اسرائیل مناقشے نے دو اہم پناہ گزینوں کے ریلے پیدا کئے۔ پہلے ریلے میں سات لاکھ چھبیس ہزار پناہ گزین تھے جو ۱۹۴۸ء کی جنگ کا نتیجہ تھا۔ یہ تعداد فلسطین کی پوری آبادی یعنی بارہ لاکھ کا دو تہائی تھی۔ دوسرا ریلا ۱۹۶۷ء کی جنگ نے جنم دیا، اس میں دو لاکھ تیس ہزار فلسطینی پناہ گزین بنے جن میں وہ ایک لاکھ تیرہ ہزار بھی شامل تھے جو پہلے ۱۹۴۸ء میں بے گھر ہوئے تھے۔

فریب ''یہ پناہ گزین نہیں ہیں۔ یہ تو وہ جنگجو ہیں جو ہمیں جڑ سے اکھاڑ پھینکنا چاہتے تھے۔''

(ڈیوڈ بن گوریان، اسرائیلی وزیر اعظم ۱۹۴۹ء)

حقیقت:

مختلف آزاد ذرائع سے جو بے حد ثقہ ہیں اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ ان فلسطینی مہاجروں کی بہت بڑی اکثریت بچوں، خواتین اور بوڑھوں پر مشتمل تھی۔

اسرائیل کے مستقبل کے ایک وزیر اعظم ٹیزاق رابن کی زیر کمان اسرائیل فوج نے جب ۱۹۴۸ء کے وسط میں عرب باشندوں کا شہر لیڈا فتح کیا اور مقامی آبادی کو نکال باہر کیا تو اردن کی فوج کے برطانوی کمانڈر گلب پاشا نے یہ رپورٹ بھجوائی تھی۔ ''تین ہزار یا شاید اس سے زائد لوگ جو تقریباً سبھی عورتیں اور بچے تھے۔ اپنا سامان جو کچھ وہ سمیٹ سکتے تھے لے کر کھلے کھیتوں کے راستے اپنی جان بچا کر بھاگ گئے!''

۱۶ ستمبر کو اقوام متحدہ کے مصالحت کار کاؤنٹ فوک برناڈوٹ نے لکھا کہ ''یہودی مقبوضہ علاقہ سے تقریباً ساری ہی عرب آبادی بھاگ گئی یا نکال دی گئی ہے۔ ان میں اکثریت بچوں لڑکے/لڑکیوں، حاملہ عورتوں یا دودھ پلاتی ہوئی ماؤں کی ہے۔ یہ لوگ بالکل تباہ حال ہیں۔''

۱۷ اکتوبر ۱۹۴۸ء کو اسرائیل میں اقوام متحدہ کے نمائندے جیمز جی میکڈونلڈ نے براہ راست

صدر ٹرومین کو یہ خصوصی رپورٹ ارسال کی کہ فلسطینی پناہ گزینوں کا مسئلہ ''تباہ کن صورت اختیار کر رہا ہے۔ اسے ایک آفت کا درجہ دینا ہوگا۔ ان کی بحالی اور آبادکاری کے لیے موجودہ اور پیش نظر ذرائع انتہائی ناکافی ہیں۔

ان تقریباً چار لاکھ پناہ گزینوں میں سے اندازے کے مطابق ایک لاکھ سے زائد آئندہ موسم سرما میں لقمۂ اجل بن جائیں گے۔ سخت بارش اور کھلے آسمان تلے یہ بوڑھے، بچے اور عورتیں بے یار و مددگار اور بغیر کسی خوراک کے پڑے ہیں۔''

فروری ۱۹۴۹ء میں صرف غزہ کی پٹی میں فلسطینی پناہ گزینوں کے مرنے کی روزانہ اوسط ۲۳۰ ہو چکی تھی۔ امریکی ریڈ کراس کے نمائندے ولیم گوور نے لکھا ''اسی سے پچاسی فیصد بے خانماں لوگ بچوں، بوڑھی عورتوں، حاملہ عورتوں اور دودھ پلاتی ماؤں پر مشتمل ہیں۔''

مارچ ۱۹۴۹ء کے وسط تک ایک خفیہ رپورٹ میں لکھا گیا ''دی انٹرنیشنل ایمرجنسی فنڈ ان میں سوا چار لاکھ یعنی تقریباً ۵۸ فیصد پناہ گزینوں کو اپنے پروگرام کے تحت امداد کا مستحق سمجھتا ہے۔ اس گروپ میں شیر خوار طفل، بڑے بچے، حاملہ خواتین، اور دودھ پلاتی مائیں شامل ہیں۔ پناہ گزینوں میں تقریباً ۱۵ فیصد افراد بیمار، بوڑھے اور لاغر ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ صرف ایک لاکھ اسی ہزار یعنی پوری تعداد کا زیادہ سے زیادہ ۲۵ فیصد ہی مرد و زن کام کاج کے اہل ہیں۔''

امریکہ میں اس کا ردعمل سرد مہری تھا۔ امریکی ذرائع ابلاغ نے فلسطینی پناہ گزینوں کی حالت کو عام طور پر نظرانداز کیے رکھا۔ مارچ ۱۹۴۹ء کی خفیہ اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ رپورٹ ظاہر کرتی ہے کہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے عوام ''عام طور سے فلسطینی مہاجرین کے مسئلہ سے بے خبر ہیں۔ کیونکہ اخبارات اور ریڈیو نے اس پر قطعاً کوئی شور و غوغا بلند نہیں کیا۔''

فریب ''جن مصدقہ عرب مہاجرین نے اسرائیلی علاقے سے ہجرت کی وہ تقریباً ۵ لاکھ ۹۰ ہزار تھے۔'' (AIPAC ۱۹۸۹ء)

حقیقت:

AIPAC کا یہ اندازہ کم از کم ڈیڑھ لاکھ کم ہے۔ کئی مختلف ممالک کی کوششوں اور بین الاقوامی تنظیموں کے فلسطینی مہاجرین کی تعداد کا تعین کرتے ہوئے اقوام متحدہ نے ۱۹۴۹ء کے اواخر میں اسے سات لاکھ پچیس ہزار قرار دیا۔ یعنی وہ لوگ جو بارہ لاکھ بے خانماں افراد میں سے اب بھی بے گھر اور

پناہ گزیں تھے۔ یہ سب ۱۹۴۸ء کی جنگ کا شاخسانہ تھا۔ مزید پچیس ہزار کو عملی طور پر بے خانماں شمار کیا گیا تھا لیکن یہ تعداد اس میں شامل نہ تھی۔ اب تک یہی اعداد و شمار اقوام متحدہ کے سرکاری اعداد و شمار تسلیم کئے جاتے ہیں۔ خاص طور پر مشرق وسطیٰ سے باہر کے ممالک میں!

عربوں کا اصرار ہے کہ یہ تعداد دس لاکھ کے قریب ہے جب کہ اسرائیل اسے سرکاری طور پر پانچ لاکھ بیس یا تیس ہزار کے درمیان بیان کرتا ہے لیکن اندرون خانہ دستاویزات کا مطالعہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ اسرائیلی حکام کو بہت پہلے ہی یہ اندازہ ہوگیا تھا کہ یہ اس تعداد سے کہیں بڑھ کر ہیں جو اسرائیل عمومی طور پر بتلا رہا تھا۔ اسرائیلی مؤرخ بینی موریس نے اسرائیل کی سرکاری دستاویزات سے یہ بات ظاہر کی ہے کہ اسرائیلیوں کو شروع ہی سے مہاجرین کی اس زیادہ تعداد سے پورے طور آگاہی تھی۔ ایک دستاویز یہ ظاہر کرتی ہے کہ دفتر خارجہ کا ڈائرکٹر جنرل رافیل عیطان رپورٹ کررہا تھا کہ ''اصل تعداد آٹھ لاکھ کے لگ بھگ تھی۔'' لیکن سرکاری طور پر اسرائیل نے کم اندازہ پر اصرار جاری رکھا کیونکہ بقول ایک دفتر خارجہ اہلکار کے ''یہ مناسب ہوگا کہ اس تعداد کو گھٹا کر ظاہر کیا جائے۔''

۱۹۶۷ء کی جنگ سے مہاجرین کی تعداد میں مزید اضافہ ہوا۔ تین لاکھ تیس ہزار فلسطینی اس دوران بے گھر کئے گئے۔ ان میں ۱۹۴۸ء کی جنگ میں بے گھر ہونے والے سات لاکھ چھبیس ہزار پناہ گزینوں میں شامل ایک لاکھ تیرہ ہزار وہ مہاجرین بھی شامل تھے جو دوسری بار اجاڑے گئے تھے۔ جنگ میں بے خانماں ہونے والے فلسطینیوں کے علاوہ اسرائیلیوں نے ہزارہا دوسرے لوگوں کو بھی اپنے گھروں سے نکال دیا۔ ان میں یروشلم کے مغربی اور یہودی علاقوں سے چار ہزار فلسطینی اور قصبوں عمواس، یاؤ اور بیت تالو کے دس ہزار باشندے شامل تھے جنہیں اپنی املاک بھی ساتھ لے جانے کی اجازت نہ دی گئی۔ اس کے علاوہ غزہ کی پٹی میں جزیرہ نما سینائی سے ملحقہ علاقہ کے چھ ہزار سے لے کر بیس ہزار تک بدو بھی اپنے گھروں سے نکال دیے گئے۔

فریب ''کئی مختلف مواقع پر یہودی لیڈران نے عربوں کے فلسطین میں ہی رہنے اور اسرائیلی شہری بننے پر اصرار کیا۔'' (AIPAC ۱۹۹۲ء)

حقیقت:

اسرائیلی لیڈروں کا مرکزی نقطہ نظر فلسطینیوں سے چھٹکارا حاصل کرنا تھا نہ کہ ان کی ایک یہودی ریاست میں بسنے پر حوصلہ افزائی کرنا۔

اسرائیلی مؤرخ بنی مورس رقم طراز ہے کہ ''بن گوریان کی خواہش صاف ظاہر تھی کہ یہودی ریاست میں عرب کم سے کم ہوں۔ وہ انہیں بھاگتے دیکھنا چاہتا تھا۔ اگست، ستمبر اور اکتوبر ۱۹۴۸ء میں اس نے مختلف اجلاس میں اپنے ساتھیوں اور ماتحت اہلکاروں سے یہی کہا۔''

۱۹۴۹ء میں اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کے ایک مطالعہ میں کہا گیا کہ اپنے بیشتر کئے گئے وعدوں کے برعکس اسرائیلی حکام نے یہ ''واضح اشارہ دیا'' کہ اب وہ ''پناہ گزینوں کی نہایت معمولی تعداد سے زیادہ کو اپنے گھروں کو لوٹنے کی اجازت نہیں دیں گے۔''

اپنی اندر خانے بات چیت میں کئی اسرائیلی اہلکاروں نے برملا کہا کہ وہ اپنی نئی ریاست میں ہرگز غیر یہودیوں کو نہیں دیکھنا چاہتے۔ کنشت کے ایک ممبر علیا ہوکارلی کا کہنا تھا ''میں تو ایک عرب کو واپس لینا چاہتا۔ ایک بھی Goy (غیر یہودی) ہمیں درکار نہیں۔ میں یہودی ریاست کو کلیتاً یہودی دیکھنا چاہتا ہوں۔'' ایک اور کنشت ممبر موشے دایان کے والد شموئیل کا کہنا تھا ''ہم امن کے معاوضہ کے طور پر بھی مہاجرین کی واپسی کے مخالف ہیں۔ بھلا یہ باضابطہ امن ہمیں کیا دے گا؟''

مارچ ۱۹۴۸ء تک اسرائیل کی فوجی کمان نے ''دالت پلان'' پیش کر دیا تھا۔ اس کا مقصد تل ابیب، یروشلم اور گیلیلی کے درمیانی علاقہ پر قبضہ کرنا تھا جو اقوام متحدہ کی تقسیم فلسطین قرارداد کی رو سے آزاد فلسطینی ریاست کا حصہ بنتا۔ مؤرخ مورس کے الفاظ میں ''دالت پلان میں عربوں کے علاقے پر مستقل قبضے کا ذکر تھا۔ یعنی فتح کے بعد عرب دیہاتوں اور شہروں کو مسمار کرنے کا ذکر تھا۔ اس میں یہ درج تھا کہ اگر ان عرب علاقوں میں مسلح مزاحمت کا سامنا ہو تو انہیں نیست و نابود کر کے باشندوں کو ریاست بدر کر دیا جائے۔''

اسرائیلی مؤرخ سمہا فلاپن کا کہنا ہے کہ ''اس پلان میں مقامی عرب آبادی کو سرحدوں سے پار دیکھنے کا تفصیل سے ذکر تھا۔ ماضی کی یاد سے یہ صاف طور پر ثابت ہے کہ اس پلان کا اصل مقصد قبضہ مخالفانہ تھا۔ عربوں کے گاؤں تباہ کئے جانے کے بعد انہیں یہودی گاؤں کے طور پر آباد کرنے کا منصوبہ تھا۔'' بقول فلاپن ''لاکھوں (فلسطینی) خوفزدہ اور مرعوب ہو کر بھاگنے پر مجبور کر دیے گئے۔ بعد ازاں مزید باشندوں کو اسرائیلی فوج نے نکال باہر کیا۔ اس وقت ڈیوڈ بن گویان اس فوج کا سربراہ تھا۔ اسی نے اقوام متحدہ کی تقسیم پلان کے بعد یہ ملک بدری اسکیم بنائی اور اس پر عمل درآمد کیا۔

گیلیلی کی ایک مہم Matateh یعنی ''جھاڑو'' کا نام دیا گیا۔ اس کا یہودی کمان دار یگال ایلن

تو اعلانیہ بالائی گیلیلی کو پاک کرنے کا تہیہ کیے ہوئے تھا۔ بن گوریان نے اپنے ساتھیوں کو یہ یقین دلایا تھا کہ گیلیلی کے اس معرکہ کے بعد وہ علاقہ عربوں سے "پاک" کر دیا جائے گا۔ اس کا کہنا تھا کہ "ایسا علاقہ جس پر عرب بسے ہوں، اس علاقے سے قطعاً مختلف ہوتا ہے جس پر کوئی عرب آباد نہ ہو۔" فلاپن رقم طراز ہے کہ "اس میں کچھ شبہ نہیں کہ بن گوریان کا مقصد اولیٰ یہودی ریاست سے جیسے بھی ممکن ہو عربوں کا اخراج تھا۔"

اسرائیل کے پہلے صدر خائم وائزمین کے بقول فلسطینیوں کا فرار ایک "معجزانہ سادگی" تھی لیکن یہ صاف ظاہر ہے کہ یہ جھوٹ تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ صہیونیت کے بانی تھیوڈور ہرزل کی پیش گوئی کی ایک خوفناک تعبیر تھی۔ حالانکہ اس کے پیش نظر ایک قدرے کم پر تشدد اسکیم تھی "ہم غریب فلسطینی آبادی سرحد پر پہنچانے میں اس طرح مدد کریں گے کہ انہیں ہمسایہ ممالک میں ملازمتیں لے کر دیں گے جب کہ یہاں پر ہم انہیں ہر طرح کی ملازمت سے محروم رکھیں گے۔"

فریب "مختلف فرقوں کے درمیان حالات زندگی کی ہم آہنگی کا مسئلہ خود بخود تحلیل ہو جائے گا۔" (آذر وائزمین اسرائیلی وزیر داخلہ ۱۹۸۱ء)

حقیقت:

یہودی اور فلسطینی آبادیوں کے درمیان عدم توازن کا مسئلہ جسے Demographic Problem کہا گیا ہے صہیونیت کے لیڈروں کے لیے ہمیشہ دردسر رہا ہے۔ صہیونیوں کو شروع سے ہی اندازہ تھا کہ یہودی فلسطینیوں سے براہ راست ٹکراؤ کی سمت جا رہے ہیں جو نہ صرف فلسطین میں اکثریت رکھتے تھے بلکہ ان کی شرح پیدائش بھی یہودیوں سے کہیں زیادہ تھی۔ اس موضوع پر امریکہ میں بہت کم دھیان جاتا ہے۔ لیکن اسرائیل میں اکثریت کس فرقے کی ہوگی؟ یہ ایک نہایت اہم مسئلہ ہے اور وہاں اسے "ڈیموگرافک ٹائم بم" کہہ کر پکارا جاتا ہے۔

۱۹۳۸ء میں ہی یہودی لیڈر ڈیوڈ بن گوریان کا اپنے ساتھیوں سے کہنا تھا کہ عرب مسئلے کے حل کی شروعات "عرب ہمسایہ ممالک سے یہ معاملات طے کرنے سے ہوگی کہ یہودی ریاست سے فلسطینیوں کو پر امن طریقہ سے وہاں منتقل کر دیا جائے۔ ۱۹۴۳ء میں اس نے عربوں کے زیادہ شرح پیدائش کو مدنظر رکھتے ہوئے یہودی والدین پر زور دیا کہ وہ اپنی موجودہ ناکافی شرح پیدائش یعنی فی خاندان ۲ء۲ بچے میں اضافہ کر کے اپنی یہ ذمہ داری پوری کریں۔

اگلے ہی سال ایک اصلاح پسند لیڈر ضیف جیبوٹنسکی کا کہنا تھا ''ہمیں امریکی یہودیوں کو نصف ارب ڈالر جمع کرنے پر آمادہ کرنا چاہیے تاکہ عراق اور سعودی عرب ان فلسطینی عربوں کو اپنے ہاں ضم کر سکیں۔ اس کا اور کوئی حل نہیں ہے۔ عربوں کو 'ارض اسرائیل' میں یہودیوں کے لیے جگہ بنانا ہی پڑے گی۔ اگر بالٹک باشندوں کی نقل مکانی ہو سکتی ہے تو پھر فلسطینی عربوں کو بھی دوسری جگہ منتقل کیا جاسکتا ہے۔''

۱۹۴۷ء میں اقوام متحدہ کی تقسیم پلان کے وقت صیہونیوں کے لیے یہ فرقہ وارانہ غیر ہم آہنگی کا مسئلہ سب سے بڑا دردِ سر تھا کیونکہ فلسطین میں ہر ایک یہودی کے مقابلے میں دو فلسطینی آباد تھے۔ تقسیم کے پلان میں جس یہودی ریاست کو قائم کیا جا رہا تھا اس میں یہودیوں کی نہایت معمولی سی اکثریت تھی۔ یعنی چار لاکھ اٹھانوے ہزار یہودیوں کے مقابلے میں چار لاکھ پینتیس ہزار فلسطینی تھے (مجوزہ فلسطینی ریاست میں سوا سات لاکھ فلسطینی اور دس ہزار یہودی ہوتے)۔

اتنی معمولی اکثریت ہوتے ہوئے یہودیوں کو ڈر تھا کہ وہ اپنی ہی ریاست میں زیادہ دیر تک اکثریت برقرار نہ رکھ سکیں گے۔ لہٰذا بیشتر صیہونیوں کی نگاہ میں فلسطینیوں کو ان کے گھروں سے دربدر کر کے پناہ گزیں بنا کر بھگا دینا ہی اس مسئلے کا حل تھا۔ بن گوریان نے ۱۹۴۸ء کے وسط میں اپنے ایک سرکاری مراسلے میں لکھا کہ ''عربوں کا اکھاڑنا اسرائیل کی ریاست میں عرب مسئلے کے حل کے طور پر دیکھا جانا چاہیے۔'' بن گوریان کو اس حقیقت کا کلی ادراک تھا۔ اس نے حکم جاری کیا ''ہم عربوں کو ان علاقوں میں واپس آنے کی اجازت نہیں دے سکتے جہاں سے وہ نکالے جا چکے ہیں۔''

یہ اسرائیلی پالیسی جلد ہی سرکاری نکتہ نظر میں تبدیل ہو گئی کہ فلسطینی پناہ گزینوں کو واپس نہ آنے دیا جائے اور ایسا ہی ہوا اور کوئی بھی اپنا گھر واگزار نہ کرا سکا۔ ۱۹۴۸ء مئی تک ایک غیر سرکاری ''تبادلہ کمیٹی'' وجود میں آ چکی تھی جس کا خصوصی ہدف یہودیوں کو غیر آباد گھروں اور زمینوں پر آباد کر کے عرب پناہ گزینوں کی واپسی کو غیر ممکن بنا دینا تھا۔ یکم جون تک اسرائیلی افواج کی یونٹوں کو براہِ راست یہ احکامات جاری کر دیے گئے تھے کہ پناہ گزینوں کی واپسی کو بہ جبر روکا جائے۔

۱۹۴۹ء میں جنگ کے خاتمے پر اسرائیلی زیر تسلط علاقے میں ایک لاکھ ستر ہزار فلسطینی باقی رہ گئے تھے۔ بقیہ سب نکالے جا چکے تھے۔ یہ سب لوگ مرد، عورتیں اور بچے اسرائیلی شہری قرار پائے۔ یہ اب کل آبادی کا صرف پندرہ فیصد تھے۔ یعنی اگر پناہ گزیں بنا کر نہ نکالے جاتے تو چالیس فیصد

سے زائد کی اقلیت ہوتے جو کہ ظاہر ہے اب زیادہ قابل برداشت اقلیت تھے!

بن گوریان کو اس نسلی ہم آہنگی کے عدم توازن کا اتنا احساس تھا کہ اس نے ۱۹۴۹ء میں ان اسرائیلی ماؤں کے لیے خصوصی تمغہ دینے کا اعلان کیا جن کے ہاں دسویں بچے کی ولادت ہو۔ دس سال بعد یہ انعام اس لیے منسوخ کر دیا گیا کیونکہ اسرائیلی شہریت رکھنے والی بہت سی فلسطینی (یعنی عرب) مائیں یہ حاصل کر رہی تھیں۔ ۱۹۶۷ء میں ایک اسرائیلی نسلی مرکز قائم کیا گیا کیونکہ ''اسرائیل میں افزائش نسل پر تمام یہودی قوم کے مستقبل کا انحصار تھا۔''

آج بھی یہ مسئلہ اسرائیل میں مرکزی اہمیت کا حامل ہے۔ ۱۹۶۷ء کی جنگ سے لے کر ۱۹۸۷ء میں ''انتفاضہ'' شروع ہونے تک فلسطینی آبادی دوگنی ہو چکی تھی۔ یہ اضافہ بالکل قدرتی طور پر تھا۔ اسرائیل کے اندر فلسطینیوں کی آبادی بڑھ کر اٹھارہ فیصد ہوگئی۔ اسی عرصہ میں یہودیوں کی آبادی ڈیڑھ گنا ہوئی لیکن زیادہ تر انتقال آبادی سے۔ اگر یہ نئے لوگ نہ آتے تو یہودی آبادی میں اضافہ صرف انتیس فیصد ہوتا۔ اندازہ یہ کہتا ہے ۲۰۰۵ء تک اسرائیلی شہریت کے حامل فلسطینیوں کی تعداد تیرہ لاکھ پچاس ہزار ہو جائے گی۔ اب اس میں مقبوضہ غربی کنارہ اور غزہ کے فلسطینیوں کو شامل کر لیں۔ ان کا میزان ۱۹۹۰ء کے اوائل میں بیس لاکھ کے قریب تھا جو ۲۰۰۲ء میں پچیس لاکھ کو جا چھوئے گا۔

فریب ''(فلسطینی مہاجرین) کچھ تو مقامی فوجی کمانڈروں کے براہِ راست احکام سے نکلے اور کچھ حملہ آور عرب ریاستوں کے لیڈروں کی مقامی فلسطینی عربوں میں بدحواسی پھیلانے کے نتیجہ میں۔''

حقیقت:

بہت شروع یعنی ۱۹۶۱ء میں ایک آئرش صحافی ارسکین چلڈرز نے ۱۹۴۸ء میں تمام عرب لیڈروں کی ریڈیو تقاریر کا برطانوی ریکارڈ کھنگالا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ ''۱۹۴۸ء میں فلسطین کے اندر یا باہر کسی بھی عرب ریڈیو اسٹیشن پر کوئی ایک بھی ہدایت، اپیل یا تجویز نشر نہیں ہوئی جس میں فلسطین خالی کرنے کو کہا گیا ہو۔ برخلاف اس کے ایسی کئی عرب نشریات کا ریکارڈ موجود ہے جس میں مقامی فلسطینی آبادی سے کہا گیا تھا کہ وہ اپنے گھروں میں ڈٹے رہیں۔''

چلڈرز سے بھی پیشتر اردن کی افواج کا برطانوی کمانڈر گلب پاشا یہ لکھ چکا تھا کہ ''یہودی ذرائع ابلاغ نے شروع میں دنیا کو یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ فلسطین سے عرب آبادی کا انخلاء

بالکل رضا کارانہ تھا تو یہ قطعاً جھوٹ ہے۔" رضا کارانہ نقل مکانی کرنے والے صرف تن کے لباس میں تو اپنے گھر بار کو نہیں چھوڑتے جو بھی لوگ نقل مکانی کرنا چاہتے ہیں وہ اس طرح تو تتر بتر نہیں ہوتے کہ شوہر کو بیوی کی خبر نہ ہو اور والدین بچوں سے بچھڑ جائیں! سچی بات تو یہ ہے کہ اکثر نے بدحواسی میں چھوڑا۔ یعنی قتل عام کے ڈر سے (کم از کم ان کا خیال بھی یہی تھا) کہیں کہیں قتل عام برپا کر کے ان کی حوصلہ افزائی بھی کی گئی۔ کچھ کو تشدد اور ناروا سلوک نے بھاگنے پر مجبور کیا تب سے بہتیری شہادتیں مل چکی ہیں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اسرائیلی دستوں نے فلسطینیوں کو ان کے گھر بار سے زبردستی اخراج کے لیے نفسیاتی جنگی حربے، دھونس، تشدد اور اقدام قتل تک سے کام لیا۔ یہ دستاویزات زیادہ تر اسرائیلی ذرائع سے حاصل ہوئی ہیں۔

اسرائیلی مؤرخ سمہا فلاپن یہ بحث سمیٹتے ہوئے کہتا ہے: "صہیونی اور اسرائیلی خفیہ ریکارڈ کی ہزاروں دستاویزات جواب شائع ہو چکی ہیں اور بن گوریان کی جنگی ڈائریوں کے مطالعہ سے اسرائیلی دعووں کے ثبوت میں ذرّہ بھر شہادت نہیں ملتی (کہ عرب لیڈروں نے فلسطینیوں کو بھاگ نکلنے پر اکسایا تھا) درحقیقت خفیہ دستاویزات تو "حکم تھیوری" کی نفی کرتی ہیں کیونکہ ان تازہ ذرائع میں تو متعدد ایسی دستاویزات ہیں جو عرب ہائی کمان اور عرب ریاستوں کی ان معتد بہ کوششوں کی نشاندہی کرتی ہیں جو انہوں نے فرار کو رکوانے کے لیے کیں۔"

مزید براں اسرائیلی مؤرخ بنی موری کا بھی یہ کہنا ہے کہ "مجھے تو کوئی ایسی شہادت نظر نہیں آئی کہ عرب ہائی کمان نے کوئی ایسی ہدایات ریڈیو یا اور ذرائع سے جاری کی ہوں جن میں فلسطینی عربوں کو راہ فرار اختیار کرنے پر اکسایا گیا ہو۔"

اس سب کے باوجود یہ جھوٹ آج تک قائم ہے کہ عرب لیڈروں نے یہ فرار کروایا تھا۔ ۱۹۸۰ء کے اواخر میں ایک صحافی کرسٹوفر ہچنز نے جریدہ "نیوری پبلک" میں مندرجہ ذیل اسرائیل نواز اشتہار دیکھا۔

"۱۹۴۸ء میں جس دن اسرائیل کے قیام کا اعلان ہوا تو عرب افواج نے ہر طرف سے اس پر یلغار کر دی۔ انہوں نے دہشت زدہ کر دینے والے ریڈیائی اعلانات میں مقامی عرب آبادی سے انخلاء کی اپیل کی تا کہ حملہ آور افواج بلا خوف وخطر کارروائی کر سکیں" ہچنز نے اس مبصر سے ان "دہشت زدہ کر دینے والے ریڈیائی اعلانات" کا ثبوت طلب کیا لیکن واں ایک خاشی تر ے سب کے جواب میں!

ابھی حال ہی میں یعنی ۲۷ مئی ۱۹۹۱ء کو "امریکن اسرائیل پبلک افیئرز کمیٹی" کے نیوز لیٹر میں یہ دعویٰ کیا گیا کہ "۱۹۴۸ء میں عرب لیڈروں نے بار بار فلسطینیوں کو گھر بار چھوڑنے کی درخواست کی تا کہ نوزائیدہ ریاست اسرائیل کو کچلنے میں عرب افواج کو آسانی ہو" اس وقت تک بینی موریس کی کتاب "فلسطینی مہاجرین کے مسئلے کی ابتداء" کو شائع ہوئے تین برس گزر چکے تھے۔ اس میں ثابت کیا گیا تھا کہ ایسی کوئی شہادت موجود نہیں کہ عرب لیڈروں نے فلسطینیوں کو فرار ہونے کا حکم دیا ہو۔

فریب "کس کو شک ہے کہ عرب حکومتیں پناہ گزینوں کو پناہ گزیں ہی رکھنے پر مصر ہیں۔"

(ابا ایبان، اقوام متحدہ میں اسرائیلی سفیر ۱۹۵۵ء)

حقیقت:

اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے بہت پہلے یعنی ۱۹۴۸ء میں ہی اسرائیل سے مطالبہ کیا کہ وہ مہاجرین کو اپنے گھروں کو واپس آنے دے لیکن اسرائیل نے انکار کیا۔ اسرائیل کا کہنا تھا کہ مہاجرین عرب حکومتوں کی ذمہ داری ہیں جو وہ نبھا نہیں رہے۔

بہرحال اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کی اوائل ۱۹۴۹ء کی ایک خفیہ رپورٹ یہ ظاہر کرتی ہے کہ عرب اقوام مہاجرین کے سیل رواں کے آگے بے بس تھے۔ قاہرہ کے سفارت خانے کی رپورٹ میں درج تھا کہ اگر مہاجرین کو مصر میں دھکیلا گیا تو اس کے نتائج مصر کے لیے اقتصادی طور پر انتہائی تباہ کن ہوں گے۔ اردن کے سفارت خانے نے لکھا کہ مہاجرین اردن کے ذرائع پر ایک ناقابل برداشت بوجھ ہوں گے۔ وہاں ملازمتیں، سرمایہ اور مواقع پہلے ہی معدوم ہیں۔ لبنانی سفارت خانی کے بموجب مہاجرین ایک ناقابل برداشت بوجھ تھے۔ جب کہ شام نے "اس ناقابل برداشت معاشی بوجھ کے آگے عملی طور پر گھٹنے ٹیک دیے تھے۔"

اس مطالعہ میں یہ نتیجہ اخذ کیا گیا تھا کہ ۱۹۴۸ء کے آخری نو مہینوں میں عرب حکومتوں نے گیارہ ملین (ایک کروڑ دس لاکھ) ڈالر بصورت نقد و اجناس خرچہ کیا ہے جو "ان حکومتوں کے ننھے منے بجٹوں" کو دیکھتے ہوئے نہایت خطیر رقم نظر آتی ہے۔ اس کے مقابلے میں اسرائیل نے جو براہِ راست امداد بھیجی وہ صرف سنگتروں کے پانچ سو کریٹ تھے! اسرائیل کے لیے ان مہاجرین کو واپس نہ لینے کی بڑی وجہ یہ تھی کہ ان کے گھر تو پہلے ہی یہودی آباد کاروں کو دیے جا چکے تھے اور کچھ کو نئی یہودی بستیاں بسانے کے لیے منہدم کیا جا چکا تھا۔ ۱۹۴۹ء کی ایک اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ رپورٹ تھی کہ "مہاجرین کی

بہت بڑی اکثریت اپنے گھروں کو لوٹنا چاہتی ہے۔" بہرحال یہ واپسی عملی طور پر ناممکن تھی کیونکہ "اسرائیلی حکام ایک سوچے سمجھے پروگرام کے مطابق حیفہ جیسے شہروں اور دیہاتوں میں عرب آبادیوں کو نیست و نابود کررہے تھے تاکہ یورپ سے نقل مکانی کر کے آنے والے یہودیوں کے لیے (جن کی تعداد تقریباً پچیس ہزار ماہانہ تھی) نئی آبادیاں تعمیر کی جاسکیں۔ چنانچہ ان حالات میں وہ گھر ہی موجود نہیں ہیں جن میں مہاجرین واپس آکر بس سکیں۔ دوسری طرف جن یہودی آبادکاروں نے عربوں کے گھروں پر ناجائز قبضہ کر رکھا ہے وہ یقیناً انہیں خالی کرنے پر رضامند نہ ہوں گے۔ اندریں حالات یہ ایک یقینی امر ہے کہ ان بدقسمت لوگوں کی اکثریت جلد ہی یہ جان لے گی کہ وہ کبھی بھی اپنے گھروں کو واپس نہ آسکیں گے۔"

۱۷ جنوری ۱۹۴۹ء کو "نیویارک ٹائمز" کے نامہ نگار اپنے اوبیر میکارمک کا کہنا تھا کہ اسرائیلی "انتہائی سرعت سے وہ علاقے آباد کر رہے تھے جو عربوں کے خروج سے خالی ہوئے ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ عرب فلسطین اور ہمسایہ ممالک میں پھنسے ہوئے ساڑھے سات لاکھ مہاجرین میں سے شاید ہی کسی کو واپس اسرائیل میں اپنے ٹھکانوں پر آنا ملے۔ ان کی جگہ اب دھڑا دھڑ ان یہودی آبادکاروں سے پر ہو رہی ہے جو پہلی مرتبہ کسی رکاوٹ کے بغیر یہاں آکر آباد ہو رہے ہیں۔ تمام ذرائع رسل و رسائل بھرپور انداز سے استعمال کئے جارہے ہیں۔"

باوجود اس سے کہ اسرائیل نے عرب حکومتوں کو مطعون کرنے کے لیے اپنا بے پناہ پروپیگنڈہ جاری رکھا ہوا ہے۔ اس میں ان کو کس قدر کامیابی حاصل ہوئی ہے؟ یہ ۱۹۶۰ء کے ڈیموکریٹ پارٹی کے اس بیان سے ظاہر ہے کہ "ہم براہ راست عرب اسرائیل مذاکرات کی حمایت کریں گے۔ عرب مہاجرین کی ایسے علاقے میں آبادکاری کی جائے جہاں ان کے لیے جگہ اور مواقع موجود ہوں۔ بائیکاٹ اور مقاطعوں کو ختم کیا جائے اور سوئز کینال ہر کسی کو بلا روک ٹوک استعمال کرنے کی اجازت ہو۔"

امریکہ اسرائیل پبلک افیئرز کمیٹی نے آج تک اس الزام کا پروپیگنڈہ جاری رکھا ہوا ہے کہ عرب حکومتوں نے مہاجرین کو قبول نہیں کیا۔ اپنے جریدہ "حقیقت اور افسانے" کے ۱۹۹۲ء کے شمارہ میں اس نے عرب مہاجرین کا موازنہ ۱۹۵۰ء کے ترک مہاجرین سے کیا ہے جو بلغاریہ سے نکالے گئے تھے۔ ترک حکومت نے مشکلات کے باوجود ڈیڑھ لاکھ ترک مہاجرین کو قبول کیا تھا۔ اس کتابچہ میں کہا گیا تھا کہ "اگر عرب حکومتیں بھی عرب مہاجرین کی مصیبتوں میں کمی کرنا چاہتیں تو وہ بھی ترکی جیسا طرز عمل اختیار کرسکتی تھیں۔"

❄ ❄

باب:۴

۱۹۵۶ء کا سوئیز بحران

۱۹۵۶ء کے سوئیز بحران میں برطانیہ اور فرانس کی حکومتوں نے اسرائیل کے ساتھ ملی بھگت کر کے بین الاقوامی قانون کی خلاف ورزی کرتے ہوئے اس نیت سے مصر پر حملہ کیا تھا کہ وہ اس کے نوجوان سربراہ جمال عبدالناصر کا تختہ الٹ دیں۔ یہ تینوں ممالک گو امریکہ کے دوست تھے لیکن انہوں نے پھر بھی واشنگٹن سے اپنا یہ پلان پوشیدہ رکھا۔ جونہی صدر آئزن ہاور کو ان کے ارادوں کا ادراک ہوا تو اس نے ایسا زبردست سفارتی دباؤ ڈالا کہ نہ صرف ان کو اپنا حملہ روکنا پڑا بلکہ مقبوضہ مصری علاقہ بھی خالی کرنا پڑا۔ یہ فوجی حملہ ۲۹راکتوبر کو شروع ہوا اور ۷رنومبر ۱۹۵۶ء کو ختم ہوا۔

فریب ''یہ اسرائیل نہیں جو مصر کو آہنی شکنجے میں کسنا چاہتا تھا۔''

(اسرائیلی دفتر خارجہ کا بیان ۱۹۵۶ء)

حقیقت:

جزیرہ نما سینائی میں اسرائیلی دستے ۲۹راکتوبر ۱۹۵۶ء کو داخل ہوئے تاکہ مصر پر اس حملے کا آغاز کریں جو انہوں نے برطانیہ اور فرانس کے ساتھ مل کر خفیہ طور پر طے کر رکھا تھا۔ امریکہ کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لیے اسرائیل نے واشنگٹن میں متعینہ اپنے سفیر ابا ایبان کو یہ ہدایت جاری کی کہ وہ امریکہ کو تسلی دلائے کہ فوجوں کی یہ نقل وحرکت ''حفاظتی معاملات'' سے متعلقہ تھی اور اس کا کچھ بھی تعلق اس مناقشہ سے نہ تھا جو دوسری طاقتیں (برطانیہ اور فرانس) مصر سے رکھتی تھیں۔

عین اسی وقت اسرائیلی افواج سینائی پر حملہ آور تھیں! جب صدر آئزن ہاور کو اس چوری چھپے اسرائیلی حملے کا علم ہوا تو اس نے اپنے سکریٹری آف اسٹیٹ جان فوسٹر ڈلس کو کہا ''فوسٹر انہیں بتلا دو... ہم ان کے خلاف پابندیاں عائد کریں گے۔ ہم اقوام متحدہ میں معاملہ اٹھائیں گے۔ ہم ہر وہ قدم اٹھائیں گے جس سے یہ حملہ رک سکے۔'' بعد ازاں آئزن ہاور کا کہنا تھا ''ہم نے اسرائیلیوں کو واضح

طور پر بتلا دیا تھا کہ یہ بات نا قابل دفاع ہے۔ اگر وہ یہ چاہتے ہیں کہ ہم مشرق وسطیٰ میں ان کی پوزیشن کی حمایت کریں تو انہیں اپنے رویہ کی اصلاح کرنی ہوگی... ہم نے فوراً ہی اس پر کام کرنا شروع کر دیا اور ان کا ناک میں دم کرنے لگے۔"

سوئیز کا مسئلہ عین اس دوران ابھرا جب آئیزن ہاور اپنی دوسری ٹرم کے لیے انتخابی مہم کو سمیٹ رہا تھا، جس رات اسرائیلی حملہ شروع ہوا ری پبلکن پارٹی کے ممتاز اراکین نے صدر سے ملاقات کی۔ انہیں ڈر تھا کہ کہیں صدر آئیزن ہاور امریکی افواج کو یہ حکم جاری نہ کر دے کہ وہ اسرائیلی دستوں کو نکال باہر کریں کیونکہ انہوں نے "ایسی جارحیت کا ارتکاب کیا تھا جو نا قابل معافی تھی۔" ان کے خیال میں اس اقدام کا امریکہ کے اندر اسرائیلی حمایت کاروں پر ردِ عمل اس قدر شدید ہوتا کہ آئیزن ہاور کی انتخابی شکست ممکن تھی۔ لیکن آئیزن ہاور کا کہنا تھا "میرے خیال میں تو آپ کے جذبات آپ کے فہم کو دھندلا رہے ہیں۔"

اگلے ہی روز آئیزن ہاور نے سلامتی کونسل میں یہ قرار داد پیش کر دی کہ جنگ بندی کی جائے اور اسرائیلی دستے واپس انخلاء عمل میں لائیں۔ فرانس، برطانیہ اور اسرائیل پر دباؤ ڈال کر مصر پر حملہ رکوا دیا گیا اور انتخاب بھی آسانی سے جیت لیا۔

فریب "اسرائیل اور مصر کے درمیان جنگ بندی لائنیں اب کوئی جواز نہیں رکھتیں۔"

(ڈیوڈ بن گوریان، اسرائیلی وزیر اعظم ۱۹۵۶ء)

حقیقت:

اسرائیلی افواج نے بغیر کسی مزاحمت کے سارے جزیرہ نما سینائی پر قبضہ کر کے نہر سوئیز اور جنوب میں شرم الشیخ تک رسائی حاصل کر لی تھی۔ مصر برطانوی اور فرانسیسی مشترکہ حملے کے دفاع میں الجھا ہوا تھا۔ یہ سب کچھ ہفتہ بھر میں ہو گیا۔ اسرائیلی لیڈر ڈیوڈ بن گوریان نے ۷ر نومبر کو اعلان کیا کہ "مصر کے ساتھ ۱۹۴۹ء والا جنگ بندی کا معاہدہ اب دفن ہو چکا ہے۔ اسے دوبارہ زندگی نہیں مل سکتی۔ ۱۹۴۹ء کے اس سمجھوتے سے انکار نے آئیزن ہاور پر یہ واضح کر دیا کہ اسرائیل نے جو علاقہ مصر سے بزور چھینا ہے وہ اس پر مستقل قبضہ چاہتا ہے۔ آئیزن ہاور نے فوراً بن گوریان کو ایک ذاتی خط لکھا کہ "ایسا کوئی بھی فیصلہ یعنی سینائی پر قبضہ ہوا تو اسرائیل کو اقوام متحدہ کے احکامات اور اصولوں کی خلاف ورزی کا مرتکب قرار دے کر سخت مذمت کا سامنا ہوگا۔" آئیزن ہاور کے اس پیغام میں

حقیقت کا رنگ بھرنے کے لیے انڈر سکریٹری آف اسٹیٹ ہربرٹ ہاور جونیئر نے واشنگٹن میں اسرائیلی نمائندے کو بلا کر یہ انتباہ دیا کہ امریکہ اسرائیل کے خلاف نہایت سخت قدم اٹھانے میں سنجیدہ ہے جس میں ''تمام سرکاری اور نجی امداد کا خاتمہ، اقوام متحدہ کی پابندیاں حتیٰ کہ اقوام متحدہ سے اخراج جیسی باتیں شامل ہیں۔'' اس نے اسرائیلی نمائندے کو بتلایا کہ وہ یہ تمام باتیں انتہائی سنجیدگی اور ثقہ پن سے کہہ رہا تھا۔

اسی روز یعنی ۷رنومبر کو ہی اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے ۶۵ بمقابلہ ایک کی رائے شماری سے یہ مطالبہ منظور کیا کہ تمام غیر ملکی افواج جزیرہ نما سینائی خالی کر دیں۔ مخالفت میں یہ اکیلا ووٹ اسرائیل کا تھا۔ لیکن فروری ۱۹۵۷ء میں جنرل اسمبلی نے ایک اور قرارداد منظور کر کے اس بات پر افسوس کا اظہار کیا کہ اسرائیل نے ابھی تک انخلاء منظور نہیں کیا تھا۔ اسرائیل پھر بھی دستے ہٹانے سے انکار کرتا رہا!

آئیزن ہاور کے صبر کا پیمانہ ۱۱رفروری کو چھلکنے کے قریب تھا۔ اس نے بن گوریان کو ایک اور پیغام بھجوایا کہ وہ غزہ سے اسرائیلی دستے ''فوراً اور بلا شرط'' ہٹا لے۔ بن گوریان نے دوبارہ انکار کر دیا۔

۲۰رفروری تک آئیزن ہاور کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ اس نے ایک درشت نوٹ بن گوریان کو بھیجا کہ امریکہ نہ صرف اقوام متحدہ کی عائد پابندیوں کی حمایت کرے گا بلکہ سرکاری امداد کے علاوہ ذاتی چندوں کی ترسیل پر بھی پابندی عائد کر دے گا۔ اسی شب اس نے ٹی وی پر خطاب کر کے اسرائیل کے خلاف اپنا نکتہ نظر پیش کیا ''میرے خیال میں امن کے لیے اقوام متحدہ کے پاس اور کوئی چارہ کار نہیں کہ وہ اسرائیل پر انخلاء کے بارے میں قرارداد پر عمل کرنے کے لیے دباؤ ڈالے۔''

بن گوریان کا کہنا تھا کہ آئیزن ہاور کے مطالبات انصاف کے خلاف تھے لیکن ان سب دھمکیوں کے زیر اثر اسرائیلی دستے واپس بلا لیے گئے اور یوں سوئز کا بحران ختم ہوا۔ امریکہ نے اسرائیل سے زبردستی وہ علاقہ واپس کروا ہی لیا جو انہوں نے فتح کر لیا تھا۔

فریب ''۱۹۵۶ء کے سوئز بحران میں امریکن کارکردگی قابلِ افسوس تھی۔''

(ہنری کسنجر، سکریٹری آف اسٹیٹ ۱۹۷۹ء)

حقیقت:

اسرائیل اور اس کے طرفداروں کی نکتہ چینی کے باوصف آئیزن ہاور اور ریاست ہائے متحدہ سوئیز بحران سے سرخرو ہو کر نکلے اور ساری دنیا میں ان کا وقار بڑھا۔ آئیزن ہاور کے مسلمہ سوانح نگار اسٹیفن ای ایمبروز کا کہنا ہے کہ ''آئیزن ہاور کا اقوام متحدہ کی برتری پر اصرار، معاہدات کی پاسداری اور تمام اقوام عالم کے حقوق پر زور دینے سے دنیا بھر میں امریکہ کا وقار اس قدر بلند ہوا کہ پہلے کبھی نہ تھا۔ اقوام متحدہ میں (جنگ بندی) امریکی قرارداد کا پیش ہونا یقیناً ایک تاریخ ساز لمحہ تھا۔'' اقوام متحدہ میں فوراً ہی ظاہر ہو گیا کہ امریکہ کے وقار میں کس قدر اضافہ ہوا ہے۔ امریکی سفیر برائے اقوام متحدہ ہنری کیبٹ لاج نے صدر کو فون پر مطلع کیا کہ:

''صدر کی پالیسی پر اس سے پیشتر کبھی اتنا شاندار خراج تحسین پیش نہیں کیا گیا۔ انتہائی شاندار۔'' قاہرہ سے سفیر ریمنڈ ہیئر نے تار بھجوائی کہ ''امریکہ دفعتاً سچ کا چمپئین بن کر ابھرا ہے۔ چالیس برس گزر جانے کے بعد بھی مؤرخین آئیزن ہاور کے اس بحران سے نپٹنے کو اس کے زمانہ صدارت کا شاہکار تسلیم کرتے ہیں۔ اس سے اقوام متحدہ کے اخلاقی پہلو اور اقتدار کے ساتھ ساتھ امریکہ کے نصب العین کو بھی تقویت پہنچی!



باب:۵

۱۹۶۷ء کی جنگ

۱۹۶۷ء کی جنگ عرب/اسرائیل مناقشے کا تیسرا دور تھا۔ یہ اسرائیل کے حق میں بے حد مفید رہا۔ اسرائیل نے اپنے تمام جنگی مقاصد حاصل کر لیے۔ ان میں سے اہم ترین مصر کے جزیرہ نما سینائی، عرب مشرقی یروشلم اور شام کی جولان پہاڑیوں سمیت سارے فلسطین پر قبضہ کرنا تھا۔ ۱۹۵۶ء کے سوئیز بحران کے برعکس... اس مرتبہ اسرائیلی حکام نے امریکی حکام کی پیشگی مفاہمت حاصل کرنے کی شعوری کوشش کی۔ یہی وجہ تھی کہ مفتوحہ علاقوں کے انخلاء پر انہیں کسی امریکی دباؤ کا سامنا نہ ہوا۔ یہ حملہ ۵رجون کو شروع ہو کر ۱۰رجون کو ختم ہوا۔

> **فریب** ''اس میں رتی بھر شک کی گنجائش نہیں کہ... عرب حکومتوں نے... باقاعدہ تیاری کے بعد حملہ کیا تاکہ اسرائیل کو فوراً صفحۂ ہستی سے نیست و نابود کر دیا جائے!''
>
> (ابا ایبان، اقوام متحدہ میں اسرائیلی سفیر ۱۹۶۷ء)

حقیقت:

۱۹۵۶ء کی طرح ۱۹۶۷ء کی جنگ بھی اسرائیل نے مصر پر اچانک حملے سے شروع کی۔ ۱۹۵۶ء کی طرح اسرائیلیوں نے دوبارہ امریکہ کو دھوکہ دیا۔ اسرائیلی وزیر خارجہ ابا ایبان نے ذاتی طور پر اسرائیل میں امریکی سفیر وال ورتھ باربور کو یقین دلایا کہ حملے کی ابتداء مصر نے کی تھی لیکن بعد از جنگ اسرائیل کے لیڈروں نے اپنے امریکی طرف داروں کے رویہ کے برخلاف کھلے عام یہ اعتراف کیا کہ حملہ اسرائیل نے کیا تھا اور یہ بھی مانا کہ اسرائیل کو فوری خطرہ درپیش نہ تھا۔

۱۹۸۲ء میں اسرائیلی وزیر اعظم ماناخم بیگن نے کہا کہ ۱۹۶۷ء کی جنگ اس لحاظ سے چنیدہ تھی کہ ''ہم نے اس (یعنی جمال عبدالناصر) پر حملہ کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔''

۱۹۷۲ء میں آذر وائیز مین جسے اسرائیلی ایئر فورس کا باپ کہا جاتا ہے اور جو بعد ازاں وزیر

دفاع مقرر ہوا، کا کہنا تھا کہ انہیں عربوں سے ''تباہی کا خطرہ'' ہرگز نہ تھا۔

فوج کے اوراعلیٰ افسر میطیط یا ہو پلید کا— جو بعد میں امن پسند بن گیا— کہنا تھا کہ ''یہ دعویٰ کرنا کہ جو مصری افواج ہماری سرحدوں پر جمع تھیں۔ وہ ہماری سلامتی کے لیے خطرہ تھیں۔ نہ صرف زاحل (اسرائیلی فوج) کی بے عزتی ہے بلکہ ایسے حالات کے کسی بھی تجزیہ نگار کی سمجھ بوجھ کا مذاق اڑانے کے مترادف ہے۔'' اور ۱۹۶۸ء میں چیف آف اسٹاف یٹزاق رابن کا کہنا تھا کہ ''میرا خیال نہیں کہ ناصر جنگ کا خواہاں تھا۔ ۱۴ مئی کو جو دو ڈویژن فوج اس نے سینائی بھجوائی تھی۔ وہ اس قابل نہ تھی کہ اسرائیل پر جارحانہ حملہ کرسکتی۔ یہ اسے بھی معلوم تھا اور ہمیں بھی!''

ڈیوڈ بن گوریان کا کہنا تھا ''مجھے اس میں قوی شک ہے کہ ناصر جنگ چاہتا تھا۔'' علاوہ ازیں اس جنگ سے کچھ ہی پیشتر امریکہ کی تمام خفیہ ایجنسیاں اس نتیجہ پر پہنچی تھیں کہ اسرائیل کو کوئی فوری خطرہ درپیش نہیں اور اگر حملہ ہوا تو اسرائیل کسی بھی عرب ملک یا ان کے کسی بھی اتحاد کو شکست دینے کی اہلیت رکھتا ہے۔

۱۹۷۲ء میں اسرائیلی کابینہ کے ایک وزیر مورڈیکائی بینطوف نے یہ انکشاف کیا کہ ''اسرائیل کے نیست و نابود ہوجانے کی ساری کہانی خودساز تھی اور بعد میں اسے اور بڑھا چڑھا کر پیش کیا گیا تا کہ عرب علاقوں کو ہڑپ کرنے کا جواز بن سکے۔''

فریب ''حکومت اسرائیل کا ہرگز ہرگز کوئی ارادہ نہیں کہ وہ اپنی سرحدوں کی توسیع کے لیے موجودہ حالات سے کوئی فائدہ اٹھائے۔'' (وال ورتھ باربور، امریکہ میں اسرائیلی سفیر ۱۹۶۷ء)

حقیقت:

جنگ شروع ہونے کے دو دن کے اندر اسرائیل نے یروشلم کے قدیم شہر کو اردن سے چھین لیا۔ اسرائیلی لیڈروں نے فوراً ہی یہ اعلان کردیا کہ وہ یہ شہر کبھی واپس نہ کریں گے۔ اسرائیلی فوج کا چیف اشک نازی ربی (یہودیوں کی ایک شاخ) نصف گھنٹہ بعد دیوارِ گریہ پر پہنچ گیا اور اعلان کیا کہ ''میں جنرل شلوموگوران اسرائیلی دفاعی افواج کا چیف ربی یہاں اس لیے آیا ہوں کہ اب دوبارہ کبھی واپس نہ جانا ہوگا۔'' وزیر دفاع موشے دایان بھی پہنچا اور کہا ''ہم نے اسرائیل کے منقسم دارالحکومت کو یکجا کردیا ہے۔ ہم اپنے مقدس ترین مقام پر آگئے ہیں اور دوبارہ کبھی اس سے جدا نہ ہوں گے۔''

جب چھ دن بعد جنگ ختم ہوئی تو اسرائیلی دستے مصر کے جزیرہ نما سینائی کے علاوہ غزہ کی پٹی

مغربی کنارے اور شام کے سلسلہ ہائے کوہ جولان پر قبضہ کر چکے تھے۔ جب کہ ۱۹۴۷ء کی اقوام متحدہ کی تقسیم فلسطین پلان کے ماتحت اسے صرف پانچ ہزار نو سو مربع میل رقبہ تفویض کیا گیا تھا۔

اپنے ابتدائی وعدوں کے برخلاف اسرائیل نے فوراً ہی فلسطینیوں کو بے دخل کرنے اور یہودی بستیاں بسانے کا کام مقبوضہ علاقوں میں شروع کر دیا۔ اس عمل میں مشرقی یروشلم بھی شامل تھا۔ پہلے اسرائیل نے کہا تھا کہ وہ مزید علاقہ نہیں چاہتے۔

فریب ''یاد رہے کہ ہم باتوں، خیالات اور اعمال میں بالکل غیر جانبدار ہیں۔''

(یوجین روسٹو، انڈر سکریٹری آف اسٹیٹ ۱۹۶۷ء)

حقیقت:

یوجین کے اس بیان کا دوسرے امریکی حکام نے خندہ استہزاء سے استقبال کیا کیونکہ ۱۹۶۷ء کی جنگ میں امریکہ لحہ بھر کے لیے بھی غیر جانب دار نہ تھا۔ جانسن انتظامیہ اسرائیل کی بھرپور طرف داری کر رہی تھی۔ لہٰذا جب اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کے نمائندے رابرٹ میکلوسکی نے روز اوّل یہ بیان ذرائع ابلاغ کے نمائندوں کو پڑھ کر سنایا تو کسی نے بھی یوجین پر یقین نہ کیا۔ یہ ایک ایسا حیران کن بیان تھا کہ اگر اس کو سنجیدگی سے لیا جاتا تو یہ بہت بڑی خبر تھی اور ایسوشی ایڈ پریس نے ایسا ہی کیا اور تاریں کھڑکا دیں۔

امریکہ میں اسرائیل کے حمایتیوں نے یوجین روسٹو کے اس بیان پر ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ صدر کے تقریر نگار جان روشے کو اس قدر غصہ آیا کہ اس نے صدر کو براہ راست احتجاجی نوٹ بھیج دیا۔

''مجھے یہ جان کر گھن آئی کہ یہاں عربوں کے تلوے چاٹنے جیسے احساسات رکھنے والے بھی زیر زمین موجود ہیں۔ عربوں سے اس طرح میٹھی باتیں کرنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ ہمارے لیے نفرت کا اظہار کریں گے اور ہمیں امریکہ میں یہودیوں کی حمایت سے محروم ہونا ہوگا۔''

جانسن انتظامیہ میں اسرائیلی طرف داروں کی حمایت جنگ کے شروع دنوں میں ہی تمام حدود پھلانگ گئی۔ پہلے ہی دن کے حملے کے خلاصے میں یوجین کے بھائی والٹر روسٹو نے جو نیشنل سیکیورٹی مشیر تھا، زبان درازی کرتے ہوئے اس رپورٹ کے سرپوش پر یہ حاشیہ چڑھایا ''یہ رہا دن کے شکار کا حساب بمع نقشے کے۔''

اصل حقیقت یہ تھی کہ صدر جانسن کے دور میں اسرائیل اور امریکہ کے روابط اتنے گہرے اور

قریبی تھے کہ اکثر اوقات عربوں کا نقصان کرتے ہوئے اسرائیل کے حق میں پالیسی تشکیل پاتی تھی۔ صدر کے خصوصی صدارتی مشیر میک جارج بنڈی نے ایک دستاویز (سرکاری یادداشت) دوران جنگ صدر کو بھجوائی جس میں دونوں ممالک کے درمیان انہی قریبی روابط پر روشنی ڈالی گئی تھی۔ اس نے صدر کو مشورہ دیا کہ وہ بذریعہ تقریر یہ کہے کہ ''ایک مضبوط اسرائیل اور پائیدار مشرق وسطیٰ کا قیام اس علاقے کی اقوام کی ہی ذمہ داری بنتا ہے۔ یہ ہر لحاظ سے ایک اچھا اسرائیلی اور ایل بی جے (جانسن) اصول ہے۔ اسی لیے اس کو عوام کے سامنے لانا چاہیے۔''

ان دونوں ممالک کے اس قدر قریبی تعلق نے ان شکوک وشبہات کو جنم دیا ہے کہ صدر جانسن کے اہلکاروں نے اسرائیل کو حملے کے لیے سبز جھنڈی دکھلا دی ہوگی۔ اغلباً اس کی بنیاد وہ مشترکہ خواہش ہوگی کہ جمال عبدالناصر کو مصر کے اقتدار سے محروم کر دیا جائے۔ لیکن اس وقت ناصر کو واشنگٹن میں کوئی زیادہ اہمیت حاصل نہ تھی۔ گو وہ باعث ناراضگی ضرور تھا۔ ان دنوں ویت نام کی جنگ کا پھیلاؤ سب کی توجہ مرکوز کیے ہوئے تھا۔ مزید براں اس گٹھ جوڑ کا کوئی ناقابل تردید ثبوت بھی منظر پر نہیں آیا۔

بہرحال اس میں کچھ بھی شک نہیں کہ اگر صدر جانسن نے باقاعدہ گٹھ جوڑ کر کے حملہ کرنے کے لیے اسرائیل کی پیٹھ نہیں ٹھونکی تو کم از کم اس کے جنگ شروع کرنے کے فیصلے کی بالواسطہ منظوری ضرور دی۔

صدر جمی کارٹر کی نیشنل سیکیورٹی کونسل کے ایک سابقہ رکن اور مشرق وسطیٰ کے ماہر ولیم کوئنٹ نے ۱۹۹۲ء میں ایک مطالعہ کیا جو ۱۹۶۷ء کے بعد گزرنے والے پچیس سالہ دستاویزات پر مشتمل تھا۔

''اب جب کہ یہ تمام اطلاعات میسر ہیں تو سبز بتی یا سرخ بتی کے مباحثہ کا فیصلہ ممکن ہے۔ یہ دونوں نکتہ ہائے نظر ہی کئی اہم لحاظ سے درست نہیں ہیں۔''

کوئنٹ نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ مئی کے دوران صدر جانسن نے اسرائیل کو جنگ سے باز رکھے... یعنی سرخ بتی دکھلائی لیکن اسے جلد ہی یہ احساس ہوگیا کہ ماسوا طاقت کے استعمال کے امریکہ ایک بپھرے ہوئے اسرائیل کو اپنی پالیسی پر عمل کرنے سے باز رکھنے کے سلسلے میں بالکل بے بس تھا۔ اس دوران انتظامیہ نے اسرائیل کو پیلی بتی دکھلائی۔ گویا کوئنٹ کے الفاظ میں ''صدر نے اسرائیل کے پیش بندی حملے کے فیصلے کو نیم دلی سے قبول کرلیا۔ مختصر یہ کہ شروع کے حساس دنوں میں جب اسرائیل نے

جنگ کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا واشنگٹن نے سرخ بتی دکھلا کر پھر اس کو پیلی بتی میں تبدیل کر دیا۔ سبز بتی تو کبھی بھی نہ دکھلائی۔ لیکن اس پیلی بتی کا دکھلا دینا ہی اسرائیل کے یہ سمجھنے کے لیے کافی تھا کہ اسے واشنگٹن کے کسی ردِعمل کی پرواہ کیے بغیر اپنا کام کرلینا چاہیے۔''

دوران جنگ امریکہ اسرائیل کا تعاون کس قدر رہا اس کی ایک نمایاں مثال اقوام متحدہ میں دکھلائی دی۔ غدرون رافیل اقوام متحدہ میں اسرائیلی سفیر کہتا ہے کہ امریکہ کا سفیر برائے اقوام متحدہ آرتھر گولڈ برگ اسرائیل اور اس کے فوجی توازن کے بارے میں سخت متوحش تھا۔ بقول غدرون اس نے (رافیل) نے خود فون کر کے پوچھا ''غدرون! میں تمہارے لیے کیا کرسکتا ہوں؟'' رافیل کا کہنا تھا کہ اسرائیل کو صرف وقت درکار ہے تاکہ وہ پہلے دنوں میں جب اسرائیلی افواج ڈرامائی طور پر شاندار کامیابیاں حاصل کر رہی تھی، سیکورٹی کونسل کے جنگ بندی قرارداد منظور کرنے سے بچ سکے۔ یہ مقصد حاصل کرنے کے لیے وہ چاہتا تھا کہ گولڈ برگ اپنے سوویٹ ہم منصب نکولائی فیڈرنکو سے ملاقات کرنے سے احتراز کرے۔ غدرون نے گولڈ برگ سے کہا کہ تم اگلے چند روز تک اتنے مصروف رہو کہ کسی سے بھی ملاقات نہ کرسکو اور گولڈ برگ نے ایسا ہی کیا۔

فریب ''جنگی ڈائریوں کے موازنے اور دوسری ناقابل تردید شہادتوں سے یہ بات صاف طور پر اور شک وشبہ سے ماوراء ہوجاتی ہے کہ یو۔ ایس۔ لبرٹی پر حملہ بری نیت سے نہیں تھا۔ یہ قطعاً مجرمانہ غفلت نہ تھی بلکہ یہ حملہ ایک معصومانہ غلطی تھی۔''

(اسرائیل کا سرکاری بیان ۱۹۶۷ء)

حقیقت:

۸ر جون کو روز روشن میں جب قرب و جوار میں کوئی بھی جنگی کارروائی نہیں ہو رہی تھی اسرائیلی جنگی جہازوں اور آبدوزوں نے امریکی سراغ رسانی کرنے والے بحری جہاز یو۔ ایس۔ لبرٹی پر متعدد حملے کیے۔ یہ جہاز سینائی کے ساحل سے پرے تھا۔ ان حملوں میں عملے کے چونتیس افراد ہلاک ہوئے اور ۱۷۱ زخمی۔ اس حملے میں آگ لگانے والے بم، راکٹ، مشین گن اور تارپیڈو استعمال کیے گئے۔ اس سے پیشتر ساڑھے پانچ گھنٹے تک اسرائیلی ہوائی جہازوں نے اس پر دیکھ بھال والی پروازیں کیں۔ اس دوران جہاز پر نیا جھنڈا نصب تھا جو نسیم بحری میں لہرا رہا تھا۔

گو اسرائیل نے ان تمام برسوں میں یہ اصرار جاری رکھا کہ یہ حملہ ایک حادثہ اور پہچان کی غلطی

کا شاخسانہ تھا لیکن اس بات کے وافر شواہد موجود ہیں جو اس بات کی طرف زوردار اشارہ کرتے ہیں کہ اسرائیل نے اس سراغ رسانی والے جہاز پر جان بوجھ کر حملہ کیا۔ بظاہر اسرائیل کو یہ خوف تھا کہ یہ جہاز (لبرٹی) ان اسرائیلی تیاریوں کا مشاہدہ ریکارڈ کرلے گا جو وہ اگلے روز جولان کی پہاڑیوں پر حملہ کر کے قبضہ کرنے کے لیے کر رہے تھے۔ جانسن انتظامیہ نے اسرائیل کا پہچان کی غلطی والا موقف فوراً ہی تسلیم کرلیا۔ سالہا سال بعد بھی جانسن اس واقعہ کے بارے میں حقیقت بیان کرنے سے گریزاں تھا۔ اس نے اپنی سوانح عمری میں صرف دس افراد کی موت درج کی۔ یہ جانسن/اسرائیل خفیہ گٹھ جوڑ کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

۱۹۹۱ء تک اس حملے کے بچ نکلنے والے متاثرین حکومت امریکہ پر یہ الزام دھرتے رہے کہ وہ اب تک اسرائیل کی پردہ داری کررہی ہے۔ اس دن حملے کے دوران جہاز کے برج پر تعینات لیفٹیننٹ جیمز اینیز کا کہنا ہے کہ ''اس کہانی پر سرکاری ڈھکنا آج بھی اتنی ہی شدت سے کسا ہوا ہے جتنا کہ پہلے روز تھا۔'' یہ سب اس بات کے باوصف ہورہا تھا کہ سابقہ سکریٹری آف اسٹیٹ ڈین رسک اور سابقہ چیئرمین جوائنٹ چیف آف اسٹاف جیسے اعلیٰ امریکی حکام تحریری طور پر یہ کہہ چکے ہیں کہ اسرائیل نے لبرٹی پر حملہ جان بوجھ کر کیا تھا۔

رسک کے الفاظ کی یادداشتوں والی سوانح میں یہ درج ہے ''مجھے اسرائیلی وضاحتیں کبھی بھی تسلی بخش نہ لگیں... مجھے اس وقت بھی ان پر یقین نہ تھا اور آج بھی نہیں ہے!... یہ حملہ انتہائی وحشیانہ اور شرمناک تھا۔''

اینیز نے بحث سمیٹتے ہوئے کہا ''اتنے اہم اور کلیدی عہدیداروں کے زوردار بیانات کے باوجود ایک بھی فرد نے اپنی حکومتی ملازمت کے دوران یہ کوشش نہ کی کہ ریکارڈ کو درست کردے۔''

۸رجون ۱۹۹۱ء تک انتظار کرنے کے بعد اس سانحہ میں بچ جانے والوں کو آخرکار وہ تعریفی اسناد حوالے کی گئیں جو ۱۹۶۷ء میں صدر جانسن نے دستخط تو کردی تھی لیکن تقسیم نہ کی گئیں۔ اس کے بعد ٦رنومبر ۱۹۹۱ء کو دو کالم نگاروں رولینڈ ایونز اور رابرٹ نوواک نے آخرکار یہ دریافت کر ہی لیا! ایک غیرملکی امریکی سفارت خانے نے ایک اسرائیل ہوا باز کی یہ ریڈیائی گفتگو ریکارڈ کی تھی جو کہہ رہا تھا ''یہ ایک امریکی جہاز ہے''... اسرائیلی کمان نے اس رپورٹ کو نظرانداز کر کے ہوا باز کو حملہ جاری رکھنے کا حکم دیا۔ ایونز اور نوواک نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ اسرائیلی حملہ اس لیے تھا کہ لبرٹی نے وہ تمام گفتگو

ریکارڈ کرلی تھی جو اسرائیلی دفاعی افواج کے ہیڈکوارٹرز اور ان اسرائیلی دستوں کے مابین ہوئی تھی جو شام پر حملے کی تیاریوں میں مشغول تھے۔"

اسرائیل کا جولان کی پہاڑیوں پر حملہ "لبرٹی" کو خاموش کردینے کے اگلے دن وقوع پذیر ہوا۔ یہ رپورٹ لبنان میں امریکی سفیر ڈوائٹ پورٹر کی تصدیق شدہ ہے جو ان دنوں وہاں تعینات تھا۔ چنانچہ اب ۲۴ برس کے بعد حقیقت آخر کار ظاہر ہوکر رہی!



باب:۶

یو۔این۔قرارداد نمبر ۲۴۲

۲۲ر نومبر ۱۹۶۷ء کو یو۔ این۔ سیکیورٹی کونسل کا قرارداد نمبر ۲۴۲ کو منظور کر لینا عرب اسرائیل مناقشے میں ایک عظیم سفارتی پیش رفت تھی۔ اس میں اس بات کو واضح کیا گیا تھا کہ "جنگ کے ذریعے علاقہ حاصل کرنا ایک قابل قبول عمل ہرگز نہیں" اور اس میں وہ فارمولا درج تھا جو آج تک تمام امن کوششوں کے آغاز کار کا بنیادی عنصر رہا ہے...! یعنی "زمین برائے امن!"... عرب ریاستوں نے اسرائیل کو اس بات کے بدلے امن کی پیش کش کی تھی کہ وہ ان تمام علاقوں کو واپس کر دے جو اس نے مصر، اردن اور شام سے ۱۹۶۷ء کی جنگ کے دوران چھینے تھے۔ یہ قرارداد وہ بنیاد فراہم کرتی ہے جس پر اسرایل اور عربوں کے مابین اسپین کے دارالحکومت میڈرڈ میں امن مذاکرات شروع ہوئے جو ۱۹۹۱ء میں بھی جاری ہیں۔

فریب "یہ بین الاقوامی دستاویز (اردن کے ساتھ اسرائیل کا ۱۹۴۹ء کا جنگ بندی معاہدہ) اور نہ ہی قرارداد نمبر ۲۴۲ اس بارے میں رکاوٹ ہیں کہ یہودیوں کا بنیادی دعویٰ یہ ہے کہ ارض اسرائیل پر یہودیوں کا حق ہے۔" (مناخم بیگن، اسرائیلی وزیر اعظم ۱۹۷۷ء)

حقیقت:

جب مناخم بیگن ۱۹۷۷ء میں برسر اقتدار آیا تو اسرائیل اور امریکہ کے درمیان اقوام متحدہ کی قرارداد نمبر ۲۴۲ کی تعبیر پر ایک بہت بڑا جھگڑا اٹھ کھڑا ہوا۔ بیگن نے یہ دلیل دینا شروع کی کہ یہ قرارداد اردن کے غربی کنارے پر نافذ نہیں ہوتی۔ اس علاقے کو وہ Judea اور Samarea پکارتا تھا... حالانکہ پچھلی تمام اسرائیلی حکومتیں اس بات کو مانتی تھیں کہ یہ قرارداد تمام علاقوں پر لاگو تھی یعنی عرب مشرقی یروشلم، غزہ اور جولان کی پہاڑیاں۔ جونہی بیگن نے پہلی مرتبہ یہ اعلان عام کیا کہ قرارداد نمبر ۲۴۲ اسرائیل کے غربی کنارے پر دعویٰ کی نفی نہیں کرتی تو امریکہ کے اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ

نے فوری ردِّعمل کر کے یہ اعلان جاری کیا کہ ''ہماری رائے میں اس قرارداد کا مطلب یہ ہے کہ مشرق وسطیٰ کے تینوں محاذوں پر انخلاء عمل میں آئے... اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی بھی علاقہ بمع مغربی کنارہ کے... زیرِ معاہدہ نکات میں سے خود بخود خارج نہیں کیا جاسکتا!''

جب بیگن نے اپنی یہ منفرد تعبیر/تشریح جاری رکھی تو ۱۹۷۸ء میں اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کے ایک مطالعہ میں یہ نتیجہ اخذ کیا گیا کہ ''ہم نے وہ تمام سرکاری اور نجی بات چیت کا ریکارڈ کھنگالا ہے جو قرارداد نمبر ۲۴۲ کی منظور پر منتج ہوا۔ اس کے ووٹ پڑنے کی تمام تصریحات کو دیکھا گیا۔ ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ اس بات میں شک کرنے کی ذرّہ بھر گنجائش نہیں کہ تمام ممبران کونسل اور اسرائیل... متفقہ طور پر اس بنیادی افہام و تفہیم میں شریک تھے کہ انخلاء کا اصول تینوں محاذوں پر لاگو ہوگا۔''

اس قرارداد کے مصنف برطانیہ کے لارڈ کیریڈون نے بھی حتمی اور سرکاری طور پر اس موقف کی تصدیق کی اور لکھا ''یہ قرارداد مقبوضہ علاقوں کو خالی کرنے کے بارے میں تھی۔ اب فیصلہ یہ کرنا تھا کہ کون سے علاقوں پر قبضہ کیا گیا ہے؟ اس میں شک کرنے کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ یہ صاف اور سیدھی سی حقیقت تھی کہ مشرقی یروشلم، مغربی کنارہ، غزہ، جولان اور سینائی پر ۱۹۶۷ء کے حملہ میں قبضہ کیا گیا تھا۔ یہ قرارداد ان تمام علاقوں سے انخلاء پر اصرار کرتی تھی!''

یہی بات امریکی حکام بہت دفعہ اعلانیہ دہرا چکے ہیں۔ جون ۱۹۷۷ء میں کارٹر انتظامیہ نے ایک جامع امن سمجھوتے کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں ایک پیپر جاری کیا تھا، اس دستاویز میں نہایت واضح طور پر کہا گیا تھا کہ اسرائیل کو ''قرارداد ۲۴۲ کی شرائط کے بموجب یعنی معاوضہ میں... امن حاصل کرنے کے لیے مقبوضہ علاقے حتمی طور پر خالی کرنے ہوں گے۔ ہمارے خیال میں اس قرارداد کا مطلب یہ ہے کہ تینوں محاذوں پر انخلاء عمل میں آئے یعنی سینائی، جولان اور غربی کنارہ/غزہ... کوئی بھی علاقہ خود بخود ان نکات سے خارج نہیں ہوسکتا جن پر امن معاہدے کے لیے مذاکرات ہونے ہیں اور اس میں غربی کنارہ شامل ہے۔'' اس بات کے دس سال بعد سکریٹری آف اسٹیٹ جارج شلز کا کہنا تھا ''قرارداد ۲۴۲ کی شقیں تمام محاذوں پر لاگو ہوتی ہیں۔''

فریب ''یو۔ این۔ قرارداد ۲۴۲ مقبوضہ علاقوں سے انخلاء کا ذکر تو کرتی ہے لیکن اس انخلاء کی حدود کا تعین نہیں کرتی۔'' (آرتھر گولڈ برگ امریکی سفیر برائے اقوام متحدہ ۱۹۷۳ء)

حقیقت:

قرارداد ۲۴۲ میں جان بوجھ کر کچھ ابہام رکھا گیا تھا۔ یہ انخلاء والے پیرا میں ہے۔ جہاں بجائے "The" یا "All" کے الفاظ استعمال کرنے کے ''علاقوں سے'' کے الفاظ درج ہیں۔ یہ محاورہ استعمال کرنے کا اصل مطلب یہ تھا کہ ۱۹۴۸ء کی جنگ کے خاتمے پر جو مڑی تڑی جنگ بندی لائن ظہور میں آئی تھی اس میں معمولی سا سرحدی رد و بدل کر کے اسے صحیح کر دیا جائے۔ عرب یروشلم کا ذکر بنام تو نہ تھا لیکن تمام ممالک ماسوا اسرائیل کے اسے اس افتتاحی پیراگراف میں شامل سمجھتے تھے جس میں اس بات پر زور دیا گیا تھا کہ ''جنگ کے ذریعے علاقے حاصل کرنا قابل قبول نہیں!''

اس ابہام کے باوجود اردن کے شاہ حسین کو اعلیٰ امریکی حکام نے قرارداد منظور ہونے سے کچھ روز پہلے تک کئی دفعہ یہ یقین دہانی کرائی تھی کہ اس سے علاقوں میں معمولی رد و بدل کا منشاء ہے اور یہ ادلے بدلے کے اصول پر ہوگا۔

قرارداد منظور ہونے سے ۱۶ دن پیشتر ۶ / نومبر کو سکریٹری آف اسٹیٹ ڈین رسک نے شاہ حسین کو واضح کیا کہ ''امریکہ مغربی کنارے کے معتد بہ حصہ کی اردن کو واپسی کی حمایت کرے گا۔ البتہ سرحد میں کچھ رد و بدل ہوگا اور ہم اردن کو کسی بھی علاقے سے محروم ہونے کی صورت میں اس کا مناسب معاوضہ حاصل کرنے میں اپنا اثر و رسوخ استعمال کریں گے۔''

بطور مثال وضاحت کرتے ہوئے ڈین رسک نے شاہ حسین کو بتلایا کہ اگر اردن تل ابیب اور یروشلم کے درمیان واقع ایک بے ہنگم / بے تکا ابھار جسے "Latrun Salient" پکارا جاتا ہے، چھوڑ دینے پر رضامند ہو جائے تو امریکہ اپنا سفارتی اور سیاسی رسوخ استعمال کر کے اردن کو اسرائیل کے اندر بحیرہ روم کی ایک بندرگاہ تک رسائی بطور معاوضہ لے کر دے گا۔ شاہ حسین کو ایسی ہی یقین دہانیاں صدر جانسن اور امریکی سفیر آرتھر گولڈ برگ سے بھی ملیں۔

صدر جانسن کے بعد آنے والی ہر انتظامیہ نے شاہ حسین کو بار بار یہ یقین دہانی کروائی۔ مثال کے طور پر جنوری ۱۹۸۳ء میں دورِ ریگن کے سکریٹری آف اسٹیٹ جارج شلز نے شاہ حسین کو لکھا کہ ''قرارداد ۲۴۲ کے مطابق صدر کا یہ خیال ہے کہ جنگ کے ذریعے علاقہ حاصل نہیں کرنا چاہیے۔ ان کا یہ بھی خیال ہے کہ قرارداد ۲۴۲ جون ۱۹۶۷ء کی جنگ سے پیشتر کی سرحدوں میں تبدیلی کی اجازت نہیں دیتی۔ ماسواء اس کے کہ فریقین باہمی رضامندی سے کچھ تبدیلیاں آپس میں طے کرلیں... امریکہ

(عرب) مشرقی یروشلم کو مقبوضہ علاقوں میں شامل سمجھتا ہے۔''

صرف بش انتظامیہ کے دوران امریکہ نے اس قرارداد کو صرف اپنے الفاظ کی جائے اعمال سے بھی مدد دینی شروع کی۔ ۱۹۹۲ء کے اوائل میں بش نے اسرائیل کو دس ارب ڈالر کی قرضہ ضمانت فراہم کرنے سے صاف انکار کردیا جب تک وہ مقبوضہ علاقوں میں کسی قسم کی آبادکاری کے عمل کو مکمل طور پر جامد کردینے کا وعدہ نہیں کرتا اور قرارداد ۲۴۲ کی بنیاد پر گفت وشنید شروع نہیں کرتا۔ بہرحال ۱۹۹۲ء کی صدارتی مہم کے دوران اور یٹزاق رابن کے برسراقتدار آجانے کے بعد صدر بش نے قدرے نرمی اختیار کرتے ہوئے تمام شرائط کو پشت ڈال کر یہ ضمانت منظور کردی۔

فریب ''یو۔این۔قرارداد ۲۴۲ فریقین کے مابین گفت وشنید کا تقاضا کرتی تھی۔''

(یٹزاق رابن، اسرائیلی وزیراعظم ۱۹۷۹ء)

حقیقت:

اس قرارداد میں براہ راست گفت وشنید کا ذکر نہیں اور نہ ہی اسرائیل کے انخلاء سے قبل کسی گفت وشنید کا۔

قرارداد کے الفاظ میں تو بس ''سکریٹری جنرل سے درخواست کی گئی تھی کہ وہ اپنا ایک نمائندہ خاص مقرر کریں جو مشرق وسطی جا کر متعلقہ حکومتوں سے رابطہ پیدا کرے تاکہ وہ اس قرارداد کی شقوں اور اصولوں کی روشنی میں معاہدہ طے کرنے میں ان کی امداد کرے۔''

امریکی حکام ذاتی طور پر اسرائیل کے ساتھ متفق تھے کہ انخلاء سے قبل بات چیت کی ضرورت تھی تاکہ جنگ کے دوران قبضہ میں لیے گئے علاقے واپس ہوں لیکن اس بات چیت سے ان کی مراد اس سے قطعاً مختلف تھی جو اسرائیل نے بعدازاں کہا۔

امریکی حکام اپنی سادہ لوحی میں یہ خیال کرتے تھے کہ ادھر یو۔این۔قرارداد منظور ہوئی اور ادھر اسرائیل اور اس کے عرب ہمسایوں کے درمیان انخلاء کے بارے میں مختصر سی تکنیکی گفت وشنید ہوئی... اور بس!

عربوں کو انہوں نے یقین دلایا کہ ایسا ہی ہوگا۔ عربوں نے تب سے یہی موقف اختیار کر رکھا ہے کہ اسرائیل کو غیر مشروط انخلاء کرنا ہے لیکن اسرائیل کا اصرار ہے کہ بات چیت کا دائرہ انخلاء اور امن کے تمام پہلوؤں پر محیط ہونا چاہیے۔ جس میں نہ صرف فلسطینی مہاجرین کا معاملہ شامل ہو بلکہ

ممالک عرب سے یہودی مہاجرین کا بھی!

اگلے چھ برس تک اس پیشگی بات چیت کے معاملے کی بنیاد پر ہی اسرائیل قرارداد پر عمل درآمد ٹالتا رہا۔ امریکہ نے کئی مرتبہ اسرائیل پر بغیر تفصیلی بات چیت کئے انخلاء مکمل کرنے پر زور دیا لیکن اسرائیل نہ مانا اور براہ راست گفت وشنید پر اصرار کرتا رہا۔ ۹ رجون ۱۹۷۰ء کو سکریٹری آف اسٹیٹ ولیم راجرز نے اسرائیلی موقف پر نکتہ چینی کرتے ہوئے کہا ''اسرائیل کو چاہیے کہ وہ واضح طور پر یہ تسلیم کرے کہ وہ سیکورٹی کونسل کی نومبر ۱۹۶۷ء کی منظور کردہ قرارداد کے مطابق انخلاء کرے گا اور اس بات پر اصرار ترک کر دے گا کہ پہلے براہ راست بات چیت ہو اور وہ بھی بغیر کیس پیشگی شرط کے'' لیکن اسرائیل نے انکار کر دیا۔

۱۹۷۳ء میں مصر اور شام نے اس سفارتی پھڈے کو حل کرنے کی خاطر اسرائیل کے مقبوضہ علاقوں پر حملہ کر دیا۔ پیشگی گفت وشنید کا مسئلہ آخر کار یو۔این۔قرارداد نمبر ۳۳۸ کی منظوری سے حل ہوگیا جو ۱۹۷۳ء کی جنگ کے بعد ہوا۔ اس میں کہا گیا ''متعلقہ فریقین میں بات چیت شروع کی جائے گی جو مناسب سربراہی میں منعقد ہوگی اور جس کا مقصد مشرق وسطیٰ میں ایک پائیدار اور مبنی پر انصاف امن قائم کرنا ہوگا۔''

بہرحال اس نکتہ پر جیت جانے کے بعد اسرائیل نے یہی اصرار شروع کر دیا کہ انخلاء کا مطلب سب محاذوں پر واپسی نہیں۔ اس نے آج تک قرارداد ۲۴۲ کا یہ منفرد مطلب اختیار کر رکھا ہے۔



باب: ۷

جنگ رگڑا! ۱۹۶۹ء سے ۱۹۷۰ء

جنگ کا یہ رگڑا مصر اور اسرائیل کے مابین نہر سویز کے ساتھ ساتھ توپ خانے اور کمانڈوز کی مدد سے لڑا گیا جب کہ مصری فضائی حدود کے اوپر اس میں میزائلوں اور جنگی ہوائی جہازوں نے حصہ لیا۔ اسرائیل کے حدود کے اندر یہ جنگ بالکل نہیں پہنچی۔ جھگڑے کا اصل مرکز اسرائیل کی یہ ضد تھی کہ وہ مصری علاقے پر قبضہ جاری رکھے گا جب کہ مصر اسے واپس لینا چاہتا تھا۔

فریب ''ہم جنگ بندی کے سمجھوتے کا احترام کریں اور فریق مخالف خلاف ورزی!''

(لیوی ایشکول، اسرائیل وزیر اعظم ۱۹۶۸ء)

حقیقت:

۱۹۶۷ء کی جنگ کی بعد والی فائر بندی کا جاری رہنا اسرائیل کی توسیع پسندانہ پالیسی کے موافق تھا کیونکہ جب جنگ بند ہوئی تو اسرائیل دستے ماسواء لبنان کے اس کے تمام ہمسایہ عرب ممالک کی سرزمین پر تھے۔ فائر بندی جاری رہنے کا مطلب تھا کہ اسرائیل اپنا غاصبانہ قبضہ بغیر کسی نقصان کے جاری رکھے اور ساتھ ہی ان مفتوحہ علاقوں میں اپنی بستیاں بسائے جائے۔

اسرائیل نے ۱۹۶۷ء کی جنگ ختم ہوتے ہی یہ واضح کر دیا تھا کہ ''جو صورتِ حال آج تک تھی وہ دوبارہ کبھی نہیں ہوگی'' یہ وزیر اعظم لیوی ایشکول کے الفاظ تھے۔ جو پیغام اس سے عربوں کو ملا وہ یہ تھا اسرائیل مفتوحہ علاقوں پر قبضہ جاری رکھنا چاہتا ہے اور اگر یو۔ این۔ قرارداد ۲۴۲ کے مطابق اسرائیل سے یہ علاقہ خالی کروانا ہے تو اس کے لیے فوجی دباؤ کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں۔

یہ جنگ آہستہ آہستہ شروع ہوئی۔ ایک اہم اقدام اس ۱۹۶۷ء جنگ کے سال بھر بعد پیش آیا جب اسرائیلی توپچیوں نے نہر کے انتہائی جنوب والے کنارے پر ۴۵۰ گولے توپوں سے سوئز شہر پر برسا دیے۔ اس سے ۴۳ مصری ہلاک اور ۶۷ دوسرے زخمی، کم از کم ۱۰۰ عمارات، گھر، دکانیں، ایک مسجد، ایک گرجا اور ایک سنیما اس بمباری میں منہدم یا مکمل طور پر تباہ ہوئے۔

اسرائیل کا کہنا تھا کہ یہ جھڑپ مصریوں نے شروع کی تھی۔ انہوں نے نہر سویز پر تعینات اسرائیلی دستوں پر گولیاں چلائیں جن کے جواب میں مصری توپوں کو خاموش کرانے کے لیے سویز پر گولے داغے گئے۔ یہ شہر دو لاکھ ساٹھ ہزار نفوس پر مشتمل تھا لیکن گذشتہ اکتوبر میں بھاری اسرائیلی گولہ باری نے تقریباً دو لاکھ کو فرار کرا دیا۔ ان میں سے صرف چالیس ہزار افراد واپس لوٹے تھے جس سے شہر کی موجودہ آبادی تقریباً ایک لاکھ نفوس پر مشتمل تھی۔ ۱۹۶۸ء کے وسط میں اس اسرائیلی گولہ باری کے بعد ان میں سے بیشتر بھاگ لیے!

اس جنگ کے شروع ہونے کی بڑی وجوہ میں سے ایک ستمبر ۱۹۶۸ء میں اسرائیل کا یہ فیصلہ بھی تھا کہ نہر کے ساتھ ساتھ بارلیف لائن تعمیر کی جائے۔ یہ نہر سویز کی پوری لمبائی یعنی ۱۰۱ میل تک لمبی ایک نہایت مضبوط فوجی چوکیوں کی قطار پر مشتمل تھی۔ اس کا مقصد نہر کے باہر ہونے والے مصری گولہ باری کے حملوں کی شدت کو کند کرنا تھا لیکن مصریوں کی نگاہ میں یہ اسرائیل کے اس عزم کا اظہار تھا کہ وہ نہر سویز پر مستقلاً اپنے دستے تعینات کر کے جزیرہ نما سینائی پر قبضہ برقرار رکھنا چاہتا ہے۔

مصری صدر جمال عبدالناصر نے متعدد بار اعلانیہ انتباہ دیا کہ اگر اسرائیل نے مصری سرزمین پر قبضہ جاری رکھا تو وہ اس کو طاقت کے بل پر واپس لیں گے۔ بقول ناصر کے "اولین اور اہم ترین ترجیح اس جنگ میں فوجی محاذ کو حاصل ہے۔ ہمیں یہ جان لینا چاہیے کہ دشمن لڑائی کے بغیر یہ علاقہ خالی نہیں کرے گا۔"

۱۹۶۹ء کے اوائل میں ناصر نے جو کہا تھا وہ کر دکھایا۔ مصری توپ خانے نے سینائی میں موجود اسرائیلی افواج پر اندھا دھند بمباری کی اور ساتھ ہی کمانڈو دستوں نے کارروائی کی۔ جنگ ختم ہونے سے پیشتر اسرائیل نے اپنے نئے حاصل شدہ ایف۔۴ امریکی طیاروں سے مصر کے اندر دور تک بمباری کی۔ شہریوں کا بے پناہ نقصان ہوا اور قاہرہ کے قریبی علاقوں کو نشانہ بنایا گیا۔ سویٹ روس نے ایک نہایت غیر معمولی اقدام کیا یعنی مصری فضائی حدود کے دفاع کے لیے اپنے طیارے اور ہوا باز بھیج دیے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک مرتبہ پھر سپر پاورز آپس میں ٹکرا جائیں گی۔ روسی مداخلت نے امریکہ کو مجبور کر دیا کہ وہ فائر بندی کروائے جو اس نے اگست ۱۹۷۰ء میں کروا دی۔

فریب "سال رواں کے مارچ سے ناصر نے نہر کو ایک بڑے جارحانہ حملے کے مرکز میں تبدیل کر دیا ہے۔" (مسز گولڈا مائیر، اسرائیلی وزیراعظم ۱۹۶۹ء)

حقیقت:

یہ جنگ رگڑا درحقیقت ۸ر مارچ ۱۹۶۹ء کو شروع ہوئی جب مصریوں نے نہر سویز کے مشرق

میں واقع بارلیف لائن کی انتہائی طاقتور اسرائیلی چوکیوں پر روزانہ گولہ باری کی ابتداء کی۔ یہ حملے مصری علاقے میں اسرائیلی قابض فوج پر مرتکز تھے۔ اسرائیلی شہری یا ان کی املاک اس حملہ کی زد میں نہیں تھیں۔ بقول مورخ لارنس ویہٹن: ''اس لڑائی کے شروع کرانے سے عربوں کا مقصد قومی وقار کی بحالی تھا جو علاقہ واپس لینے سے حاصل ہوتی۔'' گولہ باری کا یہ تبادلہ اس قدر شدت اختیار کر گیا کہ ۷؍جولائی ۱۹۶۹ء کو اقوام متحدہ کے سکریٹری جنرل یوتھاں نے خبردار کیا کہ نہر سوئیز کے محاذ پر تشدد اتنا زیادہ ہے کہ ۱۹۶۷ء کی جنگ کے بعد کبھی نہ تھا۔

اس جنگ میں اسرائیل کے وہ فضائی حملے بھی شامل تھے جو اس نے مصری شہری ٹھکانوں پر کئے حالانکہ مصریوں نے کسی اسرائیلی شہری ٹھکانے کو نشانہ نہیں بنایا تھا۔ اسرائیل نے اپنے امریکی ساختہ ایف۔۴ جنگی طیاروں کی مدد مصر کے اندر دور تک مار کر کے بہتیرے شہریوں کو ہلاک کیا۔ فروری ۱۹۷۰ء میں ۶۸ مصری کارکن ایک اسرائیل فضائی بمباری میں ہلاک ہوئے جب ابوذمبل میں واقع ایک کباڑ خانے پر حملہ کیا گیا۔ یہ جگہ قاہرہ سے پندرہ میل شمال مشرق میں واقع تھی۔ اسی طرح ۸؍ اپریل کو بحرالبکر میں ایک پرائمری اسکول پر حملے کے دوران ۴۶ بچے ہلاک ہوئے۔

فریب ''اسرائیل اتنا طاقتور اور غالب پہلے کبھی نہ تھا۔'' (جون کچے، صیہونی فنکار ۱۹۷۰ء)

حقیقت:

اگست ۱۹۷۰ء میں اس جنگ رگڑا کے اختتام پر اسرائیل نے سرکاری طور پر اپنی فتح کا اعلان کیا چونکہ اس کے دستے اب بھی نہر سوئیز کے مشرق میں مصری سرزمین پر موجود تھے۔ لیکن زیادہ سمجھدار اسرائیلی لیڈر یعنی اذر وائیز مین اور مطیع یا ہو پلید کے خیال میں اسرائیلی قیادت کی یہ ایک بنیادی غلطی تھی کہ انہیں یہ اور ادراک نہ ہوا کہ مصر اپنے علاقہ پر اسرائیلی قبضہ تادیر برداشت نہ کرے گا۔ اسرائیلی فوجی مؤرخ یا کوف بارسمان ٹوف بھی اس سے متفق ہے کہ اسرائیل نے فاش غلطیاں کیں۔ ''اسرائیل کی یوم کپور جنگ (۱۹۷۳ء) کی فوجی اور سیاسی غلطیوں کی بنیاد جنگ رگڑا کے نتائج کی غلط تعبیر تھی۔''

سبق چاہے جو بھی ہو، اسرائیل کو اپنا مفتوحہ علاقہ واپس نہ کرنے کی بھاری قیمت چکانا پڑی۔ مصر کے کم از کم پانچ ہزار افراد اس جنگ میں ہلاک ہوئے۔ اسرائیلی نقصانات کا اندازہ گیارہ سو سے زائد تھا۔ جن میں چار سو سے زائد ہلاک شدگان تھے۔

❋ ❋

باب: ۸

۱۹۷۳ء کی جنگ

۱۹۷۳ء میں مصر و شام نے اسرائیلی افواج پر جو حملہ کیا اسے ''جنگ اکتوبر''، ''جنگ رمضان'' یا ''یومِ کپور جنگ'' کے ناموں سے یاد کیا جاتا ہے۔ تین سال پرانی جنگ رگڑا کی مانند اب بھی عربوں کا مقصد اپنے وہ علاقے واگزار کروانا تھا جو ۱۹۶۷ء کی جنگ سے اسرائیل نے قبضہ کرر کھے تھے۔ گو عرب اس میں ناکام رہے لیکن اس سیاسی زلزلے نے جو اس جنگ سے پیدا ہوا امریکہ کو ایک ایسی سفارتی ہڑبونگ پر مجبور کر دیا جس کا خاتمہ ۱۹۷۹ء کے اواخر میں اسرائیل اور مصر میں معاہدہ امن طے پانے پر ہوا۔ یہ جنگ ۶ سے لے کر ۲۵ اکتوبر تک جاری رہی۔

فریب ''۱۹۶۷ء کی جنگ سے لے کر اب تک عرب حکومتوں کے ہمارے باہمی امن قائم کرنے سے انکار میں کچھ خاص فرق نہیں آیا اور مصر اس میں سرفہرست ہے!''

(مسز گولڈا مائیر، اسرائیلی وزیر اعظم ۱۹۷۲ء)

حقیقت:

۱۹۷۰ء کے خزاں میں جمال عبدالناصر کی وفات پر مصر کی صدارت سنبھالتے ہی تین مہینے کے اندر اندر صدر انور سادات نے صدر نکسن کو ایک فوری خفیہ پیغام بھجوایا۔ ''میں امن چاہتا ہوں۔ جلد کیجئے۔'' وائٹ ہاؤس نے اس پیغام کو نظر انداز کر دیا کیونکہ نیشنل سیکورٹی مشیر ہنری کسنجر اس اسرائیلی تاثر سے متفق تھا کہ سادات کچھ سنجیدہ رہنما نہیں ہے اور ممکن ہے وہ زیادہ دیر اقتدار میں نہ رہے۔

۱۹۷۱ء کے دوران سادات نے بار بار اور اعلانیہ اسرائیل کے انخلاء کا مطالبہ دہرایا۔ اس نے خبردار کیا کہ یہ ''فیصلہ کن سال ہوگا۔ اسرائیل کو یہ علاقہ جنگ سے یا امن سے خالی کرنا ہی ہوگا۔'' اسرائیل نے سادات کی ان دھمکیوں کو درخورِ اعتناء نہ سمجھا اور کہا کہ ''اسرائیل ۵ رجون ۱۹۶۷ء سے پہلے والی سرحدوں پر واپس نہیں جائے گا۔''

۱۹۷۲ء میں سادات نے ڈرامائی طور پر تمام سوویٹ مشیر مصر سے نکال باہر کئے۔ روس مصر کا بہت بڑا حمایتی تھا لیکن سادات کو امید تھی کہ واشنگٹن اسے اسرائیل کے ساتھ باہمی امن قائم رکھنے میں مدد دے گا لیکن کسنجر سادات کی سنجیدگی کو سمجھنے میں ناکام رہا اور اس اقدام کو جلد بازی کا نام دے کر نظر انداز کر دیا۔ ۱۹۷۳ء کے اوائل میں سادات نے ایک اعلیٰ مصری عہدیدار اور کسنجر کے درمیان خفیہ مذاکرات کی حوصلہ افزائی کی تاکہ کوئی پرامن حل نکل آئے لیکن کسنجر کو پھر بھی سادات کی اہلیت پر شک ہی رہا اور اس نے ۳۰ر اکتوبر کے متوقع اسرائیلی انتخابات ہو جانے تک کوئی قدم اٹھانے سے انکار کر دیا۔

اس طویل زچ ہونے والے عرصہ کو ''نہ جنگ/ نہ امن'' کا نام دیا گیا اور یہی اسرائیل چاہتا تھا۔ بقول کسنجر ''مسز گولڈا مائر کا ایک بڑا مقصد وقت حاصل کرنا تھا کیونکہ موجودہ حالت تبدیل ہونے میں جس قدر تاخیر ہوگی اسی قدر اسرائیل کا مفتوحہ مقبوضہ علاقوں پر استحقاق بڑھتا جائے گا۔'' کسنجر بھی اسرائیل کی امداد پر مطمئن تھا کیونکہ اس کے خیال میں عرب زچ ہو کر مزید رعایتیں دینے پر مجبور ہو جائیں گے۔ نیشنل سیکورٹی کونسل میں کارٹر انتظامیہ کے مشرق وسطیٰ کا ماہر تجزیہ نگار ولیم کوئینٹ اس نتیجہ پر پہنچا کہ ''۱۹۷۲ء کے دوران امریکہ کی پالیسی اسرائیل کی اعلانیہ حمایت تھی... جنگ اکتوبر ۱۹۷۳ء ہی اس امریکی پالیسی میں تبدیلی کا باعث بنی۔''

فریب ''مصر جنگ کا انتخاب کر ہی نہیں سکتا۔''

(یگال ایلن، اسرائیلی نائب وزیر اعظم ۱۹۷۳ء)

حقیقت:

اسرائیلی تکبر نے نہ صرف دنیا کو گمراہ کیا بلکہ وہ خود بھی گمراہ ہوئے جیسا کہ بعد میں ثابت ہوا۔ اسرائیل کو اس وقت اپنی بدترین فوجی سراغ رسانی کی ناکامی کا سامنا ہوا جب اسے مصر و شام کے اس مشترکہ حملے کی جو انہوں نے ۶ر اکتوبر ۱۹۷۳ء کو اسرائیل قابض افواج پر کیا۔ پیشگی اطلاع نہ ملی۔ جنگ کے آغاز سے پیشتر کے مہینے اسرائیلیوں کی طاقت کی بڑھکوں اور عربوں کی لاغری کے اعلان سے گونجتے رہے۔

جنگ سے دو ماہ سے بھی کم پیشتر موشے دایان، وزیر دفاع نے جنرل اسٹاف (اعلیٰ فوجی قیادت، مترجم) کو بتلایا کہ ''طاقت کا توازن اس قدر زیادہ ہمارے حق میں ہے کہ یہ عربوں کے فوراً

جنگ شروع کر دینے کے سوچ بچار اور مقاصد کو مکمل طور پر زائل کر دیتا ہے''... اور جنرل ایریل شیرون نے اعلان کیا کہ ''بغداد اور خرطوم کے درمیان بشمول لیبیا کے ایسا کوئی ٹارگٹ نہیں جو ہماری فوج فتح نہ کر سکے'' اس نے اسرائیل کو یقین دلایا کہ ''ہمیں اپنی موجودہ سرحدوں پر کسی قسم کا سیکورٹی مسئلہ درپیش نہیں۔'' اسرائیل کا حوصلہ اس قدر بلند تھا کہ ۱۵ر جولائی کو اس نے اعلان کیا کہ اگلے سال سے تین سال لازمی فوجی تربیت کا عرصہ کم کر کے پونے تین سال کر دیا جائے گا۔

اسرائیلی سراغ رسانی کی ناکامی کی مشترکہ وجوہ اس کی اپنی قوت کے بارے میں ضرورت سے بڑھی ہوئی خود اعتمادی اور عربوں پر حقارت کی نظر ڈالنا تھا۔ ۱۹۶۷ء کی جنگ کے اختتام سے اسرائیلی افواج عرب علاقے پر قبضہ جمائے بیٹھی تھیں۔ اقوام متحدہ کی قرارداد ۲۴۲ کو بھی وہ خاطر میں نہ لا رہے تھے۔ مارچ ۱۹۷۳ء میں صدر نکسن کے ساتھ وائٹ ہاؤس میں ملاقات کے دوران اسرائیلی وزیر اعظم مسز گولڈا مائر نے کہا ''ہم پہلے کبھی ایسی اچھی حالت میں نہ تھے۔'' مسز مائیر کا کہنا تھا کہ وہ امن مذاکرات میں شمولیت کے لیے تیار تھی لیکن اس نے یہ گہرا تاثر بھی چھوڑا کہ کسی نئی پیش قدمی میں عجلت اسے درکار نہ تھی۔ جب مسز مائیر واپس لوٹی تو اس نے کہا۔ ''ہمیں اپنے حکمت عملی میں تبدیلی کے لیے کوئی وجہ یا بنیاد نظر نہیں آتی۔''

وزیر دفاع موشے دایان نے اسرائیلیوں پر زور دیا کہ وہ مقبوضہ علاقوں میں آباد ہو جائیں کیونکہ عرب اسرائیلی مذاکرات کا دس پندرہ برس تک کوئی امکان نہیں۔ اس دوران ایک رائے شماری کے جائزے سے یہ بات سامنے آئی کہ اسرائیلیوں کی ایک بہت بڑی اکثریت مقبوضہ علاقوں کی واپسی کی مخالف تھی۔

اپریل ۱۹۷۳ء میں سادات نے ایک انٹرویو میں اعلانیہ خبردار کیا ''حالات بے حد حوصلہ شکن ہیں۔ اس کو ہم مکمل ناامیدی اور ناکامی سے ہی تعبیر کر سکتے ہیں۔ میں نے جس دروازے پر دستک دی اسرائیل نے اسے میرے منہ پر دے مارا۔ امریکی ان کی پیٹھ ٹھونکتے رہے!... وقت آن پہنچا ہے کہ ہم کوئی چونکا دینے والا کام کریں۔ ملک میں تمام موجودہ وسائل کو جنگ شروع کرنے کے لیے تیار کیا جا رہا ہے! جواب ناگزیر لگتی ہے۔''

لیکن امریکہ یا اسرائیل میں کسی اعلیٰ عہدیدار نے اس بات پر کان نہ دھرا۔

فریب ''ہم نے یوم کپور جنگ میں فتح حاصل کی۔''

(مسز گولڈا مائر، اسرائیلی وزیر اعظم ۱۹۷۳ء)

حقیقت:

اسرائیل نے ۱۹۷۳ء کی جنگ تقریباً اسی طرح جیتی جیسے لنڈن جانسن نے ۱۹۶۸ء میں ویت نام کا مصیبت خیز ''ٹیٹ حملہ'' جیتا تھا۔ میدان جنگ کی ابتدائی کامیابیوں نے عربوں کی عزت نفس کو ایک بڑی حد تک بحال کر دیا۔ مصر کی نہر سویز عبور کرنے کی شاندار کامیابی کے بارے میں یہ اور بھی سچ تھا کہ نہر کے مشرقی کنارے پر اسرائیل کی بے حد مضبوط فوجی چوکیوں کے ہوتے ہوئے یہ ممکن ہی نہ تھا۔

اسرائیلی افواج انجام کار غالب آ گئی تھیں لیکن اتنی آسانی سے نہیں جیسا کہ وہ دعویٰ کرتے ہیں۔ اس جنگ کی شدت اور امریکہ روس کے مابین کھلم کھلا عام ٹکراؤ کے خدشے نے دنیا کی توجہ بنیادی مسئلے یعنی عرب/اسرائیل تنازع پر مبذول کر دی۔ اقوام عالم نے قریب قریب پورے اتفاق رائے سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ مصر اور شام کو اپنے کھوئے ہوئے علاقے واپس لینے کے لیے کوشش کرنے کا حق تھا اور یہ اسرائیل کی غلطی تھی کہ اس نے ۱۹۶۷ء کے فتح کیے ہوئے علاقے یو۔ این۔ قرارداد ۲۴۲ کے مطابق واپس کرنے کے معاملہ کو پس پشت ڈال رکھا تھا۔ دنیا کے کونے کونے سے مذمت اٹھ آئی۔ اس میں یورپی، افریقی اور اقوام سبھی شامل تھیں۔ اگر کوئی شامل نہیں تھا تو وہ ریاستہائے متحدہ امریکہ تھا!

اسرائیل اور اس کے حمایتیوں نے کہا کہ عالمی سماج عربوں کے تیل بائیکاٹ سے خوفزدہ ہے۔ یا بصورت دیگر پرانی Anti-Semitism والی بات تھی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ بیشتر غیر جانبدار مبصر یہ دیکھ رہے تھے کہ اسرائیل عرب علاقے دبائے رکھنے میں زیادہ دلچسپی رکھتا ہے بہ نسبت امن کے!

اب یہ بالکل واضح ہے کہ عربوں نے یہ جنگ اپنے علاقے واپس لینے کے لیے زچ ہو کر شروع کی نہ کہ یہودی ریاست کو نیست و نابود کرنے کے لیے جیسا کہ اسرائیلیوں کا دعویٰ تھا۔ اسرائیل کی حدود کے اندر کوئی بھی لڑائی نہ ہوئی۔

اسرائیلی وزیر اعظم یتزاق رابن نے یہ تسلیم کیا کہ مصر اور شام نے 'یوم کپور جنگ' اسرائیل کی ہستی کو خطرہ میں ڈالنے کے لیے شروع نہیں کی تھی۔ یہ ان کا ایک محدود سیاسی مقصد حاصل کرنے کے

لیے انتہائی اقدام تھا۔ سادات کا نہر سویز عبور کرنے کا مقصد سیاسی حقائق کو تبدیل کرنا تھا تا کہ وہ ایک زیادہ سازگار سطح سے ایک ایسا سیاسی عمل شروع کر سکے جو پہلے سے موزوں تر ہو۔ اس لحاظ سے وہ کامیاب رہا۔

دوسری جانب سادات کے الفاظ میں ''ہم اکتوبر سے پہلی والی حالت کو بھلا کیسے برقرار رہنے دیتے۔ یعنی نہ جنگ/نہ امن! دونوں سپر طاقتوں نے مشرق وسطیٰ کے مسئلے کو سرد خانے میں ڈال رکھا تھا۔ ۱۹۶۷ء کی چھ روزہ جنگ کے بعد سے امریکی ہمیں ایک غیر متحرک لاش کی مانند سمجھتے تھے۔ یہ تو جنگ سے بھی بدتر بات تھی!''



باب: ۹

۱۹۸۲ء کا لبنان پر حملہ

اسرائیلی دستوں میں لبنان میں دخول ایک بھرپور حملہ تھا جس میں بکتر بند دستوں، ہوائی اور بحری جہازوں نے حصہ لیا اور ان میں بیشتر ''ساختہ امریکہ'' تھے۔ اس آپریشن کا نام ''گیلیلی کے لیے امن'' رکھا گیا۔ مطلب یہ کہ فلسطینی گوریلا جنگجوؤں کو سرحد سے پرے ڈھکیل کر اسرائیل کے اندر حملوں سے بچا جائے۔ درحقیقت اسرائیلی افواج بیروت تک جا پہنچیں اور پہلی مرتبہ ایک عرب دارالحکومت کا محاصرہ کرلیا۔ پتہ یہ چلا کہ اسرائیل کا مقصد سارے لبنان کو فلسطینی جنگجوؤں اور شامی افواج سے پاک کرنا اور لبنان کو خوف زدہ کر کے امن سمجھوتے پر دستخط کرنے کے لیے مجبور کرنا تھا۔ زیادہ تر جھڑپیں ۶/جون سے لے کر ۲۶/ستمبر ۱۹۸۲ء کے درمیان ہوئیں جب اسرائیل نے مغربی بیروت سے اپنے دستے واپس بلا لیے۔

فریب ''۱۹۸۲ء کے اوائل میں لگاتار مشتعل کردینے والے اور انتقامی واقعات کا سلسلہ جاری رہا جو جون میں اپنے عروج کو پہنچا جب (اسرائیلی سفیر) شلومر آرگوف کو لندن میں گولی ماری گئی۔ اسرائیلی دستے ۶/جون ۱۹۸۲ء میں گھسے۔''

(ہائمن بک بائنڈر، امریکن جیوش کمیٹی کا سابقہ نمائندہ ۱۹۸۷ء)

حقیقت:

۶/جون ۱۹۸۲ء تک جب اسرائیل نے لبنان پر حملہ کیا فلسطینی گوریلے اس جنگ بندی کا مکمل احترام کررہے تھے جو ۲۴/جولائی ۱۹۸۱ء سے نافذ تھی۔ لبنان کے ساتھ اسرائیل کی شمالی سرحد پر خاموشی تھی۔ کوئی حملے نہ ہوئے تھے۔

اس کے باوجود جب ۳/جون کو لندن میں اسرائیلی سفیر شلومر آرگوف کو گولی ماری گئی تو وزیر اعظم مناخم بیگن نے اس واقعہ سے فوری فائدہ اٹھاتے ہوئے اسے لبنان پر حملے کا جواز بنالیا۔ یہ اس

کے باوجود ہوا کہ اسرائیلی سراغ رساں اداروں نے اپنے تجزیہ سے فوراً یہ معلوم کرلیا کہ قاتل الفتح انقلابی کونسل کے دشت گرد گروہ کا حصہ تھے اور یہ پی۔ ایل۔ او سے بالکل جدا تھا۔ اس کا سربراہ ابوندال تھا جس کا پیدائشی نام ''صابری خلیل بناء'' تھا جو پی۔ ایل۔ او کے یاسر عرفات کا بدترین دشمن تھا۔ اس کے باوجود بیگن نے اعلان کیا ''کہ یہ سب پی۔ ایل۔ او ہی ہیں'' اور دوسرے ہی دن گنجان آباد مغربی بیروت اور جنوبی لبنان میں پی ایل او کے دفاتر پر زبردست ہوائی حملوں کے احکامات جاری کردیے۔ اِسرائیل کا یہ بھرپور حملہ سفیر آرگوف کو گولی لگنے کے تین روز بعد شروع ہوا۔

جیسا کہ اسرائیل وزیر دفاع ایریل شیرون کے ایک نکتہ چیں نے لکھا ہے: ''شیرون نے ایک نسبتاً پرامن ملک کو جس کی شمالی سرحد پچھلے سال بھر سے پرسکون تھی موت اور تباہی کے گرداب میں دھکیل دیا۔ جس کے اثرات اس کے کونے کونے میں پھیل گئے۔''

فریب ''ہمیں ایک پانچ لبنانی علاقے کی بھی ہوس نہیں۔''

(مناخم بیگن، اسرائیلی وزیراعظم ۱۹۸۲ء)

حقیقت:

۱۹۸۲ء کے لبنان پر حملے کو دس سال ہونے کو آئے اور اسرائیل اب بھی جنوبی لبنان کو کنٹرول کررہا ہے (یادرہے کہ یہ کتاب ۱۹۹۳ء میں طبع ہوئی۔ (مترجم)

۱۹۹۲ء کے آخر تک لبنان کی اس حفاظتی پٹی میں جو اسرائیل نے ۱۹۷۸ء میں چھینی اور ۱۹۸۲ء میں اس کو کہیں کہیں بارہ میل تک اندر بڑھا دیا۔ تقریباً ایک ہزار اسرائیلی سپاہی اب بھی مامور تھے۔ یہ حفاظتی پٹی (جسے اسرائیلی شمالی کنارہ پکارتے تھے) لبنان کے کل رقبے کا نو فیصد تھی اور یہ ۱۹۴۸ء میں چھینے گئے عرب علاقے میں ہزاروں مربع میل کا اضافہ تھی۔

اسرائیل کے لیڈروں کو آغاز ہی سے یہ ہوس رہی ہے کہ وہ جنوبی لبنان پر قبضہ کرلیں۔ مثال کے طور پر ۱۹۵۵ء میں اس وقت کے چیف آف اسٹاف موشے دایان نے یہ معاملہ ڈیوڈ بن گوریان سے تبادلہ خیالات کرتے ہوئے اٹھایا اور کہا ''اب صرف یہی ایک مسئلہ رہ گیا ہے کہ (لبنان میں) ایک افسر تلاش کیا جائے۔ چاہے وہ میجر ہی کیوں نہ ہو۔ ہمیں یا تو اس کا دل جیتنا ہوگا یا پھر پیسے سے خریدنا ہوگا تاکہ وہ اپنے آپ کو مارونی (عیسائی) باشندوں کا نجات دہندہ قرار دے دے۔ تب اسرائیلی فوج لبنان میں داخل ہوجائے گی۔ ضروری علاقے پر قبضہ کرکے ایک عیسائی حکومت تشکیل

دے گی جو اپنے آپ کو اسرائیل کا اتحادی کہے۔ لطانی سے جنوب کا سارا علاقہ اسرائیل میں ضم کرلیا جائے گا اور پھر راوی چین ہی چین لکھے گا۔"

فریب "لبنان پر حملہ ایک ایسا آپریشن ہے جو تقریباً بارہ گھنٹے لے گا۔ مجھے یہ علم نہیں کہ معاملات کیا شکل اختیار کریں گے۔ لہٰذا میری رائے میں اسے ۲۴ گھنٹے کا سمجھ کر دیکھا جائے۔" (ایریل شیرون۔ اسرائیلی وزیر دفاع ۱۹۸۲ء)

حقیقت:

ایریل شیرون کے لبنان پر حملہ کرنے سے ذرا پہلے یہ تسلی آمیز الفاظ جو اسرائیلی کابینہ کو کہے گئے اور بعد ازاں جو یقین دہانیاں واشنگٹن کو کروائی گئیں وہ جان بوجھ کر گمراہ کرنے کے لیے تھیں۔ یہ پُرفریب باتیں شیرون کے اس پرشکوہ پلان پر پردہ ڈالنے کے لیے تھیں جس کا مقصد لبنان پر معاہدہ امن تھوپنا، پی ایل او کا صفایا کرنا اور ہاتھ کے ہاتھ شامی فوجوں کو شکست دینا تھے۔

حقیقت یہ تھی کہ اسرائیل کی حملہ آور فوج جو دسیوں ہزار پر مشتمل تھی۔ لبنان میں ان مختصر عرصہ میں داخل نہ ہوسکتی تھیں جو شیرون صاحب نے فرمایا اور اس سے بھی زیادہ ناممکن بات یہ تھی وہ تمام اہداف اتنے مختصر وقفہ میں حاصل کرسکے۔ بعد ازاں اسرائیلی حملہ آور فوج تین سال تک لبنان میں رہی۔ شدید ترین لڑائی کے دوران یعنی شروع کے چند ہفتوں میں اسرائیل نے نوے ہزار بری فوج، بارہ ہزار سپلائی ٹرک، تیرہ سو ٹینک، تیرہ سو بکتر بند گاڑیاں، چھ سو چونتیس جنگی ہوائی جہاز اور متعدد بحری جنگی جہاز اس جنگ میں جھونکے تھے۔ اتنی عظیم قوت کے مظاہرہ سے ہوا تو صرف یہ ہوا کہ بیروت سے پی ایل او کے آٹھ ہزار تین سو جنگجوؤں کو نکال باہر کیا۔

(جیسا کہ اب آپ جانتے ہیں جون ۲۰۰۰ء میں اسرائیلی افواج کو آخرکار لبنان کے اس خودساختہ حفاظتی زون سے نکلنا ہی پڑا۔ گویا۔

بڑے بے آبرو ہوکر تیرے کوچے سے "وہ" نکلے!

(مترجم)

اسرائیل کے اس اعلان کے باوجود کہ اس نے ۶ رجون ۱۹۸۵ء تک اپنی افواج کا انخلاء مکمل کرلیا ہے۔ اس کے ہزار کے قریب فوجی اب بھی جنوبی لبنان میں حفاظتی پٹی پر پہرہ دینے کے لیے موجود ہیں۔

فریب ''امن برائے گیلیلی آپریشن کا مقصد بیروت پر قبضہ کرنا نہیں بلکہ پی ایل او کی توپوں اور مارٹروں کا اتنا پیچھے دھکیل دینا ہے کہ وہ ہماری نو آبادیوں کو نشانہ نہ بنا سکیں۔ ہم چالیس کلومیٹر (یعنی چوبیس میل) کی حد تک بات کر رہے ہیں!'' (شیرون، اسرائیلی وزیر دفاع ۱۹۸۲ء)

حقیقت:

حملے کے ہفتہ بھر کے اندر اسرائیلی افواج بیروت میں تھیں جو اسرائیل سے تقریباً ساٹھ کلو میٹر دور ہے۔ اس دوران جنوبی لبنان میں ہر طرف تباہی کا دور دورہ تھا اور کم از کم بیس ہزار کے لگ بھگ ہلاک و زخمی ہوئے۔

اسرائیلی وزیر اعظم بیگن نے اس قتل عام کو روکنے کی تمام عالمی اپیلیں ٹھکرا دیں کیونکہ اس کے خیال میں اس حملے سے ''چالیس سالہ دورِ امن'' کا آغاز ہوگا۔ اس نے الٹا مغربی بیروت کے محاصرہ کرنے کا حکم دیا جس میں پانچ لاکھ سے زائد شہری نرغے میں آ گئے۔ مغربی بیروت پر دن رات فضائی حملے اور فوجی توپوں/ بحری جہازوں سے تابڑ توڑ گولہ باری کی گئی۔ رہائشی علاقوں پر نہ صرف کلسٹر بم، نیپام بم اور فاسفورس بم گرائے گئے بلکہ جدید ترین فیول ایئر ہتھیار بھی استعمال کیے گئے۔

فریب ''جنہوں نے بھی لبنانی دستوں کو صابرہ/شطیلہ پناہ گزین کیمپوں میں گھسنے دیا ان کے وہم و گمان میں بھی نہ آیا ہوگا کہ وہ اندر جا کر قتل عام کریں گے۔''

(مناخم بیگن، اسرائیلی وزیر اعظم ۱۹۸۲ء)

حقیقت:

۱۶ ستمبر سے ہی یہ واضح ہو چکا تھا کہ لبنان کے پناہ گزین کیمپوں کے اندر خون خرابے کا پروگرام بن چکا ہے۔ خصوصی امریکی نمائندے مورس ڈریپر کو اتنی تشویش تو تھی کہ اس نے پناہ گزینوں کی حفاظت کے مسئلے پر وزیر دفاع ایریل شیرون اور چیف آف اسٹاف رفائیل عیطان سے بات چیت کی۔ ڈریپر نے یہ تجویز رکھی کہ بیروت کے جنوب میں واقع پناہ گزین کیمپوں میں لبنانی فوج بھیجی جائے جہاں شیرون کے بقول دہشت گرد چھپے بیٹھے تھے۔ لیکن بقول عیطان کے باقاعدہ فوج اس کام کے لیے موزوں نہ تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ لبنان اس وقت انتقام کے جذبات کی شدت سے پھٹنے کے قریب ہے۔ ''اگر میری سنو تو میں کہوں گا کہ ان کے چند کمانڈرز جو میرے پاس آئے ان کی

آنکھوں میں خون اترا ہوا تھا یہاں بے تحاشا خون بہے گا۔‘‘

اس وقت صابرہ اور شطیلہ کے پناہ گزین پوری طرح اسرائیلی فوج کے نرغے میں تھے۔ امریکی نمائندے کو مندرجہ بالا الفاظ کہنے کے باوجود عیطان نے لبنانی کرسچن فلانجسٹ ملیشیا کے دستوں کو ۱۶ ستمبر کے روز ان دونوں کیمپوں میں داخلے کی اجازت دے دی تاکہ وہ (اپنے طریقہ سے) یہ کام سرانجام دے سکیں۔ عیطان نے اسرائیلی کابینہ کو بریفنگ دیتے ہوئے کہا کہ ہم نے محاصرہ اس لیے کر رکھا تھا تاکہ فلانجسٹ اس رات اپنا کام شروع کریں اور ہم انہیں احکامات دے سکیں جب کہ لبنانی فوج کو احکامات دینا ممکن نہ تھا۔

اس شب یعنی ۱۶ ستمبر کو خواتین، بچوں اور بوڑھوں کا قتل عام شروع ہوگیا۔ بظاہر کوئی بھی دہشت گرد نہ مارا گیا جیسا کہ اسرائیلیوں کا اصرار تھا کہ وہ ان کے اندر پوشیدہ ہیں۔ کوئی ہوتا تو ملتا! یہ قتل و غارت ۱۸ ستمبر تک جاری رہا۔

جب اس قتل عام کی خبر نشر ہوئی اور عالمی نکتہ چینی کے جواب میں وزیراعظم مناخم بیگن نے کمال بے نیازی اور مصنوعی غصہ سے جواب دیا: ’’Goyim مارے Goyim کو اور الزام یہودی پر آئے!‘‘ (Goyim کا لفظ یہودی تمام غیر یہودیوں کے لیے ازراہِ تحقیر استعمال کرتے ہیں جس کا مطلب عبرانی میں چوپایہ ہے۔ (مترجم)

اسرائیلی کابینہ نے پہلے سے تیار شدہ بیان میں کہا ’’یہودی قوم کے خلاف قتل و غارت گری کا جھوٹا الزام لگایا گیا ہے۔‘‘ اسرائیل کے ایک کٹر حامی کیلیفورنیا کے ڈیموکریٹ سینٹر ایلن کرینسٹن کو بیگن نے لکھا کہ ’’یہ ساری ہی مہم... یعنی اسرائیل پر اخلاقی ذمہ داری ڈالنا... مجھ جیسے عمر رسیدہ شخص کو جس نے زندگی میں بہت کچھ دیکھا ہے... انتہائی ناقابل یقین، حیرت انگیز اور یقیناً کلی طور پر قابل تحقیر لگتی ہے۔‘‘

بہرحال اسرائیلی سرکاری کمیٹی جسے کاہان کمیشن کے نام سے پکارا جاتا ہے، نے چند ماہ کے اندر اندر یہ نتیجہ اخذ کیا کہ اس معاملے میں الزام کا بیشتر حصہ اسرائیلی حکام کے سر ہے۔ اس رپورٹ میں فلانجسٹ ملیشیا کو براہِ راست اور آٹھ اسرائیلی حکام کو بالواسطہ اس قتل عام کا ذمہ دار مجرم ٹھہرایا گیا۔ وزیراعظم بیگن، وزیر خارجہ یتزاق شامیر، وزیر دفاع شیرون، چیف آف اسٹاف لیفٹیننٹ جنرل عیطان، فوجی سراغ رسانی کا ڈائریکٹر میجر جنرل یہوشوا سیگائے، میجر جنرل آمردروری، بریگیڈیئر

جنرل ایموس یارون اور خفیہ ایجنسی موساد کا سربراہ (جس کا نام نہیں لیا گیا) شامل تھے۔ یارون کو بعد ازاں واشنگٹن میں اسرائیلی ملٹری اتاشی لگا دیا گیا جب کہ کینیڈا نے پیشتر ازیں اس کے قتل عام میں ملوث ہونے کی بناء پر قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

کمیشن کا کہنا تھا کہ ہماری نظر میں تو لبنانی معاملات میں جس کسی کا بھی کوئی تعلق تھا اسے پناہ گزیں کیمپوں میں قتل و غارت برپا ہونے کا پیشگی احساس ہونا چاہیے تھا۔ اگر مسلح فلانجسٹ گروہ بغیر اسرائیلی افواج کی براہ راست نگرانی اور کنٹرول کے ان میں داخل کئے جائیں گے تو اور کیا ہونا تھا؟

نہ صرف یہ کہ اسرائیلی امداد سے فلانجسٹ گروہ کیمپوں میں داخل ہوئے بلکہ جب یہ واضح بھی ہو گیا کہ قتل عام ہو رہا ہے تو اسرائیلی حکام کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی۔ بقول کمیشن کے "صاف اور واضح ہے کہ فلانجسٹوں کو باز رکھنے اور ان کی حرکتوں کو بند کرنے کے لیے کسی قسم کا فوری اور سخت قدم نہ اٹھایا گیا۔" نیویارک ٹائمز کے نامہ نگار ٹامس۔ ایل۔ فرائڈ مین کا بعد ازاں کہنا تھا "جب ان فلانجسٹوں کو کیمپ کے اندر جانے دیا گیا تو اسرائیلیوں کو بخوبی علم تھا کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔"

اسرائیلیوں کا کہنا تھا کہ صابرہ اور شطیلہ کیمپوں میں سات اور آٹھ سو کے درمیان افراد ہلاک ہوئے۔ کچھ دوسرے اندازے اس سے کہیں بڑھ کر تھے۔ فلسطینی ہلال احمر کے مطابق یہ تعداد دو ہزار سے زائد تھی جب کہ لبنانی حکام نے تصدیق کی کہ ۷۶۲ لاشیں برآمد ہوئیں اور ۱۲۰۰ وفات سرٹیفکیٹ جاری کئے گئے۔

فریب "یہ میرا دعویٰ ہے!... کہ اسرائیلی دفاعی افواج نے سرکاری احکامات کی تکمیل کرتے ہوئے جان بوجھ کر کسی ایک موقع پر بھی شہری آبادی کو نقصان نہیں پہنچایا۔"

(مناخم بیگن، اسرائیلی وزیر اعظم ۱۹۸۲ء)

حقیقت:

صابرہ اور شطیلہ کے قتل عام کے علاوہ بہت سے لبنانی شہری اسرائیلی حملے میں ہلاک ہوئے۔ اس کی گواہی اسرائیلیوں، نامہ نگاروں، عالمی مبصرین اور کئی دوسروں نے بھی دی کہ شہری آبادی کا خوف ناک زیاں ہوا۔ اندازے تو بہت مختلف ہیں لیکن سبھی ہزاروں میں ہیں۔ اسرائیلی فوجی رپورٹ کے مطابق ۶ را کتوبر ۱۹۸۲ء تک بارہ ہزار دو سو چھہتر اموات ہوئیں۔ لبنانی پولیس کا کہنا تھا کہ انیس ہزار پچاسی (۱۹۰۸۵) ہلاک اور تیس ہزار تین سو زخمی ہوئے۔ اس میں بیروت کے چھ ہزار سات سو

پچھتر بھی شامل تھے جس کا ۸۴ فیصد شہری اور ان کا ایک تہائی بچے تھے۔

امریکی فرینڈز سروس کمیٹی کی انسانی حقوق مشاورتی کمیٹی نے اندازہ لگایا کہ اسرائیلی حملے کے پہلے چار ماہ کے دوران اسرائیلی فوج کے پناہ گزین کیمپوں کی باقاعدہ تباہی سے تقریباً دو لاکھ فلسطینی بے گھر ہوئے۔

اس کے علاوہ پچھلی تمام جنگوں کی مانند اس میں بھی اسرائیلی دستوں نے شہریوں کی املاک پر خوب ہاتھ صاف کئے اور لوٹ مار کی۔ جب اسرائیلی افواج ستمبر ۱۹۸۲ء کے آخر میں واپس ہوئیں تو مال غنیمت سے بھرے ٹرکوں کی قطاریں قافلوں کی شکل میں واپس جاتی نظر آئیں۔ آزادی فلسطین تنظیم کے بیروت میں تحقیقاتی مرکز کے سربراہ ڈاکٹر صابری جریس کو شکایت تھی کہ اسرائیلی فوج ان کے مرکز کی تمام کی تمام پچیس ہزار کتب اٹھا کر لے گئی جو عربی، انگریزی اور عبرانی میں تھیں۔ بقول ڈاکٹر جریس کے اسرائیلی فوجیوں نے اس مرکز کی فائلیں، مسودے، دستاویزات، مائیکروفلمیں، پرنٹنگ پریس، ٹیلیفون اور دوسری اشیاء سمیٹنے میں پورا ہفتہ صرف کیا۔ انہوں نے الماریاں اور دوسرے تمام آلات/فرنیچر بالکل تباہ کردیے۔

اسرائیلی اپنے پیچھے جو مکروہ تحریریں چھوڑ گئے وہ تھیں ''فلسطینی؟ یہ کیا شے ہے؟'' اور ''فلسطینیو...!'' (یہ چار حرفی لفظ یہاں لکھنا ہمارے لیے شرافت سے گری ہوئی بات ہے۔ بہرحال اس گالی کو ہر کوئی جانتا ہے... (مترجم) ۲۴ر نومبر ۱۹۸۳ء کو اقوام متحدہ کے دباؤ پر اسرائیل نے یہ قدیم دستاویزات واپس کیں۔

اسرائیلیوں نے شہریوں کے خلاف کلسٹر بم استعمال کرکے اپنے اس معاہدے کی بھی خلاف ورزی کی جو انہوں نے امریکہ سے اس بارے میں کررکھا تھا کہ یہ بم صرف اپنے دفاع میں استعمال کئے جائیں گے۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۲۴ر جون کو ایوان نمائندگان کو رپورٹ پیش کرتے ہوئے ریگن انتظامیہ نے کہا کہ اغلباً اسرائیل نے امریکی مہیا کردہ اسلحہ اپنے دفاع کی بجائے لبنان پر حملہ کرنے میں استعمال کرکے آرمز ایکسپورٹ کنٹرول ایکٹ کی خلاف ورزی کی ہے۔ تین روز بعد ان کلسٹر بموں کی کھیپ اسرائیل بھجوانا بند کردی گئی لیکن صرف کچھ ہی عرصہ کے لیے۔

لندن کے ''سنڈے ٹائمز'' نے لکھا کہ ۶ر اگست تک حملے کے ابتدائی دو ماہ میں اسرائیلی

توپچیوں نے بیروت میں پانچ یو۔ این۔ عمارتوں، ایک سو چونتیس سفارت خانوں اور سفارتی رہائش گاہوں، چھ ہسپتالوں/کلینک، ریڈکراس آفس اور بے شمار گھروں کو نشانہ بنایا۔ شہر کے مغربی حصہ کو جانے والی تمام ٹریفک روک دی گئی۔

اسرائیلی دستوں نے پانی، بجلی، اشیاء خورد ونوش، پٹرول غرضیکہ شہریوں کی ضرورت کی ہر چیز جانا روک دی تھی۔ جب صدر ریگن نے وزیراعظم بیگن پر زور دیا کہ وہ اسرائیلی دستوں کو اقوام متحدہ کی عائد کردہ جنگ بندی کی خلاف ورزی سے روکیں تو بیگن کا جواب تھا ''اسرائیل ہرگز ہرگز کسی کے آگے نہیں جھکے گا! کیا تم بھول گئے کہ یہودی صرف خدا کے حضور جھکتے ہیں؟''

ہفتہ بھر بعد ہی بیگن نے اس گستاخانہ گفتار کی تائید اپنے ایک زبردست عمل سے کی۔ یعنی بیروت پر ایک انتہائی وحشیانہ حملہ کیا۔ ۱۲؍اگست کے اس حملے کو جس میں ہوائی جہاز، توپیں اور بحری بمباری استعمال کی گئی ''سیاہ جمعرات'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ تباہ کن دن عین علی الصبح ایک زبردست گولہ باری سے شروع ہوا۔ اس کے بعد لگاتار گیارہ گھنٹے تک بھرپور فضائی بمباری کی گئی۔ اس حملے میں پانچ سو تک افراد ہلاک ہوئے۔

صدر ریگن اتنے برافروختہ ہوئے کہ دن میں دو بار بیگن کو فون کیا اور کہا کہ اسرائیل بیکار کی تباہی اور خون خرابے کا ارتکاب کر رہا ہے۔ بقول ریگن یہ بمباری بالکل احمقانہ اور بے سروپا تھی۔ وائٹ ہاؤس نے اعلان عام کیا کہ صدر کو صبح یہ جان کر بہت صدمہ ہوا کہ مغربی بیروت پر اسرائیل نے ایک نیا اور شدید حملہ کیا ہے۔

ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

(غالب)

ایک لبنانی اخبار ''النہار'' نے اگست کے اواخر میں لکھا کہ بیروت میں پانچ ہزار پانچ سو پندرہ افراد ہلاک ہوئے اور گیارہ ہزار ایک سو اڑتالیس زخمی۔ گو اسرائیل اب بھی یہ دعویٰ کرتا ہے کہ تقریباً تین ہزار ہلاک ہوئے جن میں سے بیشتر دہشت گرد تھے لیکن دوسروں کا اندازہ ہے کہ ہر ایک دہشت گرد فلسطینی گوریلے کے ساتھ چار عدد شہری ہلاک یا زخمی ہوئے۔

فریب ''دوسری جنگوں کی طرح لبنان کی جنگ بھی اسرائیل کے لیے دفاعی تھی۔''

(ایریل شیرون، اسرائیلی وزیراعظم ۱۹۸۹ء)

حقیقت:

یہ تو اسرائیلی وزیر اعظم بیگن نے بھی کبھی نہیں کہا کہ اسرائیل کو لبنان سے اس قدر شدید خطرہ لاحق تھا کہ اسے جنگ شروع کرنی پڑی۔ نیشنل ڈیفنس کالج میں تقریر کرتے ہوئے بیگن نے کہا کہ اسرائیل نے تین ایسی جنگیں لڑی ہیں جو ناگزیر تھیں لیکن تین جنگیں ایسی تھیں جو اس نے خود چنی تھیں۔ ان مجبوراً جنگوں میں ۱۹۸۲ء کی جنگ آزادی ۷۰-۱۹۶۹ء کی جنگ رگڑ ااور ۱۹۷۳ء کی یوم کپور جنگ شامل تھیں۔ بقول اس کے ''ہماری دوسری جنگوں میں بھی متبادل چارہ کار موجود تھے۔''

بیگن نے جن چنی ہوئی جنگوں کا حوالہ دیا۔ وہ ۱۹۵۶، ۱۹۶۷ء اور ۱۹۸۲ء کی جنگیں تھیں۔ نومبر ۱۹۵۶ء میں ہمارے لیے متبادل راستہ تھا۔ یہ جنگ فدائین کو تباہ کرنے کے مقصد کے تحت لڑی گئی جو ریاست کی زندگی کے لیے خطرہ نہ تھے۔ جون ۱۹۶۷ء میں ہمیں چننے کا موقع میسر تھا۔ سینائی کے اطراف مصری افواج کا اجتماع اس بات کا ثبوت نہ تھا کہ ناصر بس اب حملہ کیا ہی چاہتا ہے۔ ہمیں اپنے ساتھ دیانت داری برتنی چاہیے۔ اس پر حملے کا فیصلہ ہمارا تھا۔

''جہاں تک ۱۹۸۲ء کے گیلیلی برائے امن آپریشن کا سوال ہے تو یہ حقیقت میں ان جنگوں کی فہرست میں نہیں آتا جن کا کوئی متبادل نہ تھا۔ ہم اپنے شہریوں کا میتلہ اور قریاتِ شمعونہ اور نہاریہ میں زخمی ہوتے دیکھنا جاری رکھ سکتے تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ ایسی باتیں مملکت کی زندگی کو داؤ پر نہیں لگاتیں۔''

فریب ''آپ نے جو کچھ بھی اخبارات اور جرائد میں جنگ لبنان کے بارے میں پڑھا ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ جو آپ نے ٹی وی پر دیکھا اور سنا ہے... اس کا بیشتر حصہ مبنی برحقیقت نہیں ہے۔'' (مارٹن پیریز ''دی نیوری پبلک'' کا ناشر ۱۹۸۲ء)

حقیقت:

اسرائیل کا ۱۹۸۲ء میں لبنان پر حملہ مشرق وسطیٰ کی وہ پہلی جنگ تھی جو اپنی تمام تر وحشت ناکی سمیت ٹی وی پر دکھائی گئی۔ اسرائیلی دستوں کی روزانہ گولہ باری کی پکچر رپورٹوں نے عالمی احتجاج کھڑا کر دیا۔ امریکہ میں اسرائیلی حمایتیوں نے فوراً کمر کسی اور اور یہ کہنا شروع کیا کہ اس تمام مصیبت کا ایک روشن پہلو بھی ہے۔ سابقہ سکریٹری آف اسٹیٹ ہنری کسنجر نے اعلان کیا کہ اس حملے سے امریکہ کے لیے تمام مشرق وسطیٰ میں ایک فعال امریکی سفارت کاری کے لیے غیر معمولی مواقع پیدا ہو گئے ہیں۔ اقوام متحدہ میں سابق امریکی سفیر آرتھر گولڈ برگ کا کہنا تھا کہ خودمختاری کے معاہدہ کی جلد از جلد

تکمیل اب ممکن ہے۔ مؤرخ محترمہ باربرا ٹچ مین کا کہنا تھا کہ اسرائیل کے لیے اور کوئی راستہ ہی نہ تھا کیونکہ عربوں کے عمل پر اسرائیل کا کنٹرول نہ تھا۔ بقول اس کے جس امر کی سب سے زیادہ تشویش تھی وہ ''اسرائیل اور منتشر یہودیوں کے مستقبل اور بقاء کا سوال تھا... میں بھی اس میں شامل ہوں!''

جوں جوں اسرائیل کے خلاف عالمی صدائے احتجاج بلند ہوتی گئی توں توں اسرائیلی حمایتیوں نے ذرائع ابلاغ کے خلاف ایک شدید مہم شروع کی۔ اسرائیلی فوج کے ریڈیو نے نیویارک ٹائمز کے نام ایل فرائڈ مین کو ''اپنے سے نفرت کرنے والا یہودی'' قرار دیا۔ ''نیوری پبلک'' (یہودی جریدہ) نے ذرائع ابلاغ کو اسرائیل مخالف قرار دیا "Penthouse" کے ایک شمارے میں قارئین سے دریافت کیا گیا کہ امریکی صحافی اسرائیل کے خلاف بھرے ہوئے ہجوم میں کیوں اس قدر جوش و خروش سے شامل ہورہے ہیں؟ موقر عبرانی روزنامے ''الارض'' نے ایک طویل مضمون بعنوان ''ذرائع ابلاغ نے اپنا ضمیر پی۔ ایل۔ او کو فروخت کردیا ہے'' شائع کیا۔ ایک امریکی نژاد اسرائیلی نے کتاب لکھ کر دعویٰ کیا کہ بیروت میں مغربی صحافی مسلمان ٹھگوں کے ہاتھوں دہشت زدہ ہیں اور عادتاً اور ارادتاً اسرائیل کو بدنام کرنے کی سازش میں ملوث تھے۔ یو۔ این۔ میں سابقہ امریکی سفیر جین کرک پیٹرک نے اعلان کیا کہ واقعات کی رپورٹنگ اسرائیل کے غیر موافق تھی۔

پریس کو شیطان گرداننے کے علاوہ اسرائیلی حمایتیوں نے اس کی حرکتوں پر پردہ ڈالنے کے لیے اور بھی کئی طریقے اختیار کیے۔ اقوام متحدہ کے انسانی حقوق کمیشن کے ایک سابقہ امریکی نمائندے مورس۔ بی۔ ابرام[1] نے یہ کہہ کر اسرائیلی حرکتوں کا جواز پیدا کرنے کی کوشش کی یہ مغرب کی ظالمانہ کارروائیوں ہی کی مانند ہیں۔ ڈریسڈن، جرمنی اور نارمنڈی/فرانس میں دوسری عالمی جنگ کے دوران معصوم جانوں کے ضیاع کی اخلاق ذمہ داری سب سے پہلے ان پر عائد ہوتی ہے جنہوں نے دہشت گردی شروع کی نہ کہ ان پر جنہوں نے اسے ختم کیا اور لبنان میں بھی ایسا ہی ہے۔ اس کے خیال میں یہ جنگ کبھی نہ ہوتی اگر عرب حکومتیں فلسطینی مہاجرین کو پھر سے بسا دیتیں۔

صہیونی مصنف نارمن پوڈ حاریض اور چند دیگر لوگوں کے علاوہ ویت نام کی پُرزور مخالف جین فونڈا کو بھی اسرائیلی حملہ کی مخالفت میں Anti-Semitism کی بو آئی! پوڈ حاریض کا استدلال تھا کہ حملہ کے نکتہ چیں ''یہودیوں کو اپنے دفاع کے حق سے محروم کررہے تھے... یہ وہی پرانی Anti-Semitism ہے جسے نئے عالمی سانچوں میں ڈھال لیا گیا ہے۔''

بعد از جنگ ایک گروپ نے جو اپنے آپکو "امریکی برائے محفوظ اسرائیل" پکارتا تھا، .N.B.C پر دباؤ ڈالا کہ اس نے صحیح طور پر عکاسی نہیں کی تھی۔ اس گروپ نے ایک دستاویزی فلم بنام "لبنان میں .N.B.C" بنائی۔ جس کا ذیلی عنوان تھا "ذرائع ابلاغ کے گمراہ کن پروپیگنڈہ کا مطالعہ" انہوں نے ایک مونوگراف بھی شائع کیا جس کا عنوان تھا "لبنان میں این بی سی کی جنگ مسخ کر دینے والا آئینہ۔" اس میں اس نیٹ ورک پر کیچڑ اچھالا گیا تھا۔ بعد ازاں امریکن براڈ کاسٹنگ کارپوریشن کے نیٹ ورک پر بھی نزلہ گرا۔ ایک اور اسرائیل نواز گروپ اس جنگ کے بعد اُبھرا۔ اس کا نام 'کمیٹی برائے صحیح مشرقِ وسطیٰ رپورٹنگ' تھا۔ اس نے بالٹی مور/میری لینڈ کے پندرہ ریڈیو اسٹیشنوں کو وہ اشتہار چلانے سے روکنے میں کامیابی حاصل کی جس میں اسرائیل کو امداد دینے کی مخالفت کی گئی تھی۔ اس اشتہار کی قیمت نیشنل ایسوسی ایشن آف عرب امریکیوں نے ادا کی تھی۔

آخر ذرائع ابلاغ کی رپورٹنگ کے خلاف اس قدر مبالغہ آمیز ردِعمل کیوں؟

"ٹائمز آف لندن" کے ایک کہنہ مشق صحافی رابرٹ فسک کے بقول جو لبنان پر اس اسرائیلی حملے کے دوران ہمہ وقت بیروت میں رہا، اس ہذیانی عمل کی وجہ یہ تھی کہ ۱۹۸۲ء کے حملہ نے دنیا بھر کو یہ دکھلا دیا کہ جنگ کے دوران اسرائیلی فوج بھی وہی کچھ کرتی ہے جو دوسری افواج۔ فرق صرف یہ تھا کہ ۱۹۸۲ء میں یہ اولین موقع تھا کہ نامہ نگاروں کو کسی مشرقِ وسطیٰ جنگ میں عرب فریق تک کھلی رسائی حاصل تھی۔ انہوں نے دیکھا کہ اسرائیل کی خود ساختہ ناقابلِ شکست فوج اپنی اعلیٰ اخلاقی برتری اور دہشت گردی کے خلاف واضح فوجی مقاصد کا تعین ہونے کے باوجود اس طرح نہ لڑی جیسا کہ اُن کے داستان گو ہمیں بتلاتے آئے تھے۔ ہزاروں شہریوں کو انہوں نے ہلاک کیا، اپنی حرکات کے بارے میں جھوٹ بولا اور پھر اپنے حمایتی ملیشیا کو کیمپ کے اندر نہتے مہاجرین کا قتل عام کرتے ہوئے دیکھتے رہے۔ درحقیقت وہ خود عین اسی طرح کا غیر مہذبانہ برتاؤ کرتے رہے جس کا وہ پچھلے تیس برس سے عرب افواج پر الزام لگاتے تھکتے نہ تھے!



باب: ۱۰

لیکڈ حکومتیں

۱۹۷۷ء میں مناخم بیگن کی سربراہی میں لیکڈ (اتحاد) حکومت کا ظہور اسرائیل کی سیاست اور پالیسیوں میں ایک زلزلہ کی مانند تھا۔ بیگن نے اس فتح سیڈیوڈ بن گوریان کی سوشلسٹ لیبر پارٹی کو نکال باہر کیا تھا جو ۱۹۴۸ء سے اسرائیل پر حکومت کررہی تھی۔ بیگن نے اس کو نظر ثانی شدہ صیہونیت سے تبدیل کر دیا تھا۔ یہ صیہونیت کی قابل عمل اور لادینی سواد اعظم پر افلاطونی قوم پرستی کی فتح تھی۔ لیکڈ (اتحاد) پارٹی ۱۹۷۷ء سے ۱۹۹۲ء تک چھائی رہی۔ ماسواء ۱۹۸۴ء سے ۱۹۸۸ء کے چار سالوں میں جب اسے لیبر پارٹی سے شراکت کرنی پڑی۔

فریب ''یہودی قوم کا ارضِ اسرائیل پر حق ازلی اور غیر متنازعہ ہے۔''

(لیکڈ پارٹی کا مینی فیسٹو ۱۹۷۳ء)

حقیقت:

کئی دہائیوں سے افلاطونی صیہونیت اور قابل عمل لادینی صیہونیت کے دوعلمبرداروں، یعنی ڈیوڈ بن گوریان اور مناخم بیگن کے درمیان شدید کشمکش چلی آرہی تھی۔ گوریان ان نظر ثانی والوں کو نازی کہتا اور بیگن کا موازنہ ہٹلر سے کرتا۔ بیگن اور اس کے حامی گوریان کو یہودی عزائم کا غدار قرار دیتے۔ لیبر پارٹی کے اہلکار ایک نرم اور مفاہمت پرست صیہونیت کا پرچار کرتے... گو وہ خود بھی ہمیشہ اس پر عمل نہ کرتے تھے... اور انہیں ۱۹۴۷ء کی تقسیم فلسطین منظور تھی۔ وہ یو این قرارداد نمبر ۲۴۲ کے مطابق رقبہ کے عوض امن فارمولے پر بھی یقین رکھتے تھے جب کہ لیکڈ پارٹی ایسی کسی مطابق رقبہ کے عوض امن فارمولے پر بھی یقین رکھتے تھے جب کہ لیکڈ پارٹی ایسی کسی بات کی روادار نہ تھی۔ ان کے ایمان کا مرکزی نقطہ اور راہنما اصول صرف ارض اسرائیل پر یہودیوں کا دعویٰ تھا۔

عبرانی زبان میں ارض اسرائیل کا مطلب ''اسرائیل کی سرزمین'' ہے۔ یہ محاورہ یہودیوں میں طاقتور قومی اور افلاطونی جذبات کو ابھارتا ہے۔ گویا تمام فلسطین کے علاوہ اردن پر بھی یہودی حکمرانی کا

حق رکھتے ہیں۔ ان نظر ثانی یا اصلاح مکرر کرنے والوں کے نزدیک دریائے نیل اور فرات کے درمیان سارے علاقہ پر یہودیوں کا حق ہے۔

یہ ارض اسرائیل یا دوسرے لفظوں میں ''عظیم تر اسرائیل'' لیکڈ کے پہلے دونوں وزراء اعظم مناخم بیگن اور یتزاق شامیر کا سب سے زیادہ من پسند عقیدہ تھا۔ یہی لیکڈ پارٹی کی فلاسفی کا عطر تھا۔ یہ دونوں حضرات پولینڈ کے باشندے تھے اور ۱۹۴۸ء سے قبل فلسطین میں یہ دونوں الگ الگ یہودی دہشت گرد گروپوں کے لیڈر تھے۔ دونوں ہی ولاڈی میر جے بوٹنسکی کے مرید تھے جس کا نعرہ تھا ''خون اور عظمت'' اور یہی اصلاحی صہیونیت تھی۔ ان دونوں نے اپنی زندگی سارے فلسطین پر کنٹرول قائم کرنے کی جدوجہد میں گزاری۔ دونوں نے ۱۹۴۷ء کے یو این تقسیم فلسطین پلان کو مسترد کیا تھا کیونکہ اس میں سارا یہودیوں کے حوالے نہ کیا گیا تھا۔

جیسا کہ بیگن نے ۱۹۴۷ء میں کہا ''ہمارا موروثی وطن ناقابل تقسیم ہے۔ اسے ٹکڑے ٹکڑے کرنا صرف نامعقول ہی نہیں بلکہ مجرمانہ فعل ہے جو بھی اس سارے وطن پر ہمارا حق تسلیم نہیں کرتا وہ اس کے کسی چھوٹے سے حصے پر بھی ہمارا حق تسلیم نہیں کرتا۔'' بقول اس کے ''ہم اپنے وطن کی تقسیم کو کبھی بھی قبول نہ کریں گے۔'' بیگن کی دہشت گرد تنظیم ارگن کا نشان اور نعرہ تھا ''اردن کے دونوں طرف'' یعنی یہودیوں کے پورے فلسطین اور اردن پر دعویٰ کی طرف اشارہ تھا۔ بیگن نے کبھی بھی اس ہوس سے روگردانی نہیں کی۔

> **فریب** ''بعض اسرائیلی تبصرہ نگاروں نے یہ پیشین گوئی کی تھی کہ اس نئے (اتحاد) بلاک کا ظہور بیگن کے اقتدار کے انجام کا آغاز ثابت ہوگا۔'' (بیگن ۱۹۸۴ء مصنفہ ایرک سلور)

حقیقت:

عام خیال کے برعکس اسرائیل میں بیگن کی توسیع پسندانہ پالیسیوں کے لیے کافی حمایت پائی جاتی تھی۔ ۱۹۷۳ء میں دائیں بازو کی کئی پارٹیوں کا ادغام کر کے لیکڈ (اتحاد) بلاک کے ملغوبے کا ظہور چار سال بعد اس کے اقتدار میں آنے کا باعث بنا۔ اس میں بیگن کی حروط پارٹی کو کلیدی کردار ملا تھا۔ بیگن کی طرح یہ لیکڈ اشتراک بھی کھلے۔ عام اس بات کی حمایت کرتا تھا کہ ۱۹۶۷ء کے مفتوحہ علاقے واپس نہ ہونے چاہئیں۔ ۱۹۷۳ء کے لیکڈ مینی فیسٹو کا اعلان تھا ''اسرائیل کی حکومت کو سارا جودی اور غزہ کی پٹی پر حکومت کرنے کا حق حاصل ہے۔ وقت گزرنے پر اسرائیل یہ استحقاق جتلائے گا اور

اسے حاصل کرنے کی کوشش کرے گا۔ ہمارے ارضِ اسرائیل کے کسی بھی مغربی حصے کو دوسروں کے حوالے کرنے کا پلان... جیسا کہ لیبر والے کہتے ہیں!... ہمیں اس ملک کے حق سے محروم کرنے کے مترادف ہے۔" اس میں مغربی ارض اسرائیل کے الفاظ سے مغربی کنارے کی طرف اشارہ سے گویا اس بات کا اظہار مختصر نویسی کی شکل میں کیا گیا تھا کہ لیکڈ اردن پر بھی حق جتاتے ہیں۔

۱۹۷۷ء اور ۱۹۸۳ء کے درمیان سوا چھ سال بیگن کی حکومت رہی۔ یہ اس کے پرانے حریف گوریان کو چھوڑ کر سب سے زیادہ تھی، بیگن نے اپنے سارے دورِ اقتدار میں اپنی تمام تر توانائیوں کو اس بات پر صرف کیا کہ وہ یہودیوں کو ان کا سارا قدیم وطن دلوائے۔

جب بیگن نے حکومت سنبھالی تو تقریباً ۷۰۰۰۰ یہودی مقبوضہ مشرقی یروشلم اور تقریباً ۷۰۰۰ ان ۴۵ نوآبادیوں میں رہتے تھے جو مقبوضہ علاقے میں بسائی گئی تھیں۔ (لگے ہاتھوں یہ بھی جان لیں کہ یہ اس بات کی قوی شہادت ہے کہ لیبر پارٹی بھی نوآبادیاں بسانے کی مخالف ہرگز نہ تھی۔ اس کے اہلکار صف زیادہ دروغ گوئی سے اپنے اہداف کو بیان کرتے تھے!) جب چھ سال بعد بیگن نے استعفیٰ دیا تو مغربی کنارے میں ۱۱۲ یہودی نوآبادیاں تھیں اور غزہ کی پٹی میں پانچ جب کہ جولان ان کی پہاڑیاں اور مشرقی یروشلم کو سرکاری طور پر اسرائیل میں مدغم قرار دیا جا چکا تھا۔ یہودی آبادکاروں کی تعداد چالیس ہزار سے زائد تھی جس میں مشرقی یروشلم کے تقریباً ایک لاکھ یہودی باشندے شامل نہیں۔

بیگن سے ایک مرتبہ سوال کیا گیا کہ وہ تاریخ میں کس کارنامے کی بناء پر یاد کیا جانا پسند کرے گا تو اسکا جواب تھا "ارض اسرائیل کی سرحدوں کو ابد تک قائم کر جانے والا شخص!" بیگن کے سب سے زیادہ جاننے والے سوانح نگار ایرک سلور کا کہنا ہے "اسکی سب سے بڑی ترجیح یہودی قوم کو دریائے اردن کے مغرب میں ان کا سارا قدیم وطن دلوانا تھی۔ جب وہ ریٹائر ہوا تو اس کے مخالف بھی قائل ہو چکے تھے کہ اب تقسیم پلان والی سرحدوں کو اس سے بڑا اور اس سے زیادہ اعتماد رکھنے والا لیڈر ہی واپس لا سکے گا... مناخم بیگن نے اپنے پرتو میں جو اسرائیل قائم کیا وہ کٹر یہودی، زیادہ جارحانہ اور بالکل الگ تھلک تھا۔"

فریب "جنہیں بھی اسرائیل کی امن حاصل کرانے کی کوششوں کے سلسلے میں قربانی دینے اور آمادگی پر شک ہے... تو وہ اسرائیل کو آزما لیں۔" (موشے آراد، امریکہ میں اسرائیلی سفیر ۱۹۸۸ء)

حقیقت:

۱۹۸۳ء میں جب یتزاق شامیر نے مناخم بیگن کی جانشینی سنبھالی تو اس نے اپنی افتتاحی تقریر

میں مغربی کنارے پر نوآبادیاں بسانے کے متبرک کام کو جاری رکھنے کا مصمم ارادہ ظاہر کیا۔ شامیر نے اپنا وعدہ پورا کر دکھایا۔ اس نے مقبوضہ علاقوں میں یہودی بستیاں بسانے کے کام کو بے حد تیز کر دیا۔ یہ اسرائیل کی تاریخ میں عظیم ترین آبادکاری تھی۔

۱۹۷۲ء میں جب شامیر کو شکست ہوئی تو اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کی ایک رپورٹ کے بموجب اس کے عہد حکومت میں نوآبادکاروں کی تعداد دگنی ہو چکی تھی۔ عرب مشرقی یروشلم میں ۱۵۵۰۰۰ فلسطینیوں کے مقابلے میں ۱۲۹۰۰۰ یہودی تھے۔ مغربی کنارے کی ۱۸۰ نوآبادیوں میں ۹۷۰۰۰ یہودی آباد تھے جب کہ آدھا علاقہ یہودیوں کے مکمل کنٹرول میں تھا۔ غزہ کی پٹی پر ۲۰ بستیوں میں ۳۶۰۰ یہودی تھے اور جولان کی پہاڑیوں پر ۳۰ بستیوں میں ۱۴۰۰۰ یہودی آباد تھے۔

شامیر کو عین اس وقت شکست ہوئی جب وہ مقبوضہ علاقوں میں عظیم ترین تعمیراتی مہم میں مشغول تھا۔ اسرائیل کے ایک گروپ ''امن ابھی!'' کے ایک مطالعہ نے یہ ظاہر کیا کہ اسرائیل میں اس وقت (۱۹۹۱ء میں) ۱۳۶۵۰ رہائشی یونٹ زیر تعمیر تھے جو کہ پچھلے ۲۳ برسوں میں تعمیر ہونے والی مجموعی رہائشی یونٹوں کا ۶۵ فیصد کے برابر تھے! اس میں وہ ۱۰۰۰۰ رہائشی یونٹ شامل نہیں جو عرب مشرقی یروشلم میں زیر تعمیر تھے۔ بقول واشنگٹن پوسٹ ''پچھلے ۱۸ مہینوں میں شامیر حکومت نے جو عظیم ترین منصوبہ شروع کیا ہے وہ اس علاقے کی چوبیس سالہ دورِ حکومت میں اپنی مثال نہیں رکھتا۔''

لیکڈ لیڈروں کے ''علاقہ برائے امن'' کے بارے میں رویہ کا اظہار ۱۹۹۲ء میں شامیر کے دوسری بار حکومت کے لیے انتخابات میں شکست کھانے کے بعد اس بیان سے ہوتا ہے۔ ''میں حق خود اختیاری کے مذاکرات کو دس سال تک کھینچتا۔ تب تک سماریہ/ جودیہ یعنی مغربی کنارہ میں ہم پانچ لاکھ کی تعداد حاصل کر چکے ہوتے۔'' شامیر نے اپنی حکومت مکرر کی مہم شروع ہی اس اعلان سے کی تھی کہ وہ غیر یہودی دنیا پر یہ واضح کر دینا چاہتا ہے کہ مقبوضہ علاقوں میں نوآبادیاں بسانے کے کام کو روکنا کسی کے بس میں نہیں!

لیکڈ وزرائے اعظم کے اس دور میں مقبوضہ علاقوں میں یہودی نوآبادکاروں کے بسانے میں جو تیزی دکھائی گئی اس نے فلسطینیوں اور اسرائیل کے درمیان جھگڑے کو اور بھی پیچیدہ تر بنا دیا ہے۔ اگر امن حاصل کرنا ہے تو اسرائیل کو مقبوضہ علاقہ فلسطینیوں کو واپس کرنا ہوگا۔ اب جب کہ دسیوں ہزار یہودی باشندے فلسطینی علاقوں میں آباد ہیں تو یہ اہم امر اور بھی مشکل ہوگا۔

❄ ❄

حصہ دوم

تصادم اور ملی بھگت

باب: ۱۱

انتفاضہ

انتفاضہ... ''نجات پانے'' کا عربی... ۹/دسمبر ۱۹۸۷ء کو غزہ کی پٹی پر شروع ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے مغربی کنارے تک پھیل گیا۔ اس میں وہ تمام سترہ لاکھ فلسطینی شامل ہوگئے جو ۱۹۶۷ء سے اسرائیلی مقبوضہ علاقہ میں رہتے تھے۔ اس شعلہ کو تیلی دکھانے کا کام ۸/دسمبر کو اسرائیلی فوجی ٹرک نے انجام دیا جو جبلیہ رفیوجی کیمپ کے نزدیک فلسطینیوں کے گروپ پر چڑھ دوڑا۔ چار افراد ہلاک اور سات زخمی ہوئے۔ غزہ کی پٹی میں ایک یہودی سیلز مین کو چھرا گھونپ کر ۶/دسمبر کو ہلاک کردیا گیا تھا اور فلسطینیوں کو شک تھا کہ یہ حادثہ اتفاقیہ نہ تھا۔ شاہدوں کا خیال تھا کہ فلسطینیوں کا اقدام بھی ماہ گذشتہ کے دو ڈرامائی واقعات کا ردِّعمل تھا۔ اول ایک فلسطینی گوریلے نے تن تنہا ایک دستی گلائیڈر سے حملہ کر کے چھ اسرائیلی فوجی ہلاک کردیے تھے اور دوم عرب لیگ کی عمان میں جو سربراہ کانفرنس ہو رہی تھی اس میں عرب ریاستوں کے فلسطین کے لوگوں کی حالت زار پر ہمدردی کے فقدان سے!

حیرت کی بات تو یہ ہے کہ انتفاضہ میں مقابلہ بھاری طور پر مسلح اسرائیلی فوجیوں اور ان ہزاروں جوان، بچوں اور عورتوں کے درمیان ہوتا ہے جو صرف پتھروں سے مسلح ہوتے ہیں۔ اسرائیل جس وحشیانہ طریقہ سے اس بغاوت کو کچلنے کی کوشش کر رہا ہے اس سے ہزاروں جانیں جا چکی ہیں اور اس کی دنیا بھر میں بڑے پیمانے پر مذمت کی جا چکی ہے۔

موجودہ تاریخ یعنی مارچ ۱۹۹۳ء تک یہ انتفاضہ تا حال جاری ہے!

فریب ''ہمارے خیال میں اسرائیل کا واضح طور پر یہ حق ہی نہیں بلکہ ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ مقبوضہ علاقوں میں امن و امان قائم و دائم رکھے اور اس مقصد کے لیے مناسب قوت کا استعمال کرے۔'' (رچرڈ شفلر، نائب سکریٹری آف اسٹیٹ برائے انسانی حقوق ۱۹۸۸ء (امریکہ)

حقیقت:

اسرائیل اب تک اس فلسطینی شورش کو دبانے کے لیے ہزاروں نہیں بلکہ دسیوں ہزاروں فلسطینیوں کو ہلاک، زخمی، اپاہج، قید، اذیت میں مبتلا اور دیس نکال دے چکا ہے۔ ۱۹۹۱ء میں جب اس شورش کا پانچواں سال شروع ہوا تو یروشلم اور شکاگو کے فلسطینی حقوق انسانی کمیشن نے مندرجہ ذیل مجموعی اعداد و شمار مہیا کیے۔ ۹۹۴ فلسطینی اسرائیلی فوج کے ہاتھوں ہلاک ہوئے۔ ۱۱۹۳۰۰ زخمی ہوئے۔ ٦٦ کو ملک بدر کیا گیا۔ ۱٦۰۰۰ کو انتظامی قید میں رکھا گیا۔ ۹۴۸۳۰۰ ایکڑ زمین ضبط کی گئی۔ ۲۰۷۴ گھر منہدم یا سیل بند کر دیے گئے۔ دس ہزار دن بھر کے کرفیو (۲۴ گھنٹے) ان علاقوں میں نافذ کیے گئے جہاں دس ہزار سے زائد نفوس آباد تھے اور بارہ ہزار درخت جڑ سے اکھاڑ دیے گئے۔

ان شورشوں کے بارے میں اعداد و شمار متنازعہ امور میں شامل ہیں لیکن اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ (امریکہ کے محتاط اندازے کے مطابق کم از کم ۱۳۰ افراد انتفاضہ کے ان چار برسوں میں اسرائیلی فوج کے ہاتھوں ہلاک ہوئے۔

انتفاضہ کو دبانے میں اسرائیلی کوششوں کے وحشی پن کو وزیر دفاع یتزاق رابن نے پہلے ہی فاش کر دیا تھا۔ ۱۹؍جنوری ۱۹۸۸ء کو اس نے ''ہڈی توڑ'' پالیسی کا اعلان کیا تھا۔ بقول اس کے اسرائیل اس شورش کو فرو کرنے کے لیے ''طاقت، قوت اور مکوں'' کا استعمال کرے گا۔ وزیراعظم شامیر کا کہنا تھا: ''اب ہمارا کام اسرائیلی افواج اور فلسطینیوں کے درمیان خوف کی دیوار دوبارہ کھڑی کرنا ہے۔ ہم اس علاقہ میں آباد عربوں کے دلوں میں موت کی دہشت بٹھا دینا چاہتے ہیں تاکہ وہ ہم پر حملوں سے باز رہیں۔''

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فروری ۱۹۸۸ء میں ہنری کسنجر (سابقہ سکریٹری آف اسٹیٹ) کی نیویارک میں یہودی لیڈران کے ایک نجی گروپ کو دی گئی نصیحت کو اسرائیلی حکومت نے پلے باندھ لیا تھا۔ نیویارک ٹائمز نے لکھا تھا کہ کسنجر نے اسرائیل کو تجویز دی تھی کہ وہ انتفاضہ کو جس قدر جلد ممکن ہو... مکمل طور پر جڑ سے اکھاڑ پھینکے۔ اس میں رحم اور دیر کی گنجائش نہیں۔ اس بغاوت کا سر فوراً کچل دینا چاہیے۔ اس کا پہلا قدم جنوبی افریقہ کی مانند ٹی وی کو یک بینی و دوگوش نکال باہر کرنا ہے۔ یقیناً اس پر بین الاقوامی احتجاج ہوگا لیکن تھوڑے عرصے بعد یہ معدوم ہو جائے گا... اعتدال سے کام لے کر ہارنے والوں کو کوئی انعام نہیں ملتا!

اس شورش کو کچلنے میں اسرائیلی فوج بوڑھوں، عورتوں اور بچوں کو گھیر کر پیٹنے میں خاص دلچسپی کا

مظاہرہ کرتی ہے۔ غزہ کی پٹی میں یو۔ این۔ کی ریلیف اور ورکس ایجنسی کی ایک قائم مقام ڈائریکٹر انجلا ولیمز نے شروع میں ہی کہا تھا کہ لوگوں کو وحشیانہ طور پر مار پیٹ کرنے کی شہادتیں دیکھ کر ہمیں گہرا دکھ پہنچا۔ خاص طور پر بوڑھے لوگوں اور عورتوں کی مار پیٹ نے ہمیں بہت دکھیا کیا... فورڈ فاؤنڈیشن کے خرچے پر کی جانے والی تحقیق جو سویڈن کی "بچوں کو بچاؤ فنڈ" نے کی ۱۹۹۰ء کے وسط میں رپورٹ دی کہ اسرائیلی دستے فلسطینی بچوں کے خلاف بلا لحاظ اور بار بار شدید تشدد کا ارتکاب کرتے تھے۔ بقول اس کے پہلے دو سال کے دوران دس سال اوسط عمر کے ۱۵۹ بچے ہلاک کئے جا چکے تھے۔ ۶۵۰۰ فائرنگ سے زخمی ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ انتفاضہ کے پہلے دو سال کے دوران پینتیس سے اڑتالیس ہزار دوسرے بچے (جن میں ۴۰ فیصد دس سال سے کم عمر تھے) مرہم پٹی کے محتاج تھے۔

اسرائیل کا یہ دعویٰ کہ انتفاضہ ناجائز قبضہ کے خلاف غصہ کے اظہار کا نتیجہ نہیں بلکہ خارجی قوتوں کے دخل در معقولات کی وجہ سے ہے، بالکل جھوٹ ہے۔ ان دنوں ٹامس ایل فرائیڈ مین اسرائیل میں بطور نیویارک ٹائمز مراسلہ نگار کے تعینات تھا۔ اسے ۱۹۸۲ء کے لبنان پر اسرائیلی حملے اور ۱۹۸۷ء کے اسرائیلی حالات رپورٹ کرنے پر پولٹرز انعامات سے نوازا جا چکا تھا۔ اس شورش کے آغاز ہی میں اس نے لکھا کہ پچھلے دو ہفتوں کی اسرائیل/فلسطینی جھڑپوں نے یہی ظاہر کیا ہے کہ یہاں پہلے ہی سول وار... یعنی خانہ جنگی... جاری ہے۔ صرف اس لیے کہ فلسطینی یا اسرائیلی ہر ہفتے اتنی زیادہ تعداد میں ہلاک نہیں ہو رہے۔ اس بات کو ثابت نہیں کرتا کہ ہمہ وقت جنگ موجود نہیں۔ پچھلے تین سالوں میں شاذ ہی ایسا ہفتہ گزرا ہوگا جب کوئی نہ کوئی فلسطینی یا اسرائیلی مارا گیا یا زخمی نہ ہوا ہو۔

یو۔ این۔ کے انڈر سکریٹری جنرل برائے خصوصی سیاسی معاملات مراق گولڈنگ نے ۱۹۸۸ء کے اوائل میں ان علاقوں کا دورہ کرنے کے بعد رپورٹ پیش کی کہ پچھلے چھ ہفتوں کی بے چینی اس مقبوضہ علاقے کے لوگوں کی ناامیدی اور لاچاری کے جذبات کی عکاس ہے۔ ان میں نصف سے زائد لوگ صرف ایک ایسے قبضہ کو جانتے ہیں جو ان کے مسلمہ حقوق کو غصب کئے بیٹھا ہے۔

فریب "اسرائیل کے غربی کنارہ (سامیہ، جوڈیہ) اور غزہ کی پٹی کی انتظامیہ کو عام طور پر نرم خیال کیا گیا ہے۔" (AIPAC ۱۹۸۹ء)

حقیقت: اسرائیل نے ۱۹۶۷ء میں جو علاقے قبضہ میں کئے وہاں نرمی کے کوئی آثار نہیں۔ شباق یعنی اسرائیلی خفیہ پولیس... جو پہلے "شن بط" کہلاتی تھی... بے حد منظم طریقہ سے فلسطینی

باشندوں کے حقوق کو پائمال کرتی ہے۔ شباق کو مقبوضہ علاقہ پر کلی اور مکمل اختیار حاصل ہے۔ اس کے ہراس کرنے کا ایک سب سے موثر طریقہ یہ ہے کہ عام زندگی کے معمولات کے لیے کسی فلسطینی باشندہ کو مقبوضہ علاقے میں پرمٹ دیا جائے یا نہیں۔ یہ اختیار اسے حاصل ہے۔ پہلی نظر میں تو یہ ایک نرم معاملہ لگتا ہے۔ لیکن مقبوضہ علاقے کی اسرائیلی انتظامیہ کے اہلکاروں نے ایسے پرمٹوں کے اجراء کو نوکر شاہی ہراسانی کے ایک آرٹ میں تبدیل کر رکھا ہے۔

واشنگٹن پوسٹ کی رپورٹ کے بموجب اسرائیلی حکام اس نظام کو مقبوضہ علاقے کے فلسطینیوں کی زندگی اجیرن بنانے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ ایک ممتاز وکیل جو ناتھن قطب کے بقول:

''اس پورے نظام کا بنیادی مقصد عوام کو کچل کر رکھ دینا ہے۔ ان کی مزاحمت کو کچل دینا ہے۔ انہیں یہ باور کرنے پر بذریعہ طاقت مجبور کر دینا ہے کہ وہ چاہے کچھ بھی کرلیں یہ نظام ان پر حاوی ہے اور ان کو حقوق سے محروم رکھ سکتا ہے۔''

یہ ہمہ جہت پرمٹ سسٹم ۱۹۸۸ء کے اوائل میں بروئے کار لایا گیا اور تب سے ہی اس نے فلسطینیوں کی زندگی کو اجیرن کر رکھا ہے۔ اس نظام کا مرکزی نکتہ وہ ایک صفحے کا فارم ہے جسے ''جوڈیا اور سماریہ سول ایڈمنسٹریشن درخواست برائے اجازت نامہ کا عنوان دیا گیا ہے۔ ۱۹۸۸ء سے فلسطینیوں کو اپنے ۲۳ مختلف نوعیت کے کام کرنے کے لیے یہ فارم بھر کر دینا پڑتا ہے۔ ان میں کار کو رجسٹر کروانے سے لے کر ایک نئی فیکٹری لگانے تک جیسے کام شامل ہیں۔ یہ تمام عمر کے لوگوں کے لیے لازم ہے اور اس میں نوزائیدہ بچوں کی پیدائش کا اندراج۔ اسکول میں داخلے، ٹیلیفون لگوانے، پنشن حاصل کرنے، بیرون ملک سفر کرنے اور تدفین کے لیے جگہ حاصل کرنے جیسے روزمرہ کے کام شامل ہیں۔

یہ اجازت نامہ سات مختلف اور دور دور بکھرے ہوئے اسرائیلی دفاتر سے منظور کروانا پڑتا ہے جہاں گھنٹوں لمبی قطاروں میں کھڑا ہونا پڑتا ہے۔ درخواست گزاروں کو یہ ثابت کرنا پڑتا ہے کہ ان پر کسی قسم کے بقایا جات واجب نہیں ہیں۔ اس میں ٹریفک چالان اور غیرادا شدہ ٹیکس شامل ہیں۔ واشنگٹن پوسٹ کے ایک مراسلہ نگار جیکسن ڈاہل کا کہنا ہے کہ فلسطینیوں کے لیے روزمرہ زندگی کی جنگ کا مطلب ڈرائیونگ لائسنس کے لیے نام درج کروانا یا پیدائش کا سرٹیفکیٹ حاصل کرنا جیسے معمولی کاموں کے لیے نصف درجن سے زائد سرکاری دفاتر کے کئی ہفتوں پر محیط ضابطے کی کارروائیوں کے لیے چکر لگانا ہے۔ ان دفاتر میں مقامی اور ضلعی ٹیکس آڈٹ دفتر بھی شامل ہیں۔

فوجی قبضہ کے خلاف یہ فلسطینیوں کی مکمل مایوسی اور غصہ کا جذبہ ہی تھا جس نے اس بھس میں چنگاری کا کام دیا۔ دنیا بھر کی انسانی حقوق تنظیموں نے خاص طور پر ان اسرائیلی ہتھکنڈوں کی بھرپور مذمت کی ہے جو اس نے شورش کو فرو کرنے کے لیے استعمال کیے۔ انفرادی شاہدوں، اقوام متحدہ کے کئی ممبران نے بار بار، حتیٰ کہ امریکہ تک نے مذمت کی! چند تنقیدی رپورٹیں درج ذیل ہیں:

یو۔این۔ گولڈنگ رپورٹ ۲۱رجنوری ۱۹۸۸ء

۱۹۸۸ء کے اوائل میں یو۔این۔ کے انڈر سکریٹری جنرل برائے خصوصی معاملات میں سیاسی مراق گولڈنگ نے تحقیقات سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ اسرائیل نے ''چوتھی جنیوا کنونشن برائے حفاظت شہری افراد بوقت جنگ'' مورخہ ۱۲راگست ۱۹۴۹ء کی خلاف ورزی کا مرتکب ہوا ہے۔ اس نے بڑے پیمانے پر انسانی حقوق کو پامال کیا ہے۔ اسرائیل نے خاص طور پر آرٹیکل نمبر ۳۳ کی خلاف ورزی کی ہے جو اجتماعی سزاؤں کے بارے میں ہے۔ آرٹیکل نمبر ۴۷ کے مطابق یروشلم کی حیثیت تبدیل کرنا منع ہے۔ آرٹیکل نمبر ۴۹ کی خلاف ورزی وہ فلسطینیوں کی ملک بدری کر کے اور مقبوضہ علاقوں میں نوآبادکاروں کی بستیاں بسا کر کر رہے ہیں اور آرٹیکل نمبر ۵۳ کی خلاف ورزی وہ املاک کی تباہی سے کر رہے ہیں۔ اس کے علاوہ آرٹیکل نمبر ۳۲ کی خلاف ورزی کے شواہد بھی موجود ہیں جو شہریوں کے ساتھ ظلم و جبر سے منع کرتا ہے۔

یورپین کمیونٹی رپورٹ ۸رفروری ۱۹۸۸ء

یورپین کمیونٹی کے بارہ ممبران نے اسرائیل کے درشت اقدامات کی مذمت کی ہے اور کہا ہے کہ ہم اسرائیل کے جابرانہ اقدامات کی شدید مذمت کرتے ہیں۔ یہ انسانی حقوق اور بین الاقوامی قوانین کی خلاف ورزی ہے۔ بقول ان کے ''اسرائیل کو یہ جابرانہ اقدام ختم کرنے ہوں گے''... انہوں نے اس بگڑتی ہوئی صورت حال پر انتہائی گہری تشویش کا اظہار کیا ہے۔

فزیشنز برائے حقوق انسانی رپورٹ... ۱۱رفروری ۱۹۸۸ء

بوسٹن کے ایک آزاد مانیٹرنگ گروپ نے جو چار امریکی ڈاکٹروں پر مشتمل تھا... تین ہارورڈ سے

اور ایک نیویارک کی سٹی یونیورسٹی سے... اپنی مقبوضہ علاقوں کی ہفتہ بھر کی یاترا کے بعد کہا کہ اسرائیل نے اپنی پولیس اور فوج کے ذریعے بے لگام تشدد کا بازار گرم کر رکھا ہے۔ ان ڈاکٹروں کا کہنا تھا کہ زخمی فلسطینیوں پر ہماری ریسرچ یہ ظاہر کرتی ہے کہ ان میں سے بیشتر زخم اسرائیلی دستوں نے باقاعدہ منصوبے کے تحت لگائے۔ بقول ان کے ایسا لگتا ہے کہ زیادہ تر مار پیٹ واضح طور پر ہاتھ، بازو یا پاؤں توڑنے کے لیے کی گئی تھی۔

طبی اور حقوق انسانی گروپ رپورٹ ۳۰ رمئی ۱۹۸۸ء

فلسطینی ڈاکٹروں، یو۔این۔اہلکاروں اور ایمنسٹی انٹرنیشنل کے نمائندوں کا کہنا ہے کہ اسرائیلی دستوں کے بلاامتیاز اور وسیع پیمانے پر آنسو گیس کے استعمال نے اس شورش کے آغاز سے لے کر اب تک ۱۲۰۰ فلسطینیوں کو زخمی کیا ہے۔ درجنوں حمل گرائے ہیں اور گیارہ ہلاکتوں کا موجب بنا ہے۔ ان گروپوں نے الزام لگایا کہ ان دستوں نے گھروں کے اندر، بند کمروں اور ہسپتالوں میں گیس کے گولے داغے۔ اس کے واضح اور ناقابل تردید دستاویزی ثبوت میسر ہیں۔

ایمنسٹی انٹرنیشنل رپورٹ ۱۷ رجون ۱۹۸۸ء

ایمنسٹی انٹرنیشنل نے اسرائیلی دستوں کے بے محابا اصلی گولیاں چلانے پر ایک خاص تنقیدی رپورٹ شائع کی۔ اس فائرنگ کے نتیجے میں کئی خواتین، چودہ سال سے کم عمر بچے اور بوڑھے اشخاص جاں بحق ہوئے۔ ان میں سے کچھ ایسے بھی تھے جو کسی پر تشدد مظاہرے میں حصہ نہیں لے رہے تھے۔ رپورٹ میں تھا کہ اس بات کے شواہد موجود ہیں کہ اصلی اسلحہ اور نامعقول حد تک تشدد کے استعمال کی اگر اعلیٰ سطحی اسرائیلی حکام نے حوصلہ افزائی نہیں کی تو اس کو جان بوجھ کر نظرانداز ضرور کیا ہے۔

یو۔این۔جنرل اسمبلی کی مذمت ۳ رنومبر ۱۹۸۸ء

یو۔این۔جنرل اسمبلی نے ۱۳۰ ووٹ موافق اور دو ووٹ مخالف سے یہ قرارداد مذمت منظور کی جس میں اسرائیل کے ''نہتے اور لاچار فلسطینیوں کو ہلاک اور زخمی کرنے پر'' یہ کہا گیا کہ وہ ''انتہائی افسوس کا اظہار'' کرتے ہیں کہ اسرائیل اس قسم کے تشدد کی مذمت کی پہلی قراردادوں کی پرواہ نہیں

کر رہا۔ یہ دو مخالف ووٹ صرف امریکہ اور اسرائیل کے تھے!

یو۔این۔جنرل اسمبلی کی مذمت ۲۰/اپریل ۱۹۸۹ء

یو۔این جنرل اسمبلی نے اسرائیل کی انسانی حقوق کی پائمالیوں کی مذمت کی اور مطالبہ کیا کہ وہ غزہ کی پٹی اور مقبوضہ غرب اردن میں مذہبی عبادات پر ناروا پابندی اور اسلحہ کا بے تحاشہ استعمال فوراً بند کرے۔ اس مرتبہ بھی ۱۲۹ ووٹ حق میں پڑے اور صرف دو یعنی امریکہ اور اسرائیل مخالف ووٹ تھے۔

غیر سرکاری گواہ کی رپورٹ ۲/مارچ ۱۹۹۰ء

ڈاکٹر مارٹن ریوبن برگ فلوریڈا میں پریکٹس کرتا تھا۔ اس نے ۱۹۸۹ء میں غزہ کی پٹی میں بطور ایک غیر وابستہ رضا کار فزیشن کے کام کیا۔ اس نے یہ دیکھا کہ اسرائیلی فلسطینیوں کو مناسب طبی/حفظان صحت سہولتوں کو بہم پہنچانے میں روڑے اٹکاتے تھے۔ بقول اس کے ''طبی امداد کے راستہ میں سرکاری ضابطوں سے رکاوٹ ڈالی جاتی ہے... ریڈیو کے ذریعے پیغام رسانی اور خصوصاً ڈاکٹروں کے Beeper استعمال کرنے پر پابندی ہے (Beeper امریکہ ٹیلیفون پیجر آلہ کو کہتے ہیں جس پر توجہ دلانے والا سگنل/پیغام آپ کو موصول ہوتا ہے... (مترجم) اسرائیلی حکام ان فلسطینی فزیشنوں کو بھی واپس نہیں آنے دیتے جو بیرون ملک سے ٹریننگ لے کر آتے ہیں۔ اس طرح طبی امداد محدود ہو کر رہ جاتی ہے۔ مناسب سہولتوں کا فقدان، روزانہ کا کرفیو، اکثر دنوں بلکہ ہفتوں تک دن بھر یعنی چوبیس گھنٹے کا کرفیو، غزہ کی پٹی کے شہریوں کا اسرائیل میں رات کے قیام کی مناہی اور فوجی ریگولیشنز اور پابندیاں... یہ سب مل کر فلسطینی مریضوں کے دکھ، درد، کمزوری اور شرح اموات کو بڑھا دیتی ہیں۔''

جمی کارٹر رپورٹ... ۱۹/مارچ ۱۹۹۰ء

سابقہ صدر کارٹر نے ۱۹۹۰ء کے اوائل میں اسرائیل کا دورہ کیا اور کہا ''ہمیں ایک مطلق العنان حکومت کا سامنا ہے جو (فلسطینی) لوگوں کو ان کے بنیادی حقوق سے محروم کر رہی ہے۔'' اس نے مزید کہا ''غرب اردن اور غزہ میں رہنے والا شاید ہی کوئی خاندان ایسا ہو جس کے کسی مرد ممبر کو اسرائیلی فوجی حکام نے قید میں نہ ڈالا ہو... تقریباً ۶۵۰ فلسطینی اسلحہ کے بے محابا استعمال سے اسرائیلی دستوں نے ہلاک کئے جب کہ جان کو خطرہ میں ڈالنے والے حالات موجود نہ تھے اور وہ اب بھی لوگوں کے

گھروں کو مسمار کر رہے ہیں اور انہیں بغیر الزام لگائے جیلوں میں بھر رہے ہیں۔"

مڈل ایسٹ واچ... ۲۵ر جولائی ۱۹۹۰ء

یو۔ ایس۔ امریکہ کی انسانی حقوق کی تنظیم نے یہ دریافت کیا کہ اسرائیل کے اسلحہ استعمال کرنے کے قوانین "ناموزوں حد تک مجاز" تھے۔ انہوں نے فوری ترمیم پر زور دیا تا کہ اسرائیلی دستوں کے ہاتھوں فلسطینیوں کی ناجائز ہلاکتوں میں کمی کی جاسکے۔ رپورٹ میں اسرائیل کی اس بات پر کڑی نکتہ چینی کی گئی تھی کہ اس نے کسی بھی سپاہی پر غیر قانونی ہلاکت کا مقدمہ نہیں چلایا۔

اقوام متحدہ کے سکریٹری جنرل کی رپورٹ... ار نومبر ۱۹۹۰ء

اقوام متحدہ کے سکریٹری جنرل پیریز ڈی کوئیار نے تجویز کیا کہ سیکورٹی کونسل براہ راست اپنے آپ کو ملوث کرے تا کہ اسرائیلی مقبوضہ علاقے میں آباد فلسطینیوں کو بچانے کا کوئی طریقہ نکالا جاسکے۔ ڈی کوئیار کی تجویزوں میں سے ایک یہ تھی کہ ۱۹۴۹ء کی "چوتھی جنیوا کنونشن برائے حفاظت شہری افراد بصورت جنگ" کے ۱۶۴ ممالک کی جو اس کنونشن کی توثیق کر چکے ہیں، ایک مجلس بلائی جائے جو ان خلاف ورزیوں پر بحث کر سکے۔ اس کا خیال تھا کہ فلسطینیوں کا اپنے انتفاضہ کو جاری رکھنے پر اصرار اس بات کا مظہر ہے کہ وہ اس قبضے کو نامنظور کرتے ہیں اور وہ اپنے جائز سیاسی حقوق بشمول حق خود ارادی حاصل کرنے پر ڈٹے ہوئے ہیں... آج جو مسئلہ ہمیں درپیش ہے وہ یہ ہے کہ فلسطینی شہریوں کو جو اسرائیلی مقبوضہ علاقہ میں رہ رہے ہیں حفاظت اور پناہ مہیا کی جاسکے۔ یہ تو صاف ظاہر ہے کہ اسرائیلی حکام پر ان تمام اپیلوں کا... چاہے وہ سیکورٹی کونسل کی طرف سے ہوں یا میری جانب سے بطور سکریٹری جنرل، انفرادی ممبران حکومت سے ہوں یا انٹرنیشنل کمیٹی آف ریڈ کراس کی جانب سے... کہ وہ چوتھی جنیوا کنونشن کے ضمن میں اپنی ذمہ داریوں کا پاس کریں۔ کوئی اثر نہیں۔ اسرائیل نے رپورٹ کو یک طرفہ کہہ کر مسترد کر دیا اور امریکہ نے بھی اس معاملے میں کوئی دلچسپی نہیں لی۔

یو۔ این۔ مذمت ۶ر جنوری ۱۹۹۲ء

یو۔ این۔ سیکورٹی کونسل نے متفقہ طور پر یہ قرارداد منظور کی کہ وہ "اسرائیل یعنی مقبوضہ حکومت کے اس فیصلہ کی زبردست مذمت کرتی ہے جس کے تحت وہ فلسطینی شہریوں کی ملک بدری دوبارہ

شروع کررہی ہے۔'' یہ چوتھی جنیوا کنونشن کی صریحاً خلاف ورزی ہے۔ اس قرارداد میں اسرائیلی مقبوضہ علاقے کو''فلسطینی علاقے... بشمول یروشلم'' کہہ کر پکارا گیا تھا۔ انتفاضہ شروع ہونے کے بعد یہ ساتویں مرتبہ تھا کہ سیکورٹی کونسل نے اسرائیل کو فلسطینیوں کو ملک بدر کرنے سے منع کیا یا ایسی ملک بدری پر افسوس کا اظہار کیا۔ پچھلی تینوں قراردادوں کی رائے شماری میں امریکہ نے حصہ نہیں لیا تھا۔ یہ اڑسٹھواں (۶۸) موقعہ تھا کہ سیکورٹی کونسل نے اسرائیل کے خلاف قرارداد منظور کی۔

فریب ''مجھے اس بارے میں ذرہ بھر شبہ نہیں کہ اسرائیل پر دوسروں سے زیادہ ارفع معیاروں کا اطلاق کیا جارہا ہے۔''

(رچرڈ شفٹر، امریکہ میں اسسٹنٹ سکریٹری آف اسٹیٹ برائے حقوق انسانی ۱۹۹۰ء)

حقیقت:

شفٹر نے یہ گواہی اس پہلی ہاؤس کمیٹی کی میٹنگ میں دی جو ۹ رمئی ۱۹۹۰ء کو انتفاضہ کے بارے میں ہوئی... یعنی شورش کے آغاز کے ڈھائی سال بعد! اس گواہی کو دوسرے گواہوں نے مثلاً مائیکل پوزنر نے رد کیا۔ وہ وکلاء کی انسانی حقوق کمیٹی کا ایگزیکٹو ڈائریکٹر تھا۔ ہیومن واچ کے ڈپٹی ڈائریکٹر کینیتھ روتھ نے بھی تردید کی اور غزہ کی پٹی کی ایک تعلیمی ماہر سارہ رائے نے بھی۔ ان سب نے شہادت دی کہ اسرائیل نے بلا جواز زائد از ضرورت قوت استعمال کی جس کی وجہ سے بہت ساری ہلاکتیں ہوئیں۔ جس میں سولہ سال سے کم عمر کے ۱۰۲ بچوں کی اموات بھی شامل تھیں۔ انہوں نے اسرائیل کے قیدیوں کو اذیتیں دینے پر بھی تنقید کی۔ اس کی انتظامی حراستوں کی بھی مذمت کی جس کے تحت فلسطینیوں کو بغیر الزام یا مقدمہ کے گرفتار کرلیا جاتا تھا۔ فلسطینیوں کی ملک بدری اور عرب رہائشی عمارتوں کے انہدام کو بھی تنقید کا نشانہ بنایا گیا۔

امریکن عرب تعصب کمیٹی نے شفٹر کی برخواستگی کا بھی مطالبہ کیا کیونکہ اس نے عمداً اسرائیل کی تنقید کو گھٹا کر پیش کیا تھا۔ بش انتظامیہ نے انکار کردیا۔ اس کمیٹی کے بقول شفٹر ''یہودی انسٹی ٹیوٹ برائے قومی سلامتی معاملات'' کا بانی صدر تھا۔ اس گروپ کو اس لیے منظم کیا گیا تھا کہ دفاعی اور قومی سلامتی کمیونٹی کو اسرائیل اور امریکہ کے مابین حربی امداد باہمی کی اہمیت سے باخبر رکھا جاسکے۔ اس کمیٹی کے صدر عابدین جبارہ نے الزام لگایا کہ ''سفیر شفٹر امریکی قانون کے نفاذ اور حقوق انسانی کی پاسداری سے زیادہ اسرائیل کے تصور کے بارے میں فکرمند تھا۔'' جبارہ نے شفٹر سے ملاقات کی

درخواست کی جو رد کر دی گئی۔

رچرڈ شفٹر کی اس مخالفانہ شہادت کے باوجود اس کے اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ دفتر نے بداعمالیوں کی اصلیت کے بارے میں ایسی رپورٹیں جاری کیں جن سے اسرائیل کی بداعمالیوں کی اصلیت اور وسعت پر ذرہ بھر شک نہ رہا۔ ذیل میں امریکی اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کی ۱۹۸۸ء سے ۱۹۹۱ء تک کی ''حقوق انسانی پر عمل کے بارے میں ریاستی رپورٹیں'' سے کچھ اقتباسات آپ کی نظر ہیں:

● ۱۹۸۸ء— اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کی رپورٹ کے مطابق اسرائیلیوں نے ۳۶۶ فلسطینی اس سال ہلاک کئے۔ ۹ر دسمبر ۱۹۸۷ء سے شروع ہونے والی شورش سے لے کر سال کے اخیر تک مزید ۲۳ مارے گئے۔ گویا اس شورش کے تیرہ ماہ سے بھی کم عرصہ میں ۳۸۹ ہلاکتیں ہوئیں یعنی روزانہ ایک سے زائد! رپورٹ میں اس بات کا بھی حوالہ دیا گیا تھا کہ ۱۹۸۸ء میں پانچ ایسے کیس ہوئے جن میں غیر مسلح گرفتار شدہ فلسطینی قابل اعتراض حالات میں مردہ پائے گئے یا انہیں گرفتار کرنے والے اہلکاروں نے ہلاک کیا تھا... بیس ہزار سے زائد فلسطینی زخمی ہو چکے تھے یعنی سال بھر کے دوران روزانہ اوسطاً پچپن! اس رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ ۱۹۸۸ء کے دوران ۳۶ فلسطینیوں کو ملک بدر کیا گیا۔ ۲۶۰۰ سے زائد انتظامی حراست میں تھے۔ کم از کم ۱۰۸ گھروں کو مسمار کیا گیا اور ۴۶ کو سیل بند کر دیا گیا۔ اس رپورٹ میں یہ بھی کہا گیا کہ بہت سی اموات اور زخمیوں سے بچا جا سکتا تھا کیونکہ اسرائیلی فوجی حالات میں آتشیں اسلحہ استعمال کرتے ہیں جب کہ ان کو کوئی جانی خطرہ درپیش نہیں ہوتا... (اسلحہ استعمال کرنے کے) قوانین پر سختی سے عمل نہیں ہوتا۔ سزائیں عام طور پر بہت ہلکی ہوتی ہیں اور بہت سے مواقع پر بلا وجہ ہلاکتوں کے خلاف نہ کوئی تادیبی اقدام ہوا اور نہ ہی مقدمہ چلا۔ رپورٹ میں فلسطینیوں کو بڑے پیمانے پر مار پیٹ کرنے کا بھی ذکر تھا۔ اسرائیلی ڈیفنس فورس کے سپاہی ان فلسطینیوں کے ہاتھ پاؤں بھی ڈنڈے مار مار کر توڑ دیتے تھے جو براہِ راست شورش میں ملوث نہ تھے اور نہ گرفتاری کے خلاف مزاحمت کر رہے تھے۔ سپاہی رات کے وقت لوگوں کو گھروں سے باہر گھسیٹ لاتے اور پھر گھنٹوں ان کو کھڑا رکھتے۔ آدمیوں اور لڑکوں کو گھیر کر پتھراؤ کرنے کا بہانہ رکھ کر پیٹتے۔ کم از کم ۱۳ فلسطینیوں کی اس طرح مار پیٹ سے موت واقع ہونے کی تصدیق ہو چکی ہے۔ وسط اپریل ۱۹۸۸ء تک جان بوجھ کر ہڈیاں توڑنے کی رپورٹیں آنی تو

بند ہو گئیں لیکن بلاقصور اور ناجائز تشدد کی خبریں آتی رہیں۔

● ۱۹۸۹ء— اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کی رپورٹ کے مطابق ۱۹۸۹ء میں ۳۰۴ فلسطینیوں کی اسرائیلیوں کے ہاتھوں ہلاکت ہوئی۔ اس میں وہ گیارہ بھی شامل تھے جنہیں اسرائیلی نوآبادکاروں نے ہلاک کیا تھا اور وہ دس بھی جو تفتیش کے دوران تشدد سے ہلاک ہوئے۔ جو فلسطینی اسرائیلی فوج کے ہاتھوں زخمی ہوئے ان کی تعداد پانچ اور بیس ہزار کے درمیان تھی۔ رپورٹ میں کہا گیا کہ اس سال کے دوران ۲۶ فلسطینی ملک بدر کئے گئے۔ ۱۲۷۱ کو حفاظتی انتظامی نظر بندی میں رکھا گیا۔ ۸۸ گھروں کو مسمار اور ۸۲ کو سیل بند کیا گیا۔ مزید درج تھا کہ قیدیوں کو ذلیل کرنا اور تشدد کی رپورٹیں آنا جاری ہیں۔ زیر حراست قیدیوں کو پوچھ گچھ کے دوران مارا پیٹا جاتا ہے اور ان کو بھی جن پر صرف شک ہوتا ہے۔

● ۱۹۹۰ء— اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ نے اطلاع دی کہ ۱۹۹۰ء کے دوران اسرائیلیوں نے ۱۴۰ فلسطینی ہلاک کئے۔ دس کو یہودی نوآبادکاروں نے ہلاک کیا جب کہ باقی اسرائیلی فوجیوں کے ہاتھوں مارے گئے۔ کم ازکم پانچ ایسے افراد کے ہاتھوں ہلاک ہوئے جو وردی میں نہ تھے۔ حقوق انسانی گروپوں نے الزام لگایا کہ سادہ کپڑوں میں سیکورٹی اہلکار ہلاک کرنے والے جتھوں کی شکل میں گھوم رہے تھے۔ جو فلسطینی سرگرم کارکنوں کو بغیر وارننگ دیے ہلاک کر رہے تھے یا پھر اس وقت ختم کر ڈالتے جب ان پر قابو پا لیا گیا ہوتا جو فلسطینی اسرائیلیوں کے ہاتھوں زخمی ہوئے ان کی تعداد چار سے دس ہزار کے درمیان بتلائی جاتی ہے۔ اس سال کوئی فلسطینی ملک بدر تو نہ ہوا لیکن ۱۲۶۳ سے زائد حفاظتی انتظامی نظر بندی میں تھے۔ ۹۳ گھر مسمار کئے گئے اور ۸۳ کو سیل بند کیا گیا۔ رپورٹ میں یہ دہرایا گیا کہ زیر حراست قیدیوں کے ساتھ سخت اور ناروا سلوک اور صرف شک کی بنیاد پر مار پیٹ کا سلسلہ جاری رہنے کی رپورٹیں آرہی ہیں۔

● ۱۹۹۱ء— اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کی رپورٹ کے مطابق ۱۹۹۱ء میں ۹۷ فلسطینی اسرائیلی قابض فوجوں کے ہاتھوں ہلاک ہوئے۔ جن میں ۲۷ ایسے افراد شامل تھے جو بغیر وردی اہلکاروں کے ہاتھوں ہلاک ہوئے۔ بقول اس رپورٹ کے ۱۹۹۰ء کی مانند حقوق انسانی گروپوں نے پھر یہ اطلاع دی کہ سادہ کپڑوں میں ملبوس اسرائیلی ہلاکتی جتھے ان فلسطینی سرگرم کارکنوں کو

ہلاک کر رہے تھے جو یا تو قابو کئے جا چکے ہوتے یا جو اپنے آپ کو حکام کے حوالے کر دیتے تھے۔ زخمی فلسطینیوں کی تعداد کے اندازے ۸۴۱ سے لے کر ۸۰۰۰ سے زائد تک تھے۔ اس رپورٹ میں کہا گیا تھا کہ اس سال آٹھ فلسطینی ملک بدر کئے گئے اور ۱۴۰۰ سے زائد حفاظتی نظر بندی میں تھے۔ ۵۵ گھروں کو مسمار کیا گیا اور ۶۲ کو سیل بند کیا گیا۔ اس میں یہ بھی درج تھا کہ حقوق انسانی گروپوں کی شائع شدہ قابل بھروسہ رپورٹوں میں تفصیل سے درج ہے کہ فلسطینی نظر بندوں کو حراست کے دوران اور نظر بندی کیمپوں میں ناروا سلوک، تشدد اور ایذا رسانی کا سامنا ہے۔



باب: ۱۲

اسرائیل کے فلسطینی شہری

اسرائیل کے اندر فلسطینی شہریوں کی ایک معقول تعداد بستی ہے۔ ۱۹۹۲ء میں یہ تقریباً آٹھ لاکھ تھے۔ یعنی اسرائیل کی کل آبادی کا تقریباً ۱۴ فیصد۔ سرکاری طور پر یہ فلسطینی اسرائیلی شہری ہیں لیکن عملی طور پر یہ شہری حقوق سے محروم ہیں۔ انہیں امتیاز کا سامنا ہوتا ہے کیونکہ بعض قانونی حقوق صرف یہودیوں کے لیے مخصوص ہیں۔ کسی بھی اسرائیلی حکومت نے چاہے وہ لیبر تھی یا لیکڈ، فلسطینی شہریوں کے لیے حقیقی مساوات کا نہیں سوچا۔

فریب ''(اسرائیلی) حکومت ان معنوں میں یہودی حکومت نہ ہوگی کہ یہاں پر یہودی باشندوں کو اپنے ساتھی غیر یہودی باشندوں سے زیادہ حقوق حاصل ہوں۔''

(جیوش ایجنسی کا بیان، ۱۹۴۷ء)

حقیقت:

۱۹۸۹ء میں شائع شدہ مشہور و معروف ''تاریخ فلسطین و اسرائیل'' میں کہا گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسرائیل کے فلسطینی شہریوں کو ہمیشہ وسیع پیمانے پر باقاعدہ امتیازی سلوک کا سامنا رہا ہے۔ کچھ سرگرم اسرائیلی بطور دلیل کہتے ہیں کہ یہ امتیاز معاشرتی اور معاشی مسئلہ ہے لیکن وہ اس کو نظر انداز کر جاتے ہیں کہ یہ مسئلہ بنیادی طور پر سیاسی ہے۔ اس کا تعلق اقتدار سے ہے... فلسطینیوں کو کبھی سیاسی اقتدار میں حصہ نصیب نہیں ہوا اور نہ ہی مستقبل قریب میں اس کے کوئی آثار نظر آتے ہیں۔ ہر چند کے کچھ افراد نے صہیونی سیاسی پارٹیوں میں بطور چنے گئے نامزد ممبران کے کچھ فعال کردار ادا کیا ہے۔ لیکن انہیں کبھی پورے اقتدار یا مکمل وزارتی ذمہ داریوں سے نہیں نوازا گیا۔ ان کی شمولیت نمائشی تھی تاکہ عرب ووٹوں پر حق جتلایا جاسکے اور یہ تاثر دیا جائے کہ وہ ایک مکمل جمہوری معاشرہ ہے۔ فلسطینیوں کے لیے یہ ایک بے ثمر جمہوریت رہی ہے۔''

یہ امتیازی سلوک اسرائیل کے معرضِ وجود میں آتے ہی شروع ہو گیا تھا۔ ۱۹۴۸ء کی جنگ کے خاتمہ پر ایک لاکھ ساٹھ ہزار عرب اسرائیل کے اندر رہ رہے تھے۔ یعنی ۱۹۴۹ء کے اواخر میں اس نوزائیدہ مملکت کی ساڑھے بارہ فیصد والی اقلیت... اپنی ہی سرزمین پر اجنبی! یہ لوگ ملک بدری سے محفوظ نہ تھے۔ ہزاروں فلسطینیوں کو چن چن کر ملک بدر کیا گیا تھا۔ یہ ۱۹۵۰ء کی بات ہے کہ اسرائیل نے مجدال سے چودہ ہزار فلسطینیوں کو نکال دیا تاکہ یہودیوں کا نیا شہر اشکلون بسایا جاسکے۔

اسرائیل کی توسیع شدہ سرحدوں کے اندر رہ جانے والے فلسطینی خود بخود اسرائیلی شہری بن جاتے ہیں۔ گو ان کا رتبہ واضح طور پر دوسرے درجے کے شہری کا ہوتا ہے۔ فلسطینی شہریوں پر اسرائیلی دفاعی (ایمرجنسی) قوانین کا اطلاق ہوتا ہے جس کے تحت انہیں سول عدالتوں کی بجائے فوجی عدالتوں میں پیش ہونا پڑتا ہے۔ ان کی نقل و حرکت پر کڑی پابندیاں ہیں۔ نظر بندی بغیر اپیل اور ملک بدری کا سامنا تھا۔ منظم سیاسی مظاہروں پر پابندی تھی۔ ان کے اخبارات/رسائل اور درسی کتب پر سنسر لاگو ہوتا تھا۔ تعمیراتی پرمٹوں کا حصول تقریباً ناممکن تھا۔

اسرائیلی عرب ۱۹۶۶ء تک فوجی قوانین کے تحت رہے۔ حتیٰ کہ کنشت (اسرائیلی پارلیمنٹ) نے آخر کار ان کے خلاف یہ خصوصی قوانین منسوخ کر دیے۔ بہر حال کچھ دفاعی قوانین کسی نہ کسی شکل میں برقرار ہیں اور آج تک اسرائیلی عربوں کے خلاف استعمال ہو رہے ہیں۔

فریب ''اسرائیل کے عرب اور یہودی شہریوں میں صرف ایک ہی قانونی فرق ہے اور وہ یہ کہ اول الذکر فوجی خدمت سے معافی ہے۔'' (AIPAC ۱۹۹۲ء)

حقیقت:

جب اسرائیل یہ کہتے ہیں کہ اسرائیل کے فلسطینی شہریوں کو دفاعی افواج میں خدمت بجا لانے میں معافی ہے تو وہ گویا اس حقیقت کی پردہ پوشی کر رہے ہوتے ہیں کہ انہیں فوج میں آنے کی اجازت ہی نہیں۔ اسرائیلی دفاعی افواج میں خدمت سے محرومی فلسطینیوں کے لیے بہت سارے معاشرتی فائدروں سے محرومی کا سبب بنتی ہے۔ مثلاً ''سابقہ فوجیوں کس جو گھر، معاشرتی خدمات اور دوسرے کئی ضمنی فوائد ملتے ہیں۔ وہ ان سے محروم رہتے ہیں۔

اسرائیل کے اندر بسنے والے فلسطینیوں کے ساتھ امتیازی برتاؤ بہت گہرا اور مستقل ہے۔ یہ اسرائیلی قوانین اور حکومتی ضابطوں میں رچا بسا ہے۔ اس کے ماتحت دنیا میں کسی بھی جگہ بسنے والے

یہودی کو خود بخود اسرائیلی شہریت حاصل ہو جاتی ہے۔ جب کہ کسی بھی فلسطینی کو اپنے وطن واپس لوٹنے کا بنیادی حق حاصل نہیں۔ ایک اور مثال یہ ہے کہ ہر فلسطینی کو ایک شناختی کارڈ ہمراہ رکھنا پڑتا ہے جس پر یہ درج ہوتا ہے کہ حامل کارڈ یہودی نہیں ہے۔ ۱۹۵۲ء کے قانون شہریت کے تحت دنیا میں کہیں بھی بسنے والے یہودی کو خود بخود اسرائیلی شہریت حاصل ہو جاتی ہے۔ اس کے برخلاف غیر یہودیوں کے لیے شہریت کے قواعد اس قدر کڑے ہیں کہ ان فلسطینی باشندوں کو بھی اسرائیلی شہریت سے محروم رکھا جاتا ہے جن کے آباء و اجداد کئی نسلوں سے فلسطین میں رہتے چلے آ رہے ہیں۔

۱۹۵۲ء میں ایک اور قانون منظور کیا گیا جسے عالمی صہیونی تنظیم... جیوش ایجنسی (مرتبہ) کا قانون کہتے ہیں۔ اس کی رو سے صرف یہودیوں کے لیے خصوصی معاشی مراعات، سیاسی حیثیت اور معاشرتی فوائد کو قانونی حیثیت دی گئی ہے۔ اس کے تحت اسرائیلیوں کو ''قومیت'' کا حق بلاشرکت غیرے عنایت کیا گیا جس میں زمین خریدنے کا حق بھی شامل ہے۔ یہودی تنظیموں مثلاً جیوش نیشنل فنڈ کو قانوناً مناہی ہے کہ وہ اسرائیل کے اندر غیر یہودیوں کے ہاتھ زمین فروخت نہیں کر سکتے۔ ان پر لازم ہے کہ وہ یہ زمین تمام یہودی قوم کے لیے بچا کر رکھیں۔ اس قانون میں اس بات کا اثبات کیا گیا تھا کہ اسرائیلی ریاست بنانے میں تمام یہودی افراد کا حصہ ہے۔ لہٰذا اس کے دروازے ہر یہودی کے لیے وا ہیں۔

عربوں کے خلاف دوسرے امتیازی قوانین میں ان کی اراضی/ جائیداد ہتھیانے کے لیے خنجر نما رولز کا پورا سیٹ موجود ہے۔ مثلاً خطرہ کے وقت جائیداد ہتھیانے کا قانون، ۱۹۵۰ء کا غیر حاضر لوگوں کی جائیداد کا قانون، ۱۹۵۳ء کا زمین سرکاری کام کے لیے حاصل کرنے کا قانون۔ صرف اس آخری قانون کے مطابق ۱۸۰۰۰ فلسطینی باشندوں کی دس لاکھ ایکڑ زمین کو بحق سرکار غضب کیا جا چکا ہے۔ تل ابیب کے ایک عبرانی روزنامے ''الارض'' کے نامہ نگار موشے کیرن کا بیان ہے کہ یہ قوانین برائے اراضی اور ضبطی زمین قانونی آڑ میں بڑے پیمانے پر ڈاکہ زنی ہے۔ عرب اقلیت کو لاکھوں دنم سے محروم کر دیا گیا۔[1]

اراضی جب ایک مرتبہ جیوش نیشنل فنڈ، جو عالمی صہیونی تنظیم کا ایک ماتحت ادارہ ہے۔ خرید لے تو پھر دوبارہ بیچی نہیں جا سکتی اور نہ کسی بھی طریقے سے اسے کھویا جا سکتا ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ یہ زمین یہودی فرقے کے لیے تا قیامت ایک امانت کے طور پر محفوظ ہو گئی۔ ۱۹۶۱ء میں اس فنڈ اور حکومت کے درمیان ایک میثاق کے مطابق اس فنڈ اور حکومت کے درمیان ایک میثاق کے مطابق اس فنڈ کا مقصد

[1] دنم زمین ناپنے کا عربی پیمانہ جیسے پنجاب میں کرم۔ مرلہ اور جریب ہیں... (مترجم)

''یہودی النسل، یہودی مذہب، یا یہودی الاصل افراد کے مفاد کا تحفظ ہے۔'' ۱۹۹۰ء کی دہائی کے اوائل تک ریاست اسرائیل اور اس فنڈ کے قبضہ میں اسرائیل سرحدوں کے اندر ترانوے (۹۳) فیصد علاقہ آچکا ہے۔ اس میں سے زیادہ تر فلسطینیوں سے غصب شدہ علاقہ ہے، جب یہ پتہ چلا کہ کچھ یہودی اپنی زرعی زمین فلسطینیوں کو مزارعت پر دے رہے ہیں تو ۱۹۶۷ء میں ایک نیا قانون یعنی ''قانونِ زرعی بندوبست'' پاس کیا گیا جس کی رو سے بغیر وزیر زراعت کی اجازت کے زرعی زمین کو پٹہ پر دینا منع ہے۔ اس طرح فلسطینیوں کے رہنے اور کام کرنے کے مواقع مزید محدود کردیے گئے... اور اب بھی ایسا ہی ہے۔

ایک عبرانی روزنامہ ''داور'' کے عرب معاملات کے نامہ نگار دانی روبن اسٹائین کی ۱۹۷۵ء کی رپورٹ کے مطابق ''سرکاری پالیسی کے مطابق اسرائیلی عربوں کو کسی بھی سیاسی، معاشرتی یا معاشی معاملے میں جو آزاد اور عربی ہو، حصہ لینے کی اجازت نہیں۔''

فریب ''ریاست اسرائیل... تمام شہریوں کے لیے یکساں معاشرتی اور سیاسی حقوق کو یقینی بنائے گی۔ اس میں عقیدے، نسل اور جنس کی تمیز روا نہیں رکھی جائے گی۔''

(اسرائیلی اعلانِ آزادی ۱۹۴۸ء)

حقیقت:

گو اسرائیل کے اعلان آزادی میں تمام شہریوں کے لیے برابری کے حقوق کی ضمانت تھی لیکن اسی دستاویز میں یہ بھی درج تھا کہ اسرائیل ''ایک یہودی ریاست ہے... جہاں یہودیوں کو نقل مکانی کرکے آنے کی اجازت ہے۔'' اس میں دنیا کے تمام یہودیوں کو کہا گیا ہے کہ وہ ہمارے ساتھ آن ملیں۔ اس تمام عرصے میں اسرائیل کا قانون اس ریاست کے بلاشرکت غیرے یہودی کردار کو زیادہ اجاگر کرتا رہا ہے۔ مثال کے طور پر ۱۹۸۵ء میں ایک قانون کے ذریعے کسی بھی ایسے فرد کے لیے عوامی عہدہ کے لیے انتخاب میں حصہ لینا منع کردیا گیا جو اسرائیل کے یہودیوں کی ریاست ہونے کو تسلیم نہیں کرتا۔ ۱۹۴۹ء میں نشان اور جھنڈے کے قانون کے ذریعہ داؤدی ستارہ (چھ کونے والا) کو اسرائیلی جھنڈے پر اس لیے نمایاں کیا گیا کہ یہ ''نئی ریاست اور یہودی قوم کے درمیان شناختی تعلق'' کو واضح کرے۔ اسی میں مینورہ جو کہ ایک یہودی شمع دان ہے نشانِ ریاست قرار پایا۔

نیویارک ٹائمز کے نامہ نگار داؤد شپلر نے ۱۹۸۳ء میں لکھا کہ ''ان امتیازی قوانین کی وجہ سے

فلسطینی اپنے ہی وطن میں غریب الدیار ہیں کیونکہ وہ یہودی ریاست میں پوری طرح ضم نہیں ہیں۔"
سابقہ وزیر خارجہ یگال ایلن نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ "ہمیں یہ ضرور واضح طور پر بتلا دینا چاہیے کہ اسرائیل ایک یک قومی یہودی ریاست ہے۔ اگر اس ملک میں کچھ عرب اقلیت بستی ہے تو اس حقیقت سے یہ کثیر الاقوامی ریاست نہیں بن جاتا!"

فلسطینیوں کے خلاف اسرائیلی سرکاری امتیازی سلوک کی سب سے زیادہ ڈرامائی عوامی شہادت ۱۹۷۶ء کی ایک دستاویز میں ظاہر ہوئی۔ اس کا نام اس کے مصنف اسرائیل کونگ کے نام پر "کونگ رپورٹ" رکھا گیا۔ یہ شمالی گیلیلی ضلع میں وزارت داخلہ کی طرف سے کمشنر تھا۔ اس طویل رپورٹ میں فلسطینی وطن پرستی کے روز افزوں جذبہ سے خبردار کیا گیا تھا اور اس کی سرکوبی کرنے کے لیے کئی تجاویز پیش کی گئی تھیں جس سے اسرائیلی شہریت کے حامل فلسطینیوں سے نپٹا جا سکے۔ ان میں "موجودہ عرب آبادی کے مراکز کو ممکنہ طور پر تحلیل کرنا، یہودی گروپوں اور افراد کو (معاشی میدان یعنی نوکریوں سمیت) عربوں پر ترجیح دینا، عرب طلباء کو مشکل سائنسی مضامین اختیار کرنے پر اکسانا کیونکہ اس طرح ان کے پاس قوم پرستانہ معاملات میں شامل ہونے کے لیے کم وقت بچے گا اور اس میں تعلیم ادھوری چھوڑ دینے کے امکانات بھی زیادہ ہیں اور عرب طالب علموں کو ممالک غیر میں جا کر تعلیم حاصل کرنے پر اکسایا جائے اور ان کی واپسی اور ملازمت کے راستہ میں مزید مشکلات کھڑی کی جائیں۔ اس پالیسی سے ان میں ترک وطن کے رجحان کی حوصلہ افزائی ہوگی۔"

حکومت نے اعلان کیا کہ یہ سرکاری پالیسی ہرگز نہیں بلکہ صرف ایک انفرادی رائے ہے۔ اکثر مبصرین اور عربوں نے اسے درخورِ اعتناء نہ جانا۔ نقادوں نے بطور ثبوت کونگ کا گیلیلی کا کمشنر متعین رہنا پیش کیا۔ اس دستاویز کے ساتھی مصنف ذوی الدوراتی کو وزیر اعظم یتزاق رابن نے لیبر پارٹی کے عرب معاملات والے شعبہ کے ڈائریکٹر کے عہدہ پر تعیناتی کے لیے بطور امیدوار نامزد کیا تھا۔
بہرحال اپنے دوبارہ وزیر اعظم منتخب ہو جانے پر اپنے ۱۹۹۲ء کے خطاب میں رابن نے یہ عہد کیا کہ 'اس ریاست کو قائم ہوئے ۴۵ سال ہونے کو آئے لیکن اب بھی یہودیوں اور عربوں کے درمیان کئی معاملات میں بین تفاوت موجود ہیں۔ میں حکومت کی جانب سے عرب، دروز اور بدو آبادی سے یہ وعدہ کرتا ہوں کہ میں ان تفرقات کو معدوم کرنے کی پوری پوری کوشش کروں گا۔" لیکن کیا ہم اس کے ماضی کے برتاؤ کے مدِ نظر ان الفاظ کو سنجیدگی سے لے سکتے ہیں؟ یہ وقت ہی بتلائے گا!

باب: ۱۴

اسرائیلی لابی

امریکی حکومت پر اسرائیل کا اثر ونفوذ افسانوی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ اس کی بڑی وجہ اسرائیلی لابی کا وجود ہے۔ اس کی طاقت کے بارے میں کسرِ نفسی کیے جانے کے باوجود تقریباً سبھی سیاست داں، اخبار والے اور جن کا بھی براہِ راست اس لابی سے سامنا ہوا ہے وہ اس بات کی گواہی دیں گے کہ کانگریس میں اسرائیل نواز ممبران پورے طور پر حاوی ہیں اور امریکہ کی خارجی پالیسی بنانے میں ان کا پورا عمل دخل ہے۔ بہت سارے اسرائیل نواز گروپوں میں سے کوئی بھی ''امریکہ اسرائیل پبلک افیئرز کمیٹی'' سے زیادہ منظم، زیادہ متحرک اور زیادہ طاقتور نہیں۔ ۱۹۵۱ء سے ہی یہ امریکہ میں سب سے بڑی اسرائیل نواز لابی ہے۔ یہ کانگریس (امریکی ایوان نمائندگان) پر اس قدر حاوی ہے کہ پچھلے بیس برسوں سے اسرائیل بے تحاشا اقتصادی امداد اور خصوصی فوائد سے متمتع ہو رہا ہے اور وہ بھی اس طرح کہ منظور کرتے وقت یک لفظی سنجیدہ بحث بھی نہیں ہوتی، تمام دوسری لابیوں کے لیے AIPAC کی حکومت کے اعلیٰ ترین ایوانوں تک آسانی سے رسائی قابل صد رشک ہے۔ آج کل AIPAC کا سالانہ بجٹ ڈیڑھ کروڑ ڈالر ہے۔ پچاس ہزار کے قریب چندہ دینے والے ممبران اور واشنگٹن ڈی۔سی۔ میں ہیڈکوارٹر ہونے کے علاوہ آٹھ دوسرے شہروں میں بھی دفاتر ہیں۔ اگر یہ کسی سیاسی امیدوار کی پیٹھ ٹھونکیں تو اسے عموماً ملک کے طول وعرض سے سو سے زائد اسرائیل نواز ''پولیٹیکل ایکشن کمیٹیوں'' کی طرف سے مالی امداد ملتی ہے۔

فریب ''انجام کار ذاتی مفاد ہی اسرائیل/امریکہ کے قریبی باہمی تعاون کی بنیاد ہے۔ یہ کسی لابی گروپ کی ننگی طاقت آزمانے کا نتیجہ نہیں!''

اسٹیفن جے، سولارز، ممبر (ڈیموکریٹ، نیویارک ۱۹۸۵ء)

حقیقت:

۱۹۸۷ء میں نیویارک ٹائمز نے لکھا تھا کہ AIPAC مشرق وسطیٰ میں امریکی پالیسی بنانے

میں ایک بڑی مؤثر قوت بن چکی ہے... یہ تنظیم صدارتی امیدوار کے اسٹاف ممبران چننے میں اثر انداز ہونے کی قوت رکھتی ہے۔ یہ کسی بھی عرب ملک کو اسلحہ کی فروخت رکوانے پر قادر ہے اور یہ پینٹا گون (امریکی دفاعی ہیڈکوارٹر) اور اسرائیلی افواج کے درمیان گہرے فوجی دوستانہ تعاون کو فروغ دینے کا ذریعہ ہے۔ اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ اور وائٹ ہاؤس کے پالیسی ساز اہلکار اس کے اعلیٰ عہدے داروں سے صلاح مشورہ طلب کرتے ہیں۔ جرنیل اور سینٹرز بھی مشورہ کرتے ہیں۔ ٹائمز کی رپورٹ سے یہ نتیجہ نکلتا تھا کہ AIPAC مسابقانہ لابیوں کے لیے قابلِ رشک بن چکی ہے اور اُن مشرقِ وسطیٰ ماہرین کے لیے ایک دردسر جو مغرب نواز عربوں کے ساتھ مضبوط تعلقات قائم کرنے کے خواہاں ہیں۔

سال بھر بعد ایک آزاد صحافی ایرک آلٹرمین بھی AIPAC کا معائنہ کرنے کے بعد اسی نتیجہ پر پہنچا۔ بقول اس کے ''اس میں کچھ شک نہیں کہ حالیہ امریکی تاریخ میں AIPAC سے زیادہ طاقت رکھنے والی اور کوئی نسلی لابی نہیں ابھری۔ یہ ثابت کیا جاسکتا ہے کہ یہ درحقیقت واشنگٹن میں قائم شدہ ہر قسم کی لابی سے زیادہ طاقتور ہے... AIPAC کا اثر ونفوذ صرف دارالحکومت میں ہی نہیں بلکہ وائٹ ہاؤس، پینٹا گون، اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ، وزارت خزانہ اور ان سب کے مابین واقع بہت سی دیگر عمارتوں میں بھی عیاں ہے اور یہ اثر ونفوذ ایک دوستانہ انتظامیہ کی مدد پر منحصر نہیں ہے بلکہ زیادہ تر اس کے برعکس ہے!''

سی۔آئی۔اے کی ایک سابقہ تجزیہ نگار کیتھلین کرسٹی سن نے ۱۹۸۸ء میں لکھا تھا: ''صدر ریگن کے عہد میں AIPAC پالیسی سازی میں حصہ دار بن چکی تھی... یہ وائٹ ہائس اور کانگریس میں اس قدر اثر ونفوذ کی حامل ہے کہ یہ اندازہ لگانا اب ممکن نہیں رہا کہ لابی کا دباؤ کہاں ختم ہوتا ہے اور کہاں سے آزادانہ صدارتی سوچ بچار کی حد شروع ہوتی ہے۔''

فریب ''AIPAC کے اثر ونفوذ اور ناقابل شکست ہونے کو ایک دیومالائی حیثیت دے دی گئی۔''
(آئی۔ایل۔کینن، بانی AIPAC ۱۹۸۱ء)

حقیقت:

ریگن کے زمانہ میں AIPAC نے طاقت اور اثر ونفوذ کی نئی بلندیوں کو چھوا۔ اس کی طاقت اس حد تک بڑھ چکی تھی کہ نیویارک ٹائمز کے نامہ نگار ہیڈرک اسمتھ نے لکھا کہ ''یہ ایک مہالابی

ہے... ۱۹۸۵ء تک AIPAC اس قدر سیاسی شہزوری حاصل کر چکی تھی کہ اس نے اپنے حواریوں کے ساتھ مل کر صدر ریگن کو اس اسلحہ کے سودے سے مکر جانے پر مجبور کر دیا جو اس نے اردن کے شاہ حسین کے ساتھ کیا تھا۔ ۱۹۸۶ء میں اس لابی نے ریگن کو سعودی عرب کے ہاتھ جیٹ فائٹر ہوائی جہاز فروخت کرنا رکوا دیا۔ نوبت یہ ایں جا رسید کہ سکریٹری آف اسٹیٹ جارج شلز کو AIPAC کے ایگزیکٹو ڈائریکٹر کے ساتھ نشست کر کے... ایوانِ نمائندگان کے لیڈروں کے ساتھ نہیں!... یہ طے کرنا پڑا کہ AIPAC کس حد تک سعودی عرب کو ہتھیاروں کی سپلائی برداشت کرے گی۔"

ریگن انتظامیہ کے دوران AIPAC کا اثر ونفوذ اس قدر بڑھ چکا تھا کہ AIPAC ایگزیکٹو ڈائریکٹر تھامس۔ اے ڈائن نے ۱۹۸۶ء میں ہونے والی ستائیسویں سالانہ کانفرنس میں یہ رپورٹ پیش کی کہ امریکہ اور اسرائیل میں اس سے بہتر تعلقات پہلے کبھی نہ تھے اور یہ چیز AIPAC کے حق میں مفید تھی! بقول ڈائن "بہتری کے اس عمل کے دوران اسرائیل کے حق میں ایک نیا حلقہ اثر عین ان جگہوں میں ابھر رہا ہے جہاں ہم کمزور ترین تھے... سرکاری اہلکاروں کے درمیان چاہے وہ اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ میں ہوں یا دفاع یا خزانہ میں۔ سی آئی اے میں ہوں یا سائنس۔ تجارت، زراعت اور دیگر شعبوں میں!"

بقول ڈائن کے صدر ریگن اور شلز اسرائیل کے دو بہترین دوست تھے اور وہ ایک ایسی میراث چھوڑ جائیں گے جو اسرائیل کی سیکورٹی کے حق میں برسہا برس تک اہم رہے گی۔ بقول اس کے شلز نے اس سے حلفیہ طور پر کہا تھا کہ "میں ایسے حکومتی انتظامات تعمیر کر جاؤں گا کہ ہماری رخصتی کے آٹھ سال بعد بھی اگر کوئی سکریٹری آف اسٹیٹ اسرائیل کے ساتھ مثبت رویہ کا حامل نہ ہو تو وہ ان انتظامی تعلقات کو جو ہم اسرائیل/امریکہ کے درمیان قائم کر رہے ہیں کالعدم نہ کر سکے!"

بعد ازاں ۱۹۸۶ء میں AIPAC کے ایک اہلکار رچرڈ بی۔ اسٹراس نے واشنگٹن پوسٹ میں لکھا کہ امریکہ کی مشرق وسطی پالیسی اب اس قدر اسرائیل نواز ہوگئی ہے کہ یہ ایک انقلاب سے کم نہیں! اس نے ڈائن کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا کہ یہ خصوصی تعلق اب بہت گہرا ہے۔ یہ ایک وسیع البنیاد شراکت ہے جو روز افزوں ترقی کرتے کرتے ایک مکمل سفارتی اور فوجی اتحاد میں ڈھل رہی ہے!... اسٹراس کا کہنا تھا کہ اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کے عرب معاملات کے ماہرین کا یہ اعتراف ہے کہ واشنگٹن میں عرب مفاد کی قطعاً کوئی سنوائی نہیں ہوتی۔ اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کے ایک سابقہ اہلکار کا کہنا تھا کہ کبھی ہماری

حکمت عملی بھی دو رویہ ہوتی تھی۔ اب تو صرف اسرائیل کے مفاد کا ہی خیال رکھا جاتا ہے۔

درحقیقت ریگن کے دور میں یہ تعلقات اس قدر نزدیکی ہو گئے تھے کہ اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کے اہلکاروں کا AIPAC کے مسٹر ڈائن سے مشرق وسطیٰ حکمت عملی کے مختلف پہلوؤں اور کانگریس میں ان کو کس طرح نبٹا جائے، کے معاملے پر ذاتی صلاح ومشورہ کوئی عجیب بات نہ تھی۔ حد تو یہ ہے کہ صدر ریگن نے ذاتی طور پر فون کر کے ڈائن کا اس بات پر شکریہ ادا کیا کہ اس نے ۱۹۸۳ء میں امریکی میرین دستہ کو بدستور لبنان میں رکھے جانے پر منظوری حاصل کرنے میں مدد دی تھی۔ مشرق قریب کے اسسٹنٹ سکریٹری آف اسٹیٹ رچرڈ مرفی کو اطلاع دینے سے بارہ گھنٹے قبل AIPAC کو مطلع کر دیا گیا کہ سعودی عرب اور اردن کو اسلحہ بیچنے کے سودے منسوخ کر دیے گئے ہیں۔ یہ ۱۹۸۴ء کی ریگن انتظامیہ کے دوران ہوا۔

بش انتظامیہ کے دوران تعلقات میں قدرے سردمہری آ گئی۔ لیکن کلیتاً نہیں! سکریٹری آف اسٹیٹ جیمز بیکر سوئم نے فون کر کے ڈائن سے مدد طلب کی تاکہ وہ ۱۹۹۱ء میں اسرائیل کی جانب سے طلب کی جانے والی ۱۰ بلین ڈالر کی قرضہ کی ضمانت ملتوی کروانے میں انتظامیہ کی مدد کرے۔ ڈائن نے یہ درخواست رد کر دی!

فریب ''سعودی عرب کو امریکی اسلحہ خانہ سے اس قدر ترقی یافتہ ہوائی جہاز فراہم کرنے کا ہرگز کوئی جواز نہیں!'' (AIPAC ۱۹۸۹ء)

حقیقت:

سعودی عرب کو اپنے دفاع کے لیے جو کچھ بھی چاہیے وہ اسے حاصل کرنے کا حق رکھتا ہے۔ پچھلی نصف صدی میں سعودی بادشاہت کے ساتھ امریکہ کے جو قریبی روابط استوار ہوئے ہیں ان کا ثبوت وہ تیل ہے جو امریکی روزانہ استعمال کر رہے ہیں۔ سعودی عرب تیل پیدا کرنے والا ایک بڑا ملک ہے اور تیل کی قیمت اس پر منحصر ہے۔ وہ ہمارا ایک فوجی اتحادی بھی ہے۔ اس چیز کا ڈرامائی طور پر مظاہرہ ۹۱-۱۹۹۰ء میں ہوا جب امریکی افواج اور ہوائی جہازوں نے سعودی... نہ کہ اسرائیلی!... علاقے سے یلغار کر کے عراقیوں سے کویت خالی کروایا۔ سعودی عرب کو ہتھیار بیچنے کا ایک اور بھی چھوٹا سا فائدہ ہے اور وہ یہ کہ سعودی عرب نقد ادائیگی کرتا ہے۔ نہ کہ اسرائیل کی طرح ہمارے ہتھیار مفت حاصل کرتا ہے! جن کا خرچہ امریکی ٹیکس گزاروں کو بھرنا پڑتا ہے!

سعودی عرب کو خود اپنا دفاع کرنے کے قابل بنانے میں امریکی دلچسپی کے باوصف اسرائیل اور اس کے حمایتی لگاتار اسے اسلحہ فروخت کرنے کی مخالفت کرتے رہتے ہیں۔ اس طرح اسلحہ کے پھیلاؤ کو روکنے میں کچھ مصلحت ہوتی۔ اگر واشنگٹن کا اپنا کوئی باقاعدہ کنٹرول پروگرام ہوتا جو تمام ممالک پر یکساں لاگو ہوتا۔لیکن اسرائیل کی بار بار کی جارحیت اور امریکی اسلحہ کی لامتناہی سپلائی کی خواہش کے مدنظر یہ پرلے درجے کی منافقت ہے کہ وہ سعودی عرب اور دوسرے عرب ممالک کو تو اسلحہ کی فروخت کی مخالفت کرے لیکن خود دھڑا دھڑ امریکی اسلحے کے انبار جمع کرتا رہے!

سب سے بڑی، طویل اور سب سے شدید ترین جھڑپ جو AIPAC اور وائٹ ہاؤس میں ہوئی وہ ۱۹۸۱ء میں صدر ریگن کے اس اقدام پر ہوئی جب اس نے ساڑھے آٹھ بلین ڈالر کے عوض پانچ عدد AWACS (ہوا بردوش انتباہ اور کنٹرول سسٹم) سعودی عرب کو فروخت کرنے کا فیصلہ کیا۔ AIPAC اور اسرائیل نے کانگریس نمائندوں اور سینٹروں کے ذریعے یہ دباؤ ڈالا کہ یہ سودا منسوخ کیا جائے۔ وہ اس میں بڑی حد تک کامیاب ہو ہی چلے تھے۔ ریگن نے بہت مشکل سے طویل بحث و مباحثہ کے بعد ۵۲ بمقابلہ ۴۸ کے معمولی اکثریتی ووٹ سے یہ فیصلہ سینٹ سے منظور کروایا۔ اس دوران اس نے قانون سازوں اور ملک کو یہ یاد دہانی کرانی ضروری سمجھی کہ امریکی خارجہ پالیسی بنانا کسی دوسرے ملک کا کام نہیں ہے۔

آخیر میں ایک مبصر کا کہنا تھا کہ یہ جدوجہد کانگریس میں ہونے والی شدید ترین (لابی) جدوجہد تھی! انتظامیہ یہ جنگ جیت گئی لیکن اسرائیل اور AIPAC نے ایک زبردست بات ثابت کردی۔ وہ یہ کہ انتظامیہ اسرائیل کی کسی خواہش کو رد کرے گی تو اسے اس کے بدلہ میں وقت کا کثیر ضیاع، کوشش اور آخرکار سیاسی آبرو کی قربانی دینی ہوگی۔ قانون سازوں کے لیے بھی اس میں گہرا سبق پوشیدہ تھا۔ امریکہ/ اسرائیل تعلقات کے ایک باشعور نکتہ چیں پروفیسر جیرل۔ اے۔ ریوبن برگ کا کہنا ہے کہ اس کے بعد سے اسرائیلی لابی کے لیے سب سے اہم عنصر جس سے وہ کسی فرد کی اسرائیل سے حمایت کا اندازہ لگائے اس کا سینٹ میں ووٹ دینے کا طریقہ کار طے پایا۔ ان تمام افراد کو جنہیں ''غیر دوستانہ'' کا لیبل لگایا گیا انہیں مکرر انتخابات میں سنگین ترین مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔

یہ یقیناً "AWACS" کی فروخت کی حمایت کرنے کا شاخسانہ تھا کہ ۱۹۸۴ء میں انتہائی معزز سینٹر چارلس پرسی کو شکست ہوئی۔ اس انتخاب کے بعد AIPAC کے تھامس ڈائن نے اعلان کیا کہ

"پرسی کو ہرانے کے لیے امریکہ کے اس ساحل سے اس ساحل تک سبھی یہودی اکٹھے ہو گئے تھے اور امریکی سیاست دانوں کو..... چاہے وہ اس وقت اقتدار میں ہیں یا آئندہ کے لیے امیدوار!..... سبق مل چکا ہے۔"

"AWACS" کی شکست کے بعد سے AIPAC نے اپنا طریقہ کار مکمل طور پر اوور ہال کیا اور وسعت دی۔ نیویارک ٹائمز میں ہیڈرک اسمتھ نے لکھا کہ "اس کا بجٹ نو سال میں آٹھ گنا سے بھی بڑھ گیا (اکسٹھ لاکھ ڈالر ہو گیا!) ۱۹۷۸ء میں جو ممبر شپ نو ہزار خاندان تھی وہ اب ۱۹۸۷ء میں بڑھ کر پچپن ہزار ہو چکی ہے اور اس کا اسٹاف پہلے کے پچیس کے مقابلے میں اب پچاسی ہے۔ ۸۰ کی دہائی کے وسط تک یہ حامی امیدواروں کو تقریباً چالیس لاکھ ڈالر تک انتخابی مہم فنڈ میں عطیات کے طور پر مہیا کر رہی تھی اور مخالف سیاسی امیدواروں کو سزا دے رہی تھی!"

بعد ازاں بقول ڈائن کے "AWACS" کا معرکہ ایک کلیدی مرحلہ تھا۔ ہم ووٹ تو ہار گئے لیکن مسئلہ جیت گئے۔

فریب "جب بھی مجھے مشرقِ وسطیٰ کے بارے میں کوئی اطلاع درکار ہوتی ہے تو مجھے اس بات سے بہت تسلی ہوتی ہے کہ میں پیشہ ورانہ اور قابل اعتماد مدد کے لیے AIPAC پر بھروسہ کر سکتا ہوں۔"
(سینٹر فرینک چرچ، اڈاہو، ڈیمو کریٹ ۱۹۸۲ء)

حقیقت:

واشنگٹن میں AIPAC کا ضمیمہ تیز ترین ذریعہ ابلاغ ہے۔ کوئی بھی ممبر یا سینٹر جو مشرق وسطیٰ کے بارے میں کوئی بات جاننے کا عندیہ ظاہر کرے اس AIPAC کے "پوزیشن پیپرز" کے سیلاب کا فوری سامنا ہوتا ہے۔

میریلینڈ کے سابقہ ڈیمو کریٹ سینٹر چارلس میتھائی نے لکھا تھا کہ کانگریس کے روبرو جب بھی کوئی ایسا مسئلہ پیش ہوتا جو اسرائیل کے لیے اہمیت کا حامل ہوتا تو AIPAC فوراً بلاناغہ تمام ممبران کو دستاویزات اور اعداد و شمار مہیا کر دیتی۔ موقع محل کی مناسبت سے بعد ازاں فون کا یا ذاتی ملاقات بھی کی جاتی۔ اس کے علاوہ اگر کوئی ممبر یا سینٹر ڈھلمل ہو یا مخالفت کا مظاہرہ کرے تو اسے ایک بڑی تعداد میں خطوط اور تاروں کا سامنا کرنے اور ممتاز با اثر رائے دہندگان حلقہ کی فون کال یا ملاقاتوں کا سامنا کرنے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔

مشرق وسطیٰ کے بارے میں اطلاعات کے لیے AIPAC پر انحصار کرنے میں مسئلہ صرف یہ ہے کہ یہ اطلاعات یقینی طور پر صرف اور صرف اسرائیلی نکتہ نظر پر مبنی ہوں گی۔ اس کے اکثر مطبوعات کے عنوان انتہائی عالمانہ ہوتے ہیں۔ مثلاً ''امریکہ، اسرائیل آزادانہ تجارت کا علاقہ، طرفین کس طرح فائدہ میں رہیں گے!'' اور ان میں بھاری بھرکم علمی مطبوعات کے حوالے اور زیریں حواشی کی بھرمار ہوتی ہے۔ لیکن ہر قاری پر یہ الم نشرح ہوتا ہے کہ اس میں صرف اسرائیلی مفاد کو بڑھاوا دیا گیا ہوتا ہے۔ "Near East Report" جو کہ ایک ہفتہ وار نیوز لیٹر ہے اور تقریباً ساٹھ ہزار افراد کو ارسال کیا جاتا ہے AIPAC کی نگرانی میں شائع ہوتا ہے۔ یہ تمام اراکین، اعلیٰ حکومتی عہدیداران، دانشوروں اور ذرائع ابلاغ کے نمائندوں کو مفت بھیجا جاتا ہے۔ گو یہ نیوز لیٹر قانونی طور پر تو AIPAC سے کوئی تعلق نہیں رکھتا لیکن اس کا بانی یعنی سائی کینن AIPAC کے بانیوں میں سے ایک ہے اور یہ اسرائیلی پالیسی کے عین مطابق چلتا ہے۔ یہ قانون سازوں کے ووٹ ڈالنے کے رجحانات کو باقاعدگی سے چھاپتا ہے۔ گویا ان کو مستقل یہ احساس دلاتا ہے کہ ان کے ووٹ اس کی نگاہ میں ہیں اور اسرائیل کو متاثر کرنے والے قوانین پر اس کی نظر ہے۔

اس نیوز لیٹر کا اسٹاف ایک ضمیمہ بنام ''افسانے اور حقیقت'' بھی تقسیم کرتا ہے۔ اس میں اسرائیل عرب مناقشے کے بارے میں فلسطینی مہاجرین کی حالت جیسے افسانوں کا توڑ کرنا شامل ہوتا ہے۔ یہ ضمیمہ جامعات میں وسیع پیانے پر بطور Study-Aid تقسیم کیا جاتا ہے۔ یہ اسرائیل کے حمایتیوں کو جو کانگریس یا ذرائع ابلاغ میں ہوں مہیا کیا جاتا ہے۔

AIPAC اپنی سرگرمیوں کو صرف جائز قانونی پروپیگنڈے تک محدود نہیں رکھتی۔ ۱۹۷۴ء میں اس نے امریکن جیوش کمیٹی اور دوسرے یہودی گروپوں سے اشتراک کر کے ''جیش حق'' ترتیب دیے تھے جو بقول اس کے عرب نواز پروپیگنڈہ کا توڑ کرنے کے لیے تھے۔ رابرٹ، آئی۔ فرائیڈ مین کی تفتیشی رپورٹ کے مطابق یہ جیش حق ایک قسم کی ''یہودی ذہنی پولیس'' میں تبدیل ہوگئے۔ تفتیش کار... جونکہ بعض اوقات حد سے زیادہ جوشیلے یہودی کالج طالب علم اور بعض اوقات ایسے ذرائع جنہیں امریکی خفیہ ایجنسیوں تک رسائی حاصل تھی!... اسرائیل کے ایسے نقادوں کا چاہے وہ یہودی ہوں یا غیر یہودی کھوج لگاتے اور ہر جگہ ان کا پیچھا کرتے، ان کی تقاریر اور مضامین پر نظر رکھتے اور بعض اوقات ان کی غیر متعلقہ کارروائیوں پر بھی مخبری کرتے رہتے۔ ان پر اکثر Anti-Semitism

کا لیبل چسپاں کر کے یا پھر ''خود سے نفرت کرنے والے یہودی'' کہہ کر کیچڑ اچھالا جاتا۔ مقصد صرف یہ تھا کہ یہودی فرقے/ جامعات یا ذرائع ابلاغ میں مشرقِ وسطیٰ پر بحث مباحثہ کا گلا گھونٹ دیا جائے۔ انہیں ڈر تھا کہ کسی بھی طرح کی نکتہ چینی یہودی ریاست کو کمزور کر دے گی۔

''حبشِ حق'' سے بلیک لسٹ تک پہنچنا ایک چھوٹا سا قدم تھا۔ ۱۹۸۳ء میں AIPAC نے ایک کتابچہ بعنوان ''اسرائیل کے خلاف الزام تراشی کی مہم'' شائع کیا۔ ایگزیکٹو ڈائریکٹر تھامس اے۔ ڈائن نے دیباچے میں لکھا کہ یہ پمفلٹ اسرائیل مخالف سرگرمیوں کے بارے میں زیادہ آسان اور مکمل تجزیہ بہم پہنچانے کے لیے جاری کیا جا رہا ہے۔ ان الفاظ کے باوصف یہ پمفلٹ ایک عام سی بلیک لسٹ سے زیادہ کچھ نہ تھا۔

''اسرائیل کے خلاف الزام تراشی مہم'' پمفلٹ میں جو نام درج تھے ان میں سے ایک جارج پال تھا اور دوسرا الفریڈ للی اینتھل تھا۔ پہلا ایک سابقہ انڈر سکریٹری آف اسٹیٹ تھا۔ امریکہ کا جو اسرائیل کا نکتہ چیں تھا اور دوسرے نے ۱۹۵۴ء میں ہی بطور ایک صہیون مخالف یہودی کے ایک کتاب بنام: ''اسرائیل کس قیمت پر؟'' لکھ کر امریکی/ اسرائیلی تعلقات کے بارے میں انتباہ کیا تھا۔ مجموعی طور پر پمفلٹ میں ۲۱ تنظیموں اور ۳۹ افراد کے نام درج تھے جو امریکہ اور اسرائیل کے درمیان روابط کمزور کرنے کی کوششوں میں مصروف تھے جو امریکہ/عرب تعلقات کا فروغ اسرائیل کی قیمت پر چاہتے تھے یا پھر وہ لوگ تھے جو معاوضہ لے کر عرب حکومتوں کے لیے ان اہداف کے حصول کے لیے کام کر رہے تھے۔
B'nai B'rith (اصل یہودی تنظیم) کی ذیلی تنظیم "The Anti-Defamation League" نے بھی اپنی الگ بلیک لسٹ شائع کی جس کا نام: ''عرب پروپیگنڈہ امریکہ میں: آوازیں اور وسیلے'' رکھا۔

چیرل ریوبن برگ نامی اسکالر نے الزام لگایا کہ ان دونوں پمفلٹوں میں وہی میکارتھی والے زمانے کی تکنیک مترشح تھی... اپنے مخالفین پر پی۔ ایل۔ او نواز ہونے کا لیبل لگا کر کیچڑ اچھالا۔ جب ان بلیک لسٹوں کا استقبال اس قدر منفی ہوا تو AIPAC نے ان کا ایک سالانہ تصحیح شدہ ضمیمہ نکالنے کا ارادہ ترک کر دیا اور اسے زیر زمین لے گئی۔ اس نے اسرائیل مخالف افراد اور گروپس پر نگاہ تو لگاتار رکھی لیکن نتائج کو خفیہ طریقہ سے تقسیم کیا۔

AIPAC کے ایک سابقہ نوجوان تحقیق نگار گریگوری ڈی۔ سلے بوڈکن کے بقول تاحال AIPAC کی بلیک لسٹنگ اور دیگر کیچڑ اچھالنے والی حرکات کا جو اسرائیل نواز لابی خفیہ طور پر کرتی

ہے صرف ایک سطحی سا ہی انکشاف سامنے آیا ہے... AIPAC اپنے تحقیقی ڈیپارٹمنٹ کے اندر ایک خفیہ خانہ بھی رکھتی ہے جہاں سیاست دانوں کے بارے میں فائل کھلے ہوئے ہیں۔ تمام ایسے صحافی، اساتذہ، امریکی عرب سرگرم کارکن، لبرل یا آزاد خیال یہودی اور تمام دیگر جنہیں یہ لوگ یہودی مخالف گردانتے ہیں۔ ان کا ریکارڈ رکھا جاتا ہے۔ AIPAC بڑی رازداری سے اس میں سے اطلاعات چن کر ملزمان کی فہرست خفیہ طریقہ سے تقسیم کرتی ہے جس میں ان کی مبینہ سیاسی حرکاتِ بد کا اندراج ہوتا ہے اور ساتھ ہی ان کے بیانات کو سیاق وسباق سے ہٹ کر توڑ مروڑ کر بطور ثبوت پیش کیا گیا ہوتا ہے!

مثال کے طور پر CNN کے ایک تفتیشی نامہ نگار اسٹیو۔ ایمرسن کو جو اسرائیل نواز ہے ''نیشن'' کے ایک اسرائیل نکتہ چیں کالم نگار الیگزینڈر۔ کوک برن کے بارے میں مطلع رکھا جاتا ہے۔ انہوں نے ''دی وال اسٹریٹ جرنل'' والوں کو بھی عربوں کے بینک مفادات اور جارجیا کے بینکر برٹ لارنس کے بارے میں تحقیر آمیز اطلاعات فراہم کیں۔ ان کے دیگر اہداف میں وڈی ایلن۔ رچرڈ ڈریفس، ریٹا ہوسر اور باربرا ایسٹرائی سینڈ جیسے آزاد خیال یہودی بھی شامل ہیں۔

AIPAC کی تازہ ترین بلیک لسٹ ایک ہفتہ وار اشاعت ہے جس کا نام Activities ہے۔ اس میں ان افراد اور تنظیموں کے نام درج ہوتے ہیں جو اسرائیل پر تنقید کرتے ہیں۔ اس کتابچے کے ساتھ اپنے تعلق کو خفیہ رکھنے کی خاطر AIPAC اپنے قارئین کو یہ انتباہ کرتی ہے کہ وہ اس مواد کو استعمال کرتے وقت ہرگز ہرگز AIPAC کی جانب سے فراہم کئے جانے کا حوالہ نہ دیں!

Activities کے تقسیم کنندگان میں مندرجہ ذیل شامل ہیں:

AIPAC کا واشنگٹن اور علاقائی اسٹاف، بڑی بڑی یہودی تنظیموں کے لیڈران، ملک بھر کی یہودی فیڈریشنیں اور کمیونٹی ریلیشنز کونسلیں، اسرائیل نواز سرگرم کارکن، جامعاتی دانشوران، اسرائیلی سفارت خانہ اور چنیدہ چنیدہ اسرائیلی حضرات۔

AIPAC کے اس خفیہ سیل کا موجودہ سربراہ (کتاب ۱۹۹۳ء میں پہلی بار شائع ہوتی تھی۔ (مترجم) مائیکل لیوس ہے جو پرنسٹن یونیورسٹی کے ایک مستشرق برنارڈ لیوس کا بیٹا ہے۔ Activities کے بارے میں لیوس کا کہنا ہے کہ AIPAC کی تمام فراہم کردہ اطلاعات میں سے آخرکار Activities ہی کی سب سے زیادہ طلب ہے۔ یہی سب سے زیادہ پڑھا جاتا اور اچھی طرح

استعمال ہوتا ہے۔

بقول سلے بوڈکن کے اس اچھے استعمال میں وہ کیچڑ اچھالنے والی تحریکیں شامل ہیں جن میں اسرائیل مخالف سرگرمیوں کو بطور "New Anti-Semitism" کے پیش کیا جاتا ہے۔ سلے بوڈکن نے بتلایا کہ لیوس اپنے دفتر میں کئی سو ایسی فائلیں ان لوگوں اور تنظیموں کے بارے میں جنہیں AIPAC اسرائیل مخالف گردانتی ہے، تالا لگا کر محفوظ رکھتا ہے۔ جن سیاست دانوں کے بارے میں ایسی فائلیں موجود ہیں۔ ان میں سابقہ چیف آف اسٹاف جان اسنونو، سابقہ ریگن انتظامیہ میں سکریٹری آف ڈیفنس کا سپر وائن برگر اور فرینک کارلیوچی، سابقہ صدر جمی کارٹر، سابقہ ڈیموکریٹ صدارتی امیدوار جارج میکگورن، سینٹ کا اقلیتی لیڈر رابرٹ ڈول، ری پبلکن سینٹر جان چافی، ایوان نمائندگان کا اکثریتی وہپ ڈیوڈ بونیئر اور ڈیموکریٹ نمائندے جان کونیئر ز/ جان ڈنگل/ مروِن ڈیملی/ میری روز اوقر/ نک۔ جو۔ راحل/ جیمز ٹریفکینٹ/ جونیئر اور کئی دیگر شامل ہیں۔

لیوس کی اس فہرست میں صرف سیاست دانوں کے نام ہی شامل نہیں۔ ابلاغ عامہ کے اراکین، دل بہلانے والے اور اساتذہ بھی AIPAC کی اس خفیہ فہرست میں بطور اسرائیل دشمن درج ہیں... حتیٰ کہ سابقہ یرغمالی ٹیری اینڈرسن کی ہمشیرہ ''پیگی سے'' بھی اس میں شامل ہے۔

فریب ''ہم نے بہترین امریکہ یا بہترین دنیا کے لیے اپنی مساعی ترک نہیں کیں جب کہ ہم ساتھ ہی ساتھ اسرائیل کو محفوظ بنانے میں مشغول ہیں۔''

(ہائمن بک بائینڈر، امریکن جیوش کمیٹی کا سابقہ نمائندہ ۱۹۸۷ء)

حقیقت:

یہودی سرگرم کارکنوں کے دنیا بھر میں غربت اور انسانی حقوق جیسے ہمہ گیر اور مختلف موضوعات پر اظہار رائے کرتے رہنے کے باوجود AIPAC اور چندہ بانٹنے والی اسرائیل نواز ایکشن کمیٹیوں کے لیے صرف اور صرف ایک ہی مسئلہ ہے یعنی اسرائیل! یہ صورت حال ۱۹۵۰ء میں اسرائیل کی جانب لابی کرنیکی باقاعدہ کوششوں کے آغاز سے قائم ہے۔ ۱۹۹۲ء میں AIPAC کے صدر ڈیوڈ اسٹائینر کے بقول: ''میں سیاسی وفاداری میں یقین رکھتا ہوں اور اگر کوئی اسرائیل کے حق میں مفید ہے تو چاہے وہ کوئی بھی ہو!... چاہے میرا سگا بھائی ہی اس کے خلاف کیوں نہ ہو!... میں اس کی حمایت کروں گا کیونکہ وہ اسرائیل کے حق میں اچھے ہیں!''

صدر رچرڈ نکسن نے اپنی سوانح میں لکھا ہے: ''مجھے جن بڑے مسائل کا سامنا رہا ان میں سے ایک... امریکن یہودی فرقے کے ایک بڑے اور مؤثر طبقہ سے، کانگریس، ابلاغ عامہ اور معاشرتی دانشورانہ حلقوں کی جانب سے ایک غیر لچک دار کوتاہ نظری پر مبنی اسرائیل نواز رویہ تھا، دوسری عالمی جنگ کے خاتمہ کے بعد پچیس سال کے عرصہ میں یہ طرز فکر اس قدر پختہ ہو چکا تھا کہ بہت سے لوگوں کے لیے اسرائیل نواز نہ ہونا اسرائیل مخالف ہونے کے مترادف تھا۔ بلکہ اسے Anti-Semitism ہی خیال کیا جاتا تھا! میری یہ کوشش رائیگاں گئی کہ انہیں قائل کرسکوں کہ ایسا نہیں ہے!''

اس سے بھی پہلے ۱۹۵۶ء میں ایسی ہی شکایت سکریٹری آف اسٹیٹ جان فوسٹر ڈلس کو بھی تھی۔ اس نے دوستوں سے گلہ کیا: ''مجھے احساس ہے کہ اس ملک میں کوئی بھی ایسی خارجہ پالیسی (مشرق وسطیٰ کے بارے میں) روبہ عمل نہیں لائی جاسکتی جو یہودیوں کو منظور نہ ہو۔ جارج مارشل سابقہ سکریٹری آف اسٹیٹ اور جیمز فوریسٹل (سابقہ سکریٹری ڈیفنس) کو بھی ایسا ہی تجربہ ہوا!''... ڈلس نے بعد ازاں ایک مرتبہ کہا تھا: ''یہودی ذرائع ابلاغ عامہ پر خوفناک حد تک چھائے ہوئے ہیں۔ کانگریس میں نمائندوں پر یہودیوں کی یلغار ہے! مجھے اس حقیقت پر سخت تشویش ہے کہ یہودیوں کا اثر ونفوذ ہر طرف اس قدر چھا چکا ہے کہ کانگریس کوئی بھی ایسا کام نہیں کرسکتی جسے وہ منظور نہ کریں! اسرائیلی سفارت خانہ عملی طور پر کانگریس پر حاوی ہے اور یہ ملک کی ممتاز یہودی شخصیات کے ذریعے سے ہے۔''

یہ اثر ونفوذ اتفاقیہ نہیں! AIPAC کی جدِ امجد یعنی امریکن صہیونی کمیٹی برائے پبلک افیئرز نے پہلے پہل ۱۹۵۴ء میں ایوان نمائندگان اور سینٹ کے سبھی ۵۰۷ ممبران کی رائے معلوم کی۔ ان سب سے صرف یہی ایک سوال پوچھا گیا کہ اسرائیل اور مشرق وسطیٰ کے بارے میں ان کی رائے کیا ہے؟ ممبران کی جانب AIPAC کا رویہ تب سے اسی بات پر منحصر چلا آرہا ہے۔ AIPAC کا تھامس ڈائن اس ایک نکاتی اسرائیلی مسئلے پر بے حد فخر محسوس کرتا ہے۔ بقول اس کے ''ہم سب متفق ہیں کہ اصل مسئلہ صرف یہی ہے۔''

یہی وہ ذہنی یک رنگی ہے جو اسرائیل کے مضبوط حامیوں کو کانگریس میں منتخب کروانے کے بارے میں AIPAC کی حیرت انگیز کامیابیوں کی کلید ہے۔ اس کا انحصار بڑی حد تک اس بے تحاشا امداد پر ہے جو یہ اسرائیل نواز امیدواروں پر نچھاور کرتی ہے۔ حالانکہ AIPAC امیدواروں کو قانونی

طور پر رقوم نہیں دے سکتی پھر بھی بیشتر اسرائیل نواز پولیٹیکل ایکشن کمیٹیاں AIPAC کی چھان پھٹک کو نگاہ میں رکھتے ہوئے اپنے سرمائے کا رخ مطلوبہ امیدواروں کی جانب موڑتی ہیں۔

۱۹۹۱ء میں "Center for Responsive Politics" نے یہ ثابت کیا کہ ۱۹۹۰ء کے انتخابات میں اسرائیل نواز پولیٹیکل ایکشن کمیٹیوں نے کانگریس کے امیدواروں میں چالیس لاکھ ڈالر تقسیم کئے اور انفرادی چندہ دینے والوں نے بھی اپنے امیدواروں کو ۳۶ لاکھ ڈالر بذریعہ .P.A.C تقسیم کئے۔ جن لوگوں کو یہ رقوم دی گئیں وہ سبھی کٹر اسرائیل نواز تھے۔ سینٹ کے ۱۶ ممبران کو ان دونوں ذرائع سے فی کس ایک لاکھ ڈالر سے زائد رقم ملی۔ سب سے زیادہ رقم پانے والوں میں مندرجہ ذیل شامل تھے:

- کارل لیون۔ مشی گن/ ڈیموکریٹ — ۵۶۳٬۰۷۳ ڈالر
- ٹام ہارکن۔ آئیوا/ ڈیموکریٹ — ۳۴۴٬۶۵۰ ڈالر
- کلائی بورن پیل۔ رہوڈ آئی لینڈ/ ڈیموکریٹ — ۲۵۵٬۸۱۱ ڈالر
- پال سائمن۔ الی نوائے/ ڈیموکریٹ — ۴۴۹٬۴۱۷ ڈالر
- مچ۔ میک کونل۔ کینٹکی/ ری پبلکن — ۲۱۳٬۹۰۰ ڈالر

ایوان نمائندگان میں سب سے زیادہ رقوم پانے والے مندرجہ ذیل تھے:

- میل۔ لیون۔ کیلیفورنیا/ ڈیموکریٹ — ۸۹٬۷۷۹ ڈالر
- سڈنی۔ آر۔ ییٹس۔ الی نوائے/ ڈیموکریٹ — ۷۲٬۲۵۰ ڈالر
- ڈیوڈ۔ آر۔ اوبے۔ وسکون سن/ ڈیموکریٹ — ۵۷٬۹۴۹ ڈالر
- رون وائیڈن۔ اوریگن/ ڈیموکریٹ — ۵۳٬۳۴۰ ڈالر
- وین اوونز۔ یوتاہ/ ڈیموکریٹ — ۵۲٬۴۵۰ ڈالر

وال اسٹریٹ جنرل کی رپورٹ کے مطابق ۸۰ اسرائیل نواز PACs نے ۱۹۸۶ء کے انتخابات میں ۶۹۳۱۷۲۸ ڈالر خرچ کئے تھے۔ اس طرح یہ PAC ملک بھر میں ایک محدود مسئلے پر چندہ دینے والی سب سے بڑی تنظیمیں ٹھہریں! ان سے دوسرے نمبر پر امیدوار کی خرید و فروخت کا کاروبار کرنے والی پولیٹیکل کمیٹیاں تھیں جنہوں نے ۶۲۹۰۱۰۸ ڈالر دیے اور تیسرے نمبر پر امریکن میڈیکل ایسوسی ایشن تھی جس نے ۵۷۰۲۱۳۳ ڈالر دیے۔ ایک اور مطالعے سے یہ ظاہر ہوا کہ ان تمام

سینٹرز کو جنہوں نے ۸۶-۱۹۸۵ء میں اسرائیل نواز قوانین کے حق میں ووٹ دیا۔ فی کس اوسطاً ۵۴۲۲۳ ڈالران اسرائیل نواز PACs سے ملے۔ جنہوں نے اس کے برخلاف ووٹ دیے تھے ان کو اوسطاً ۱۲۶ ڈالر ملے۔ ۱۹۸۶ء میں منتخب ہونے والے یا دوبارہ جیت جانے والے سینٹروں کو اسرائیل نواز PACs سے ۱۹ لاکھ ڈالر ملے جو کہ دوسرے تمام نظریاتی گروپوں کی PACs سے مجموعی طور پر تین گنا تھے۔

بقول مصنف ایڈورڈ ٹفنان کے: ''حوصلہ مند امریکن سیاست دانوں میں سے شاید ہی کوئی یہودی سرمائے کی فراہمی کے بغیر اعلیٰ عہدہ کا خواب دیکھ سکے!''

نائب صدر ڈان کوئیل نے اعلان کیا تھا ''بطور ایک امریکی کے آپ کو ریاست اسرائیل کی حمایت میں اپنی آواز بلند کرنے کا پورا حق حاصل ہے... سیاسی عمل تک رسائی ہونا کوئی خصوصی اختیار نہیں!'' لیکن اسرائیل کے معاملے میں یہ حق بعض اوقات حیرت ناک نتائج پیدا کرتا ہے۔

۱۹۷۳ء کی جنگ میں ایڈمرل تھامس موور جوائنٹ چیف آف اسٹاف اور اسرائیلی ملٹری اتاشی مور ڈیکائی گور کے درمیان ایک تلخ مکالمہ ہوا۔ گور کا مطالبہ تھا کہ امریکہ اسرائیل کو فضاء سے زمین پر مار کرنے والے Maverick ٹینک شکن میزائل سے آراستہ جنگی ہوائی جہاز فراہم کرے۔ موور نے وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ امریکہ کے پاس ایسے ہوائی جہازوں کا صرف ایک ہی اسکواڈرن ہے اور اگر یہ بھی دے دیا گیا تو کانگریس میں طوفان اٹھ کھڑا ہوگا۔ موور کا کہنا تھا کہ گور نے کہا: ''تم جہازوں کا بندوبست کرو! کانگریس کو میں سنبھال لوں گا'' موور کا کہنا ہے کہ اس نے ایسا ہی کر دکھایا! ''میں نے آج تک کوئی بھی صدر...... چاہے وہ کوئی بھی تھا!...... ایسا نہیں دیکھا جو اسرائیل کے خلاف جا سکے! یہ تو ذہن ماؤف کر دینے والی بات ہے! وہ جو بھی چاہتے ہیں ہمیشہ حاصل کر لیتے ہیں!''

اسی جنگ کے دوران ایک اور مثال بھی ہے جب اسرائیل نے یہ محسوس کیا کہ اسے امریکہ سے مطلوبہ امداد نہیں مل رہی... امریکہ میں اسرائیلی سفیر سمچا۔ڈی۔نٹض نے سکریٹری آف اسٹیٹ ہنری کسنجر (جو کہ خود بھی یہودی تھا۔ مترجم) کو یہ دھمکی دی کہ ''اگر امریکہ نے اسرائیل کے لیے بہت بڑے پیمانے پر فضائی امداد کا آپریشن فوراً اور اسی وقت شروع نہ کیا تو میں سمجھوں گا کہ امریکہ اپنی یقین دہانیوں اور وعدوں سے مکر رہا ہے۔ ہم اس سب معاملے سے نہایت دور رس نتائج اخذ کریں گے!'' کسنجر کے سوانح نگار کالب برادران نے ڈی۔نٹض کا مفصل انٹرویو لیا۔ وہ اس فقرہ کے بارے

میں کہتے ہیں کہ ''ڈی۔ نفس کو اپنا پیغام سمجھانے کے لیے تردّد نہ کرنا پڑا۔ کسنجر کو فوراً ہی سمجھ آ گئی کہ اسرائیلی جلد ہی اس پیغام کو الم نشرح کر دیں گے۔ نتیجتاً اسرائیل نواز جذبات کا جو طوفان اٹھے گا وہ پہلے ہی سے کمزور انتظامیہ بھٹہ بٹھا دے گا!

ڈرانے اور دھمکانے کی ایک اور مثال صدر کارٹر اور اسرائیلی وزیر خارجہ موشے دایان کے مابین ہوئی۔ ۱۹۷۷ء کی ایک میٹنگ برائے امن کے دوران کارٹر نے معاً موضوع بدل کر کہا: ''آیئے! کچھ سیاست پر بات ہو جائے!'' کارٹر نے یہ تسلیم کیا کہ اسے امریکن یہودیوں اور کانگریس سے کچھ سیاسی چپقلش کا سامنا تھا۔ اس غیر دانش مندانہ اعتراف نے گویا موشے دایان کے ہاتھ گفت و شنید کے لیے ایک عمدہ حربہ تھما دیا۔ دایان نے اس فاش غلطی سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ اس نے صدر کارٹر کے سامنے مصر سے صلح پر راضی ہونے کے عوض کئی شرائط پیش کر دیں:

۱- معاہدہ طے کرنے کے لیے کسی قسم کا امریکی دباؤ نہ ڈالا جائے۔
۲- اسرائیل کی فوجی اور معاشی امداد میں ہرگز کوئی کمی نہ کی جائے۔
۳- امریکہ یہ اعلان کرے کہ اسرائیل کو ۱۹۶۷ء کی سرحدوں پر واپس نہیں جانا ہوگا!

اگر کارٹر ان تجاویز پر صاد کرے تو پھر دایان امریکی یہودیوں کو کہہ سکے گا کہ ''اتفاق ہو گیا ہے۔'' چنانچہ وہ خوش ہو جائیں گے۔ دایان نے مزید کہا کہ ''لیکن اگر اسے یہ پر مجبور ہونا پڑا کہ اسرائیل پی۔ ایل۔ او سے فلسطینی ریاست کے لیے بات کرے تو پھر امریکہ اور اسرائیل میں شور و غوغا مچے گا!'' ... چند امریکی سفارت کاروں کے خیال میں یہ بلیک میلنگ کے مترادف تھا۔ لیکن کارٹر نے صرف اتنا ہی احتجاج کیا کہ یہ محاذ آرائی اسرائیل کے حق میں بھی مفید نہ ہوگی۔

۱۹۷۲ء میں واشنگٹن میں اسرائیل کے سفیر یتزاق رابن نے رچرڈ نکسن کی انتخاب مکرر مہم کے دوران کھلم کھلا عوامی بیانات دیے۔ اسرائیل کے قومی ریڈیو پر ایک انٹرویو دیتے ہوئے رابن نے کہا: ''گو ہم ایک کیمپ کی جانب سے ملنے والی لفظی حمایت کی قدر کرتے ہیں لیکن دوسرے کیمپ کی طرف سے عملی امداد مل رہی ہے اور اس کی ہمیں زیادہ قدر ہے!'' واشنگٹن پوسٹ کو رابن کی امریکن داخلی سیاست میں دخل در معقولات ایک آنکھ نہ بھائی اور اس نے ایک اداریہ بعنوان ''ایک غیر سفارتی سفارت کار'' میں اس پر کڑی نکتہ چینی کی![1]

---

[1] یہ ایک یہودی اخبار ہے اور مطلب یہ کہ رابن ''نادان دوست'' کے رول سے باز رہے۔ مترجم

AIPAC کی ۱۹۷۲ء کی میٹنگ میں ایگزیکٹو ڈائریکٹر تھامس ڈائن نے صدر بش کے اس بیان کو براہِ راست چیلنج کیا جس میں اس نے اسرائیل کو دی جانے والی دس ارب ڈالر کی قرضہ کی ضمانتوں کے بارے میں AIPAC کی لابی کرنے کی کوششوں پر تنقید کی تھی۔ ڈائین نے دعویٰ کیا کہ ''بش نے امریکی شہریوں کے... اس بارے میں لابی کرنے کے... حق پر اعتراض کیا ہے۔ ۱۲ ستمبر ۱۹۹۱ء کا دن امریکہ کے اسرائیل نواز گروہ کے لیے ہمیشہ ہمیش ایک یوم سیاہ کے طور یاد رکھا جائے گا۔ ہندوستانی ہاتھی کی مانند ہم بھی اسے کبھی نہ بھلائیں گے۔ ہم بھاگنے والے نہیں۔ ہم یہیں رہیں گے اور ہرگز مرعوب نہیں ہوں گے!'' بقول ڈائین کے دس ارب ڈالر کی ضمانت قرضہ کا قضیہ ابھی ختم نہیں ہوا تھا۔ ''ہم اسے نہ چھوڑ سکتے ہیں اور نہ چھوڑیں گے حتیٰ کہ کامیابی ہمارے قدم چومے! آخر کار ہم یہ قرضہ ضمانت حاصل کر ہی لیں گے۔ ہمارا کام تو اب شروع ہوا ہے۔ ہمیں کانگریس میں مزید حامی پہنچانے کی ضرورت ہے!''

۱۹۹۲ء میں AIPAC کو کئی کڑے صدمات سے دوچار ہونا پڑا۔ اگست میں نئے منتخب شدہ اسرائیلی وزیر اعظم یتراق رابن نے اس تنظیم کو کھلے عام سرزنش کی۔ وہ دس ارب ڈالر کی ضمانت قرضہ کے بارے میں صدر بش سے متوقع منظوری حاصل کرنے کے لیے راستہ ہموار کرنا چاہتا تھا اور ساتھ ہی ساتھ وہ امریکی/ اسرائیلی باہمی تعلقات پر اپنی گرفت بھی مضبوط کرنا چاہتا تھا۔ اس نے AIPAC کے لیڈران کو سخت الفاظ میں تنبیہ کرتے ہوئے کہا: ''تم ہر جگہ ناکام رہے ہو۔ ہارنے والی جنگیں لڑتے رہے! تم نے بہت زیادہ مخالفت کو جنم دیا ہے۔''

نومبر میں AIPAC کے صدر ڈیوڈ اسٹائینر نے اس وقت استعفیٰ دے دیا جب اخبارات نے اس کے اس دعویٰ کی تشہیر کی کہ نومنتخب صدر کلنٹن کے اسٹاف میں اسے بذریعہ لابی بہت زیادہ عمل دخل حاصل تھا۔ اسی سال کے پرائمری اور جنرل الیکشن میں لابی کے بہت سے قابل اعتماد اور پرزور حمایتی ہار گئے۔ ان میں نمایاں نام یہ تھے۔

سینٹر رابرٹ ڈبلیو کاسٹن جونیئر/ اسٹیفن جے۔ سولارز... نیویارک سے میل لیون... کیلیفورنیا سے اور لارنس۔ جے۔ اسمتھ... فلوریڈا سے۔

ان ناکامیوں کے باوجود AIPAC کے تحلیل ہوجانے کی افواہیں غلط تھیں۔ اس تنظیم کا ڈیڑھ کروڑ ڈالر کا سالانہ بجٹ بچپن ہزار سے زائد پرجوش حامی جن میں سے بیشتر سیاسی اثر ونفوذ رکھتے ہیں... اس لابی کو تندرست وتوانا رکھنے کی بڑی وجوہ ہیں۔

❄ ❄

باب: ۱۴

اسرائیل کو امریکی امداد

ہر سال اسرائیل کو دی جانے والی امریکن امداد کسی بھی دوسرے ملک کو دی جانے والی امداد سے زیادہ ہوتی ہے۔ ۱۹۸۷ء سے لے کر اب تک براہِ راست دی جانے والی معاشی اور فوجی امداد تین ارب ڈالر یا زائد رقم پر مشتمل ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں جو دوسرے مالی معاملات صرف اور صرف اسرائیل کے لیے خصوصی طور پر طے پاتے ہیں۔ ان کو شامل کرکے یہ امداد تقریباً پانچ ارب ڈالر سالانہ تک جا پہنچتی ہے۔ اس میں اسرائیل کو ۱۹۹۲ء میں دی جانے والی قرضہ ضمانت جیسی فیاضانہ مراعات شامل نہیں ہیں۔ امریکی قانون کے مطابق کسی بھی ملک کو امداد... چاہے وہ اقتصادی ہو یا فوجی!... یکسر ختم کر دینی چاہیے۔ اگر وہ ملک جوہری ہتھیار بنالے یا پھر وہ ''عالمی طور پر تسلیم شدہ انسانی حقوق کی پائمالی کا مرتکب ہو رہا ہو'' امریکی حکومت کو سالہا سال سے اسرائیل کے جوہری اسلحہ خانے کے انبار کا اور اس کے حقوقِ انسانی کی لگاتار پائمالی کا علم ہے لیکن کسی بھی صدر یا کانگریس نے قانون کے مطابق امداد کو ختم کرنے کے اقدامات تو کجا اس کو کم کرنے کی کوشش بھی نہیں کی!

فریب ''اسرائیل کو امداد دینا نسبتاً ایک اچھا سودا ہے۔'' (AIPAC ۱۹۸۲ء)

حقیقت:

۱۹۴۹ء سے لے کر ۱۹۹۱ء تک امریکی حکومت نے جو امداد اور خصوصی فوائد اسرائیل کو مہیا کیے ہیں ان کا حجم ۵۳ ارب ڈالر بنتا ہے۔ اس عرصے کے دوران جو اقتصادی اور فوجی امداد امریکہ نے ساری دنیا کو دی یہ اس کا تیرہ فیصد بنتا ہے۔ اگر ۱۹۷۹ء میں جب مصر، اسرائیل امن معاہدہ طے پا گیا سے ۱۹۹۱ء تک اس کو دیکھا جائے تو یہ امداد ا۴۰ ارب ڈالر تھی۔ یعنی تمام امریکی امداد کا ۲۱.۵ فیصد! اس میں تمام کثیر الجہتی اور باہمی امداد شامل تھی۔

یہ دیکھتے ہوئے کہ اسرائیل کی آبادی پچاس لاکھ سے کچھ ہی زیادہ ہے۔ یہ اعداد وشمار دوسرے

ممالک بلکہ بعض عالمی خطوں کے مقابلہ میں بے حد غیر متناسب ہیں۔ دانشور چیرل۔ ریوبن برگ کے بقول: ''اسرائیل کو امریکی امداد کا حجم... فوجی، اقتصادی اور سفارتی سب ملا کر... عالمی نظام میں کسی بھی دو ممالک کے درمیان باہمی رسمی و روابط سے کہیں بڑھ کر ہے!''

پھر بھی یہ اعداد و شمار اسرائیل کو امریکی امداد کے پورے قصہ کی صرف تمہید ہی بتلاتے ہیں۔ ۱۹۹۲ء کے اوائل میں سابقہ اکثریتی لیڈر ڈیموکریٹ سینٹر (ویسٹ ورجینیا) رابرٹ بائرڈ نے پہلی مرتبہ کچھ غیر معروف تفصیلات سے پردہ اٹھایا۔ اس نے سینٹ میں کھڑے ہو کر کہا: ''ہم نے اسرائیل کو پچھلی کئی دہائیوں سے جو بیش بہا خارجی امداد جن شرائط پر دی ہے ویسی شرائط دنیا کے کسی بھی اور ملک کو حاصل نہیں ہیں اور یہ صرف امریکی قوم ہی ہے جو ایسا کر رہی ہے۔ ہمارے یورپی ہمسایوں نے مقابلتاً کچھ بھی نہیں دیا!''

اُس کی اِس پُر تحقیق تقریر کو ابلاغِ عامہ میں تقریباً نظر انداز کر دیا گیا۔ بائرڈ کے کچھ انکشافات مندرجہ ذیل ہیں:

(اغلباً قارئین کی توجہ اس طرف دلانے کی ضرورت نہیں کہ امریکی ابلاغِ عامہ کا کنٹرول کس لابی کے ہاتھ ہے۔)

- مالی سال ۱۹۷۹ء میں اسرائیل کی امداد تقریباً ۵ ارب ڈالر یعنی ۴ء۹ ارب ڈالر تھی۔ ۱۹۸۰ء میں امداد کی یہ سطح گر کر ۲ء۱ ارب ڈالر سے قدرے زائد رہی لیکن تب سے یہ لگاتار بڑھتے بڑھتے اب ۱۹۹۱ء میں ۳ء۷ ارب ڈالر پر آ گئی ہے۔ ۱۹۸۵ء میں ہم نے اسرائیل کے ایک اقتصادی بحران کے مدِ نظر تمام فوجی اور اقتصادی امداد کو قرضے کی بجائے عطیہ میں تبدیل کر دیا تھا۔ بعد ازاں ڈیڑھ ارب ڈالر بطور ضمنی امدادی پیکیج منظور کیے جانے پر ۱۹۸۵ء میں عطیے کا حجم ۱ء۴ ارب ڈالر تک جا پہنچا۔
- جب بھی اسرائیل پر کڑا وقت پڑا تو ہم نے اسے ہرگز بھلایا نہیں... ۱۹۹۰ء میں جب سوویت اور حبشہ سے یہودی آباد کاروں کا ریلا آیا تو امریکہ نے ۴۰ کروڑ ڈالر کی امداد ''بطور ہاؤسنگ قرضہ ضمانت'' کے فراہم کی۔ امریکہ نے جنگ خلیج کے دوران بھی اضافی امداد فوری طور بہم پہنچائی۔

اس کے علاوہ امدادی نکات اور خصوصی برتاؤ جو ۹۲-۱۹۹۱ء کے مالی سالوں کے قوانین میں شامل تھے وہ یہ ہیں:

● امریکی ہسپتالوں اور اسکولوں کے عطیاتی پروگرام میں بدستور شمولیت جو کہ ۱۹۹۱ء میں ۲۷ لاکھ ڈالر کے برابر تھے۔

● عربوں/اسرائیل کے باہمی امداد پروگراموں کے لیے ۷۰ لاکھ ڈالر میں سے تقریباً نصف اسرائیل کے اندر خرچ ہوتے ہیں۔

● چار کروڑ بیس لاکھ ڈالر "ARROW" (جو میدان جنگ میں بین البراعظمی میزائل کا توڑ ہے) کے پروگرام کو جاری رکھنے کے لیے دیے گئے۔ یہ رقم ۱۹۹۲ء کے دفاعی مالی بل میں بڑھ کر چھ کروڑ ڈالر تک جا پہنچی۔ علاوہ ازیں اسرائیل کو اپنی فوجی امداد میں سے ۴۷ کروڑ ۵۰ لاکھ ڈالر اب اپنے ہی ملک میں صرف کرنے کی اجازت بھی دی گئی جب کہ پیشتر ازیں یہ رقم امریکہ میں خرچ ہوتی تھی۔

● ۴۵ لاکھ بیرل کا اضافی محفوظ ذخیرہ پٹرول کا دیا گیا جس کی قیمت ۱۸ کروڑ ڈالر بنتی ہے۔ یہ اسرائیل اپنی کسی بھی ہنگامی صورت حال میں استعمال کر سکتا ہے۔

● اس کے علاوہ ۱۹۹۱ء میں حیفہ کی بندرگاہ میں فوجی سہولتوں کو ترقی دینے کے لیے ڈیڑھ کروڑ ڈالر دیے گئے اور ۱۹۹۲ء میں مزید ۲۰ لاکھ ڈالر عنایت کئے گئے تاکہ اس اضافی خرچ کا اندازہ لگایا جاسکے۔ اگر ایک ایئر کرافٹ کیریئر جنگی بحری بیڑہ اسے استعمال کرے تو مزید کن کن سہولیات کو ترقی دینا پڑے گی۔

● ان تمام کے علاوہ ''سمندر پار ورک لوڈ پروگرام'' میں انہیں خصوصی طور پر شامل رکھا گیا تاکہ اسرائیل امریکہ کے سمندر پار اپنے ساز و سامان کی مرمت، اوور ہال اور دیکھ بھال کے ٹھیکے میں شمولیت کر سکے۔

● ان سب کے علاوہ دس لاکھ ڈالر اسرائیل کے اندر سرمایہ کاری انشورنس کے لیے دیے گئے جو ''اوورسیز پرائیویٹ انویسٹمنٹ کارپوریشن'' نے مہیا کئے تھے۔

چند پیشگی قوانین جن سے اسرائیل کو دائمی فوائد حاصل ہوئے ہیں، یوں ہیں:

● ہر سال ایک ارب بیس کروڑ ڈالر کا اقتصادی امدادی فنڈ اور ایک ارب ننانوے کروڑ ڈالر کا

فوجی امدادی فنڈ فوراً منتقل ہوجاتے ہیں[1] اس طرح ہم جو عطیات اسرائیل کو فراہم کرتے ہیں وہ اسرائیل کے لیے ایک سود کمانے والے سرمایہ کی شکل میں ڈھل جاتے ہیں جب کہ ہمارے بجٹ خسارے میں اضافہ ہوجاتا ہے۔ اس کے نتیجہ میں ہمیں زیادہ شرح سود ادا کرنی پڑتی ہے۔ صرف ۱۹۹۱ء میں اس فوری منتقلی نے اسرائیل کو آٹھ کروڑ سات لاکھ ڈالر سود کی شکل میں بطور آمدنی فراہم کیے۔ یہ انتظامات ۱۹۸۲ء سے ہی اقتصادی امدادی فنڈ کے لیے جاری تھے جب کہ ۱۹۹۱ء میں انہیں فوجی امداد پر بھی محیط کر دیا گیا۔ ایسا کسی بھی اور ملک کے ساتھ نہیں کیا جاتا۔ اس کے علاوہ ۱۹۸۰ء کے اواخر میں قرضہ جات کی نئی ترتیب و تاخیر کی گئی جس سے اسرائیل کو اندازاً پندرہ کروڑ ڈالر سالانہ سود کی ادائیگی میں بچت ہوئی۔ اس کے علاوہ خارجی فوجی فروخت پروگرام کے تحت اسرائیل کو جو رعایت حاصل ہے... یعنی کچھ انتظامی اخراجات کی فیس جو بیرونی اسلحہ کی فروخت پر لی جاتی ہے... اس سے بھی اسے فائدہ ہوتا ہے۔ صرف ۱۹۹۱ء میں اسے اس مد میں اندازاً چھ کروڑ ڈالر کی بچت ہوئی۔

۱۹۸۴ء سے اسرائیل کو یہ اجازت حاصل ہے کہ وہ اپنی خارجہ فوجی امداد والے سرمایہ کا کچھ حصہ اسرائیلی ساختہ فوجی اشیاء کی خریداری میں خرچ کرلے۔ اسرائیل کو دوسرے تمام ممالک کی طرح اپنی جو جی امداد کے فنڈ کو صرف امریکی ساز و سامان کی خرید پر صرف کرنا لازم نہیں۔ ۱۹۹۱ء میں ہم نے ایک ارب اسی کروڑ ڈالر کے فوجی امدادی عطیہ میں سے اسرائیل کو یہ اجازت دی کہ وہ سینتالیس کروڑ پچاس لاکھ ڈالر اپنی مقامی دفاعی صنعت کے ساز و سامان خریدنے پر خرچ کرلے نہ کہ امریکی ساختہ اشیاء خریدنے پر۔ مزید برآں اسرائیل کو یہ اجازت بھی دی گئی کہ وہ پندرہ کروڑ ڈالر جو اسے ۱۹۹۱ء کی امداد کے تحت ملے تھے وہ اسے ریاستہائے متحدہ کے اندر ہی اپنے تحقیق و ترقی پروگرام پر خرچ کرسکتا ہے۔ ہم نے اسرائیل کے اندر بھی بارہ کروڑ ساٹھ لاکھ ڈالر مہیا کیے تھے تاکہ ARROW نامی اینٹی میزائل دفاعی سسٹم تیار کیا جاسکے۔ جب کہ اس مد میں مزید چھ کروڑ ڈالر ۱۹۹۲ء کے مالی سال میں دیے گئے تاکہ یہ پروگرام جاری رہے۔ مستقبل مین بھی اس پر اربوں ڈالر خرچ متوقع ہے۔

فریب ''امریکہ اسرائیل کو جو امداد اس کا معتدبہ حصہ قرض کی شکل میں ہوتا ہے جو بمع سودا

---

[1] فوری منتقلی سے مراد یہ ہے کہ نیا مالی سال شروع ہوتے ہی یہ رقوم خودبخود اسرائیل کے کھاتے میں درج ہوجاتی ہیں۔ کانگریس کی رسمی منظوری درکار نہیں... (مترجم)

ادا کردیا جاتا ہے اور کئی دوسرے ممالک کے برعکس اسرائیل اپنے قرض ادا کردیتا ہے... اور وہ بھی بروقت!" (AIPAC ۱۹۸۹ء)

حقیقت:

برسہا برس سے اسرائیل اپنے سارے قرضے جو وہ امریکہ سے وصول کرتا آیا ہے اس رقم سے ادا کرتا ہے جو امریکی خزانہ سے اسے بطور عطیہ ملتی ہے۔

۱۹۸۵ء سے اسرائیل کی ساری امریکی امداد بطور عطیہ ہے۔ یعنی اس کا یہ مطلب ہوا کہ اس سلسلے میں اسے ایک پھوٹی کوڑی بھی واپس نہیں کرنا ہوگی۔ جب اسرائیل ۱۹۸۵ء سے پیشتر مہیا کئے جانے والے قرضوں کا اصل زر اور سود ادا کرتا ہے تو وہ اس کام میں امریکی ٹیکس دہندگان کے ڈالر خرچ کرتا ہے۔ یہ عجیب وغریب معاملہ ۱۹۸۴ء میں اس وقت شروع ہوا جب کیلیفورنیا کے ڈیموکریٹ سینٹر ایلین کرنسٹن نے ایک ترمیمی بل پیش کیا جو اسی کے نام سے مشہور ہے۔ اس میں یہ درج ہے کہ ہر سال اسرائیل کو دی جانے والی اقتصادی امداد کم ازکم اس قرض کی ادائیگی (اصل زر بمعہ سود) سے زیادہ ہوگی جو اس نے امریکہ کو اس سال کرنی ہے۔ ۱۹۹۲ء میں سینٹ کے روبرو گواہی دیتے اس وقت کے سکریٹری آف اسٹیٹ جیمز بیکر سوئم کے کٹیلے الفاظ میں کرنسٹن ترمیم کے لحاظ سے "ہم ہمیشہ ہی اپنے قرضے اپنی اس رقم سے واپس لے سکتے ہیں جو ہم اسرائیل کو اس مقصد کے لیے مہیا کرنے کی منظوری دیتے ہیں!"

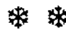
اس ترمیم سے اسرائیل کو یہ پختہ ضمانت حاصل ہوچکی ہے کہ اسے جتنا بھی قرض ادا کرنا ہے اسے اس سے زیادہ امریکی امداد ہمیشہ ملتی رہے گی۔ حقیقت حال یہ ہے کہ کانگریس اسرائیل کو ہمیشہ ہی اس ذمہ داری سے کہیں زیادہ امداد منظور کرتی ہے۔ کسی بھی دوسرے ملک کو ایسی مراعات حاصل نہیں ہیں۔

فریب "امریکی پالیسی کے کئی پہلو عربوں کے حق میں تھے۔" (AIPAC ۱۹۸۹ء)

حقیقت:

ماسواء مصر کے عرب ریاستوں کو جو امداد امریکہ سے ملتی ہے وہ زیادہ تر قابل واپسی قرضوں کی شکل میں اور بے حد قلیل ہوتی ہے۔ مصر کی خطیر مالی امداد اس وقت بطور انعام شروع ہوئی جب اس نے ۱۹۷۹ء میں اسرائیل سے امن معاہدہ کرلیا۔ اس امداد کے اخراجات پر کڑی نظر رکھی جاتی ہے اور مصر

کے لیے یہ لازم ہے کہ وہ نامزد شدہ منصوبہ پر اس کے خرچ کا حساب کتاب پیش کرے... برخلاف اس کے اسرائیل کو جو تمام اقتصادی امداد ملتی ہے وہ اس کے عام بجٹ میں بغیر کسی حساب کتاب کے شامل ہو جاتی ہے! وہ اسے اپنی مرضی اور خوشی سے جس طرح چاہے خرچ کر سکتا ہے۔ علاوہ ازیں اسرائیل کی امریکی امداد اس کی اقتصادی ضروریات سے کہیں بڑھ کر ہے۔ امریکہ نے اسے ''فوجی اتحادی'' بنا رکھا ہے اور غیر ناٹو ساتھی بھی! ''آزاد تجارت'' کا پروانہ بھی عطا کر رکھا ہے اور اعلیٰ ترین تحقیقاتی تکنیکی پروگرام (عرفِ عام میں ''اسٹارز وار''... (مترجم) میں شمولیت کی اجازت بھی دے رکھی ہے۔ صرف اسی پر بس نہیں! امریکہ دنیا بھر میں اور خصوصاً اقوام متحدہ میں اسرائیلی مفاد کی حفاظت کرتا ہے۔ صرف اس اعلانیہ انتباہ نے ہی کہ امریکہ اقوام متحدہ کے اخراجات میں اپنا حصہ دینا بند کر دے گا۔ دوسری اقوام کو اس اقدام سے باز رکھا ہوا ہے کہ وہ اسرائیل کو ''امن سے محبت نہ کرنے والا ملک'' قرار دے کر اسے عالمی برادری سے خارج کر دیں۔ حالیہ برسوں میں امریکی حق استرداد (VETO)... جسے امریکہ شاذ و نادر ہی استعمال کرتا تھا!... کے استعمال نے ہی اسرائیل کو ان کڑی اقوام متحدہ پابندیوں سے بچا کر رکھا ہوا ہے جو وہ سیکورٹی کونسل کی قراردادوں پر عمل نہ کرنے پر اس کے خلاف عائد کرنا چاہتی ہے۔



باب: ۱۵

اسرائیل کے لیے ضمانتِ قرضہ

اسرائیل اور امریکہ کے مابین ایک بدترین آویزش اس وقت ہوئی جب ۱۹۹۱ء میں اس نے دس ارب ڈالر کی ضمانت قرضہ طلب کی تا کہ وہ نووارد آباد کاروں کے لیے رہائشی عمارتیں اور متعلقہ سہولیات میں توسیع کر سکے۔

(گویا اسرائیل اس بات کی تحریری قانونی ضمانت مانگ رہا تھا کہ اگر اس نے قرضہ واپس نہ کیا تو امریکہ یہ رقم قرض خواہ کو خود واپس کرے گا... (مترجم)

اسرائیل کی ساکھ قرض خواہوں میں اتنی گر چکی تھی کہ امریکی ضمانتوں کے بغیر کہیں سے بھی مناسب شرح سود پر قرض نہ مل سکتا تھا۔ یہ کشمکش سال بھر سے زائد چلی۔ صدر بش کا اصرار تھا کہ سب مقبوضہ علاقے میں یہودی بستیوں کی تعمیر قطعاً روک دی جائے۔ وزیر اعظم یتزاق شامیر نے ایسی کسی شرط کو ماننے سے انکار کر دیا۔ جون ۱۹۹۲ء میں جب یتزاق رابن اقتدار میں آیا تو صدر بش نے چپکے سے یہ شرط نظر انداز کر دی۔ یکم اکتوبر ۱۹۹۲ء کو کانگریس نے یہ ضمانت منظور کر دی!

فریب ''اسرائیل کو قرضہ کی ضمانت صرف انسانی ہمدردی کی بنیاد پر امداد ہے جو امریکی ٹیکس گزاروں پر اثر انداز نہیں ہوتی۔''

(سینٹر رابرٹ۔ ڈبلیو۔ کاسٹن/ جونیئر، ری پبلکن/ وسکونسن ۱۹۹۲ء)

حقیقت:

اسرائیل کے لیے کانگریس نے جو دس ارب ڈالر قرضہ کی ضمانت کا بل منظور کیا ہے اس میں خاص طور پر یہ درج ہے کہ ضمانت کے سلسلے میں جو بھی انتظامی اور دیگر اخراجات ہوں گے وہ اسرائیل کے ذمہ ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اسی بل میں یہ بھی درج ہے کہ اسرائیل یہ ادائیگیاں اس رقم سے کرنے کا مجاز ہے جو اسے بطور اقتصادی امداد امریکہ سے ملتی ہے۔ گویا اس کا مطلب یہ ہوا کہ چاہے

یہ جس بھی بجٹ سے مہیا کی جائے اس کا بوجھ آخرکار امریکی ٹیکس گزاروں کو ہی برداشت کرنا ہے۔ اس میں اخراجاتِ بندوبست بھی شامل ہوں گے چاہے وہ کتنے ہی کیوں نہ ہوں!

علاوہ ازیں امریکی حکومت کے لیے یہ لازم ہے کہ وہ قانون کے مطابق اپنے بجٹ میں خاص رقم اس مد میں رکھے جو امریکی ضمانتی قرضوں کے کسی حصہ کی غیرادائیگی کی صورت میں اس کا ازالہ کر سکے۔ اسرائیل کو دی گئی ضمانتوں کے سلسلے میں یہ رقم چند ملین ڈالر سے لے کر آٹھ سو ملین ڈالر تک ہو سکی ہے۔ اصل رقم کا انحصار اس بات پر ہے کہ اس میں غیرادائیگی کے خطرے کا عنصر کس طرح متعین کیا جاتا ہے۔ امریکن ٹیکس گزاروں کو بہرحال یہ غیرادائیگی مکمل طور پر پوری کرنی ہوگی۔

یہ رقم چاہے جس قدر بھی ہو متحدہ بین الاقوامی، دفاعی اور داخلی استحقاق والے بجٹ سے ہی آئے گی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ داخلی اور دفاعی اخراجات کے علاوہ بین الاقوامی منصوبوں پر بھی اثرانداز ہوگی۔

مزید برآں ان ضمانتوں میں اسرائیل کے لیے کچھ ایسی رعایتیں بھی شامل ہیں جو اس قسم کے معاہدوں میں عام طور پر نہیں دی جاتیں۔ اس میں یہ شق بھی شامل ہے کہ کانگریس اسرائیل کے قرضوں کی بمعہ سود واپسی کے لیے سو فیصد ذمہ داری اٹھاتی ہے۔ جریدہ ''واشنگٹن جیوش ویک'' کے ۱۱رفروری ۱۹۳۳ء کے شمارے کے بموجب یہ ضمانتیں برائے قرضہ اسرائیل میں جن مقاصد کی تکمیل کے لیے استعمال ہوں گی وہ حیران کن حد تک انسانی ہمدردی کے برعکس ہیں یعنی ''بنیادی شہری سہولیات میں سرمایہ کاری، غیرملکی کرنسی کے ذخائر کا استحکام اور تاجر طبقہ کو سستے قرضوں کی فراہمی۔''

فریب ''انسانی ہمدردی والی امداد کا اس قدر کھلم کھلا اور شوریدہ سری والا استحصال جو اسرائیل کو ایک خاص راہ پر ڈالنے کے لیے کیا گیا پہلے کبھی نہیں ہوا!

''یٹزاق شامیر، اسرائیلی وزیراعظم ۱۹۹۲ء)

حقیقت:

امریکی قرضہ ضمانت جو وزیراعظم یٹزاق شامیر طلب کر رہا تھا وہ بنیادی طور پر انسانی ہمدردی کی امداد نہیں تھی۔ یہ تو بالواسطہ یا بلا واسطہ طور پر اسرائیلی مقبوضہ علاقوں میں غیرقانونی بستیاں بسانے اور گرتی ہوئی سوشلسٹ معیشت کو سنبھالا دینے کے لیے تھی۔ بش انتظامیہ نے بار بار یہ واضح کیا تھا کہ وہ روسی یہودی آبادکاروں کو بسانے کے لیے یہ ضمانتیں دینے پر تیار تھی بشرطیکہ اسرائیل مقبوضہ علاقوں

میں بستیوں کی تعمیر روک دے۔ شامیر نے ماننے سے انکار کر دیا۔

بیشتر امریکی یہودیوں نے بش کے اس اصرار کی مخالفت کی لیکن قابل ذکر بات یہ ہے کہ کئی ممتاز یہودی نمائندوں نے مخالفت نہیں کی۔ ان میں سے ایک مائیکل لرنر تھا۔ یہ ایک آزاد خیال جریدے ''تکن'' کا یہودی مدیر تھا۔ اس نے لکھا کہ ''یہ بش کا نہیں، شامیر کا قصور ہے!... شامیر مغربی کنارے پر ایسی حقیقتیں قائم کر رہا ہے جو زمین برائے امن کے ادلے بدلے کو ناممکن بنا دیں گی۔ گویا اب وہ امریکن حکمت عملی کی بنیاد ڈھانے کے لیے امریکہ ہی سے رقم طلب کر رہا ہے! یہ کیسی حماقت ہے؟''

دو اسرائیلی صحافیوں نے شامیر کے تکبر پر طنز کرتے ہوئے کہا: ''ہم امریکیوں کو بالکل صحیح اسرائیلی طرز کا پیغام دے رہے ہیں۔ رقم ہمارے حوالے کرو اور ہم پر بھروسہ رکھو سب ٹھیک ٹھاک ہوگا۔ آخر آپ کو تشویش کس بات کی ہے؟ دوستوں کے درمیان دس ارب ڈالر کیا وقعت رکھتے ہیں؟ جب تک امریکن راضی ہیں وہ اس طرح کے سارے فریب نگلتے ہی رہیں گے!''

شامیر کا کہنا تھا کہ اسرائیل کو قرضہ جات کی ضمانت فراہم کرنا امریکہ کی اخلاقی ذمہ داری تھی۔ اس معاملے کی ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ یہ اسرائیل ہی کی اختیار کردہ حکمت عملی تھی جس نے سوویت یہودیوں کے ریلے کا رخ اسرائیل کی جانب موڑا۔ سالہا سال سے اسرائیل امریکہ پر دباؤ ڈالتا رہا کہ وہ سوویت یہودی نو آباد کاروں کے امریکہ میں داخلے کو محدود کر دے تاکہ وہ اسرائیل کا رخ کریں۔ اسرائیل کی تشویش کا سبب یہ تھا کہ ۱۹۸۸ء تک روس سے ترک وطن کرنے والے یہودیوں کی اکانوے فیصد تعداد اسرائیل کے علاوہ دیگر ممالک کا رخ کرتی تھی۔ اس سے گذشتہ سال یہ تعداد ستر فیصد تھی اور اسرائیلیوں کو ڈر تھا کہ جلد ہی یہ سو فیصد ہو جائے گی۔

واشنگٹن نے آخرکار اسرائیل کی خواہش کے آگے سر تسلیم خم کر دیا اور یکم اکتوبر ۱۹۸۹ء میں روس سے ترک وطن کر کے امریکہ آنے والے یہودیوں کے کوٹے کو پچاس ہزار سالانہ کر دیا۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ روس چھوڑنے والے یہودیوں کو زیادہ تر اسرائیل کا رخ کرنا پڑا اور عین یہی اسرائیلی چاہتے تھے۔

اس سب کے باوجود نو وارد آمدہ لوگوں کو مناسب ملازمتیں اور رہائش مہیا نہ ہو سکنے کے باعث اسرائیل کے وہ ابتدائی تخمینے پورے نہ ہو سکے جس کے تحت تین سے پانچ برس کے اندر اندر دس لاکھ

سوویت یہودیوں کا ترک وطن کر کے آنا متوقع تھا۔ ستمبر ۱۹۸۹ء سے ۱۹۹۱ء کے اواخر تک ترک وطن کر کے آنے والے اس ریلے میں صرف تین لاکھ اٹھائیس ہزار ایک سو ستاسی افراد آئے۔ جنوری ۱۹۹۲ء میں یہ تعداد گھٹ کر صرف چھ ہزار دو سو سینتیس ماہانہ پر آگئی جو پچھلے دو برس میں کم ترین تھی۔ ہزاروں مہاجر اپنی غلط فہمی دور ہو جانے پر واپس روس جا رہے تھے۔ اگست ۱۹۹۲ء میں کیٹو انسٹی ٹیوٹ کی ایک اسکالر شیلڈن۔ آئی۔ رچ مین کے بقول: ''خروج ترک وطن کر کے آنے والوں سے بڑھ گیا ہے... کیونکہ سوویت یونین سے آنے والے مہاجرین کا تقریباً نصف حصہ بیکار بیٹھا ہے۔''

لہٰذا وہ ابتدائی تخمینے جو مہاجرین کی تعداد کے بارے میں قائم کر کے یہ دس ارب ڈالر کی ضمانتیں مانگی گئی تھیں، تقریباً آدھے غلط تھے۔ زیادہ امکان یہ تھا کہ ۱۹۹۴ء کے اخیر تک پانچ لاکھ سے بھی کم سوویت یہودی ترک وطن کر کے اسرائیل آئیں گے۔ اس بناء پر امریکی قرضہ ضمانت... اگر یہ جائز بھی تھی جو کہ میں تسلیم نہیں کرتا!... پانچ ارب ڈالر سے زائد ہرگز نہ ہونی چاہیے تھی!

اسرائیل کا آخر کار امریکی قرضہ ضمانت کے بغیر گزارہ بھی نہ تھا۔ جب یٹزاق شامیر کے تکبیر کی وجہ سے بش انتظامیہ نے یہ ضمانت روک رکھی تو اسرائیلی رائے دہندگان نے اسے انتخاب میں شکست دے کر اس کی تصدیق بھی کر دی۔ اسرائیلی اہلکاروں کے اکثر یہ بیان دینے کے باوجود کہ انہیں واقعی امریکی ضمانت کی ضرورت نہیں۔ ان کے پاس اتنے وسائل ہرگز نہ تھے کہ وہ امریکی امداد سے بے نیاز ہو کر مقبوضہ علاقہ جات میں اس قدر بے مثال رفتار سے آنے والے مہاجرین کی آبادکاری کر سکتے اور نہ ہی شامیر کو اسرائیل کے اندر وہ ہر دل عزیزی میسر تھی کہ وہ ۱۹۹۲ء میں دوبارہ منتخب ہو سکے۔

بہر طور شامیر نے ہر حربہ آزما لیا۔ اسرائیلی عبرانی روزنامے 'ہداشوط' نے خبر دی کہ امریکہ میں بڑی بڑی یہودی تنظیموں نے بش انتظامیہ کے آبادکاری کو منجمد کر دینے پر اصرار کے بعد کئی مالدار یہودیوں سے ایسی ہی قرضہ ضمانت کا بندوبست کرنے کی کوشش کی گئی لیکن ان یہودی امریکنوں نے اسرائیل کے قرضہ لوٹانے پر اعتبار کرنے سے انکار کر دیا۔ 'ہداشوط' کی رپورٹ کے بموجب یہودی گروپ نے دنیا کے پانچ سو امیر ترین افراد کی فہرست میں سے بیس یہودی ارب پتیوں کو چن کر یہ درخواست کی کہ وہ سوویت ترک وطن کر کے آنے والے یہودیوں کی آبادکاری کے لیے دیے گئے قرضہ جات کی ضمانت دیں۔ ان سب... بیس کے بیس نے!... صاف انکار کر دیا حالانکہ وہ سیاسی طور پر اسرائیل نواز تھے۔ ان کا اصرار تھا کہ بطور ایک تاجر کے جسے صرف منافع کمانے سے غرض ہوتی ہے وہ

کسی ایسی ریاست کو قرضہ کی ضمانت فراہم نہیں کرسکتے جس کی قرضہ واپس کرنے کی اہلیت اس قدر ناقابل اعتبار ہو۔

فریب ''میرے خیال میں انتظامیہ کا یہ کہنا کہ (قرضہ کی ضمانت کو اسرائیلی بستیاں بسانے کے عمل سے روکنے کے ساتھ مشروط کردیا جائے) مشرق وسطیٰ کی امن بات چیت میں دقت کا باعث ہے کیونکہ اس سے امریکہ کی غیر جانب داری بطور ثالث مجروح ہوتی ہے۔''

(سینٹر آرلن اسپیکٹر، ری پبلیکن/ پنسلوینیا ۱۹۹۲ء)

حقیقت:

حقیقت یہ ہے کہ یہ قرضہ ضمانت منظور کر کے کانگریس اور بش انتظامیہ نے ایک بار پھر یہ ثابت کردیا ہے کہ بنیادی طور پر امریکہ مشرق وسطیٰ کے معاملہ میں ایک ایماندار ثالث نہیں ہے۔ اسرائیل کے ۱۹۶۷ء میں عرب علاقے ہتھیا لینے کے وقت سے امریکہ کی پالیسی... بقیہ تمام دنیا کے ہمراہ... یہی رہی ہے کہ مقبوضہ علاقے میں بشمول مشرقی یروشلم کے یہودی بستیاں بسانے کی سرکاری طور پر مخالفت کی جائے۔ لیکن کانگریس پھر بھی اسرائیل کی فیاضانہ امداد جاری رکھے ہوئے ہے۔ اسرائیل رسمی طور سے یہ وعدہ کرلیتا ہے کہ وہ اس امداد کو مقبوضہ علاقہ میں خرچ نہیں کرے گا لیکن اُسی قدر رسمی طور پر وہ یہ وعدہ ایفاء نہیں کرتا اور واشنگٹن صرف چشم پوشی سے کام لیتا ہے! بغیر امریکی امداد کے اسرائیل کسی طور بھی مقبوضہ علاقوں میں اپنی نوآبادکاری جاری نہیں رکھ سکتا۔

فریب ''موجودہ ہدایات کے تحت اسرائیل کسی بھی امریکی خارجہ امداد کو اپنی ۱۹۶۷ء والی سرحدوں کے ماوراء استعمال نہیں کرسکتا۔ اسرائیل ان ہدایات پر سختی سے کاربند ہے اور وہ ہر سال تمام امریکی امداد کے اخراجات کا مفصل گوشوارہ پیش کردیتا ہے۔'' (AIPAC ۱۹۹۲ء)

حقیقت:

بش انتظامیہ کو معلوم تھا کہ اسرائیل کے لیکڈ وزیر اعظم یٹزاق شامیر کے دور میں ان کے وعدوں پر اعتبار نہیں کیا جاسکتا۔ یہ اس وقت صاف عیاں ہوگیا جب ۱۹۹۱ء میں وائٹ ہاؤس نے چالیس کروڑ ڈالر بطور قرض ضمانت کے جاری کیے۔ اسرائیل نے وعدہ کیا تھا کہ وہ یہ رقم مقبوضہ علاقوں میں خرچ نہیں کرے گا لیکن اسرائیل اپنے وعدہ سے منحرف ہوگیا۔

جنرل اکاؤنٹنگ آفس نے اپنی ۱۹۹۲ء کی رپورٹ میں اسرائیل کی یقین دہانیوں کے بارے

میں کہا کہ اسرائیل نے مقبوضہ علاقوں میں سرکاری اخراجات کا کوئی بھی حساب کتاب وعدہ کے مطابق مہیا نہیں کیا۔ اس رپورٹ میں یہ نتیجہ اخذ کیا گیا تھا "ہم نے یہ دیکھا کہ اس چالیس کروڑ ڈالر قرضہ ضمانت پروگرام کا اسرائیل کی تعمیراتی پالیسی کا ذرہ بھر اثر اسرائیلی حکومت کے اُن فیصلوں پر نہ ہوا کہ مقبوضہ علاقوں میں کس طرح کی اور کتنی تعمیرات کی جائیں۔ اس قرضہ ضمانت کا سب سے بڑا فائدہ اسرائیلی حکومت کو صرف یہ ہوا کہ انہیں کمتر شرح سود پر قرض میسر آ گیا۔"

اسی مطالعے میں اسرائیلی اور اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کے ان تخمینوں کا، کہ کتنے نئے مہاجر ان علاقوں میں داخل ہو رہے تھے واضح تضاد سامنے آیا۔ ان کا کہنا تھا کہ اسرائیلی حکام کے اندازے کے مطابق ۱۹۹۰ء کے مہاجرین میں سے پندرہ سو نے مقبوضہ علاقوں میں بسنا پسند کیا۔ لیکن اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کا اندازہ اس سے کہیں بڑھ کر تھا۔ بقول ان کے "ایک لاکھ پچاسی ہزار سوویت تارکین وطن میں سے آٹھ ہزار آٹھ سو نے ۱۹۹۰ء کے دوران مقبوضہ علاقوں میں رہائش اختیار کی۔ ہم اس تضاد میں توافق پیدا نہ کر سکے۔"

ویسٹ ورجینیا کے ڈیموکریٹ سینٹر رابرٹ۔ سی۔ بائرڈ (سینٹ کی امداد تقسیم کرنے والی کمیٹی کا چیئرمین) کا کہنا تھا کہ اسرائیل کا یہ قول کہ وہ ان رقوم کو مقبوضہ علاقوں میں خرچ نہیں کرے گا۔ ایسے ہی تھا جیسے کوئی کاغذ سے بند باندھے۔ جو بھی رقم اسرائیل اس ضمانتی پروگرام کے تحت قرض پر حاصل کرتا تھا وہ سیدھی اسرائیلی خزانے میں داخل ہو جاتی اور یوں فوراً اپنی شناخت کھو بیٹھتی! بعد ازاں بائرڈ نے کہا "بدقسمتی سے یہ باہمی تعلق کسی بھی طور اسرائیلی پالیسی پر اثر انداز نہیں ہوتا تھا... حقیقت یہ تھی کہ مقبوضہ علاقوں میں نو آبادکاروں کی تعداد جو ۱۹۸۹ء میں پچھتر ہزار تھی ۱۹۹۱ء میں بڑھ کر ایک لاکھ چار ہزار ہو گئی!"

۱۹۹۲ء کے اوائل میں ۱۹۶۷ء میں ہتھیائے گئے عرب مقبوضہ علاقے میں آباد یہودیوں کی تعداد دو لاکھ بیالیس ہزار ہو چکی تھی۔ ایک لاکھ انتیس ہزار یہودی عرب مشرقی یروشلم میں ستانوے ہزار مغربی کنارے کی ۱۸۰ بستیوں میں اور پانچ ہزار غزہ کی پٹی کی ۱۶ بستیوں میں اور چودہ ہزار جولان کی پہاڑیوں پر ۲۰ بستیوں میں آباد تھے۔ فلسطینی آبادی مغربی کنارے میں دس لاکھ غزہ کی پٹی میں ساڑھے سات لاکھ اور مشرقی یروشلم میں ایک لاکھ پچاس ہزار تھی۔ مزید برآں جولان کی پہاڑیوں پر پندرہ ہزار شامی باشندے بھی تھے۔ شامیر کے جنگجو وزیر تعمیرات ایریئل شیرون نے ۱۹۹۱ء کے آخر میں

یہ کہا تھا کہ اس کی تازہ تعمیراتی سرگرمیوں میں مقبوضہ علاقوں میں اس قدر رہائشی یونٹ تعمیر کرنے کا منصوبہ تھا جس سے وہاں اگلے تین سال میں ہر سال چالیس ہزار سے لے کر ایک لاکھ بیس ہزار کے درمیان نو وارد یہودی تارکین وطن کو بسایا جا سکے۔

۲۲ رجنوری ۱۹۹۲ء کو اسرائیل کے ایک گروپ ''امن ابھی!'' کے ایک مطالعہ سے پتہ چلا کہ اسرائیل نے ۱۹۹۱ء میں مقبوضہ علاقوں میں تیرہ ہزار چھ سو پچاس ہاؤسنگ یونٹ بنانے شروع کئے تھے جن پر ایک ارب ڈالر لاگت آئی تھی۔ پچھلے ۲۳ سالوں میں ان علاقوں میں جو بھی تعمیرات ہوئی تھیں یہ موجودہ سالانہ اضافہ اس کے ۶۵ فیصد کے برابر تھا۔ ان اعداد و شمار میں وہ دس ہزار سے زائد یونٹ جو مشرقی یروشلم اور جولان کی پہاڑیوں پر تعمیر تھے، شامل نہیں!

واشنگٹن پوسٹ کے نامہ نگار جیکسن ڈاہل کے ۱۹۹۲ء کے اوائل میں لکھے الفاظ میں ''ان پچھلے اٹھارہ ماہ میں وزیر اعظم شامیر کی حکومت نے ان علاقوں کے چوبیس سالہ دور حکومت کا سب سے بڑا رہائشی تعمیرات کا پروگرام شروع کیا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ شامیر کی حکومت اس پروگرام کے اصلی خدوخال اور اس پر اٹھنے والے خرچ کے بارے میں دوسروں کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کی پالیسی پر عمل پیرا ہے۔''

سینٹ میں ایک تقریر کے دوران سینٹر بائرڈ کا یہ کہنا تھا کہ ۱۹۹۱ء کے دوران مقبوضہ علاقوں میں اسرائیل کا نو آبادکاروں کو بسانے کا پروگرام... جس میں عرب مشرقی یروشلم بھی شامل تھا... مجموعی طور پر تین ارب ڈالر کا تھا۔

بین الاقوامی قانون کے ماہر فرانسس اے۔ بوئل کی رائے میں یہ قرضہ ضمانتیں اسرائیل کو فلسطینیوں کے حقوق پائمال کرنے پر اکساتی بھی ہیں اور امداد بھی مہیا کرتی ہیں۔

دس ارب ڈالر کی یہ نئی قرضہ ضمانتیں اسرائیلی قبضہ میں دائمی امریکی ساجھے کا باعث بنتی ہیں۔ گو متعلقہ قانون میں یہ پابندی موجود ہے کہ یہ قرضے ان سرحدوں سے باہر استعمال نہیں کئے جائیں گے جو اسرائیل کو ۵ رجون ۱۹۶۷ء کو حاصل تھیں لیکن یہ بیکار محض ہے۔ وزیر اعظم یتزاق رابن نے ڈنکے کی چوٹ یہ اعلان کیا کہ اسرائیل غربی کنارے کی گیارہ ہزار تکمیل پذیر ہاؤسنگ یونٹوں کو مکمل کرنے کی اجازت دے گا اور عرب مشرقی یروشلم میں نئے یہودی گھروں کی تعمیر پر کوئی پابندی عائد نہیں کرے گا اور نہ ہی وادی اردن اور جولان کی پہاڑیوں پر ''حفاظتی بستیوں'' کی تعمیر پر کوئی قدغن لگائے

گا۔ اس کا کہنا تھا کہ یہ اسرائیلی حکومت کا حق ہے کہ وہ یہ فیصلہ کرے کہ حفاظت کے نقطۂ نظر سے کون کون سی بستیاں بسانا ضروری ہے۔ اس پالیسی کے تحت اسرائیل مقبوضہ علاقوں میں یہودی بستیوں کے پھیلاؤ کو بغیر کسی پابندی کے جاری رکھ سکتا ہے۔ اسرائیل نواز حلقوں کے اثر ونفوذ کا ہی صدقہ تھا کہ رابن کے اس اعلان پر پنسلوینیا ایونیو کے دونوں سروں یا کہیں سے بھی ذرّہ بھر احتجاج سنائی نہ دیا![1]



[1] ''پنسلوینیا ایونیو'' کا اشارہ وفاقی ایوان ہائے حکومت امریکہ کی جانب سے ہے... (مترجم)

باب: ١٦

اسرائیل کی امریکہ کے بارے میں مخبری!

اسرائیل پچھلی کئی دہائیوں سے معمول کے مطابق ریاستہائے متحدہ کی جاسوسی کرنے میں مشغول ہے۔١٩٨٠ء کی دہائی کے وسط میں امریکی نژاد اسرائیلی جاسوس جوناتھن۔ جے۔ پولارڈ اور اس کی بیوی کا گرفتار ہونا اور سزا پانا اس لگاتار جاسوسی عمل کا جو اسرائیل امریکہ کے خلاف جاری و ساری رکھے ہوئے ہے صرف ایک انتہائی ڈرامائی ثبوت تھا!

واشنگٹن پوسٹ کے الفاظ میں: ''اسرائیلی جاسوسی اداروں نے حساس معلومات اور تکنیکی معلومات حاصل کرنے کی غرض سے امریکی حکومتی اہلکاروں کو رشوت دینا، ان کے ذرائع اطلاعات کو ٹیپ کرنا، خفیہ آلات نصب کرنا اور بلیک میلنگ کرنا سبھی ذرائع اختیار کیے۔''

فریب ''ریاستہائے متحدہ کی مخبری کرنا ہماری پالیسی کے بالکل خلاف ہے۔''

شمعون پیریز، اسرائیلی وزیراعظم ١٩٨٥ء)

حقیقت:

واشنگٹن پوسٹ نے اسرائیل کی امریکہ کے بارے میں مخبری کا بھانڈہ اس ٤٧ صفحہ کی سی۔ آئی۔ اے۔ کی خفیہ رپورٹ سے پھوڑا جو ''اسرائیل خارجہ سراغ رسانی اور سیکورٹی سروسز'' کے عنوان سے اس نے مارچ ١٩٧٩ء میں شائع کی۔ یہ رپورٹ تہران میں نومبر ١٩٧٩ء میں اس وقت انتہا پسندوں کے ہاتھ لگی جب انہوں نے امریکی سفارت خانہ پر قبضہ کیا۔ گو اسرائیل اور اس کے حواریوں نے اس رپورٹ کے اصلی ہونے پر شک کا اظہار کیا لیکن کسی امریکی سرکاری اہلکار نے ایسا نہیں کیا۔

اس رپورٹ کے مطابق عرب ممالک اسرائیل کی انٹیلی جنس سرگرمیوں کا پہلا ہدف تھے اور بقول اس رپورٹ کے دوسرا اور تیسرا اہم ہدف بالترتیب ''اسرائیل کے بارے میں... امریکی خفیہ پالیسی یا فیصلوں کے بارے میں معلومات جمع کرنا... امریکہ اور دوسرے ترقی یافتہ ممالک سے سائنسی

انٹیلی جنس معلومات جمع کرنا تھے۔" اسرائیلی اپنی خفیہ سرگرمیوں کا ایک معتد بہ حصہ سائنسی/تکنیکی معلومات جمع کرنے میں صرف کرتے تھے... اس میں امریکہ اور دوسرے مغربی ممالک کے انتہائی حساس اور خفیہ ترین دفاعی منصوبوں کے اندر گھسنے کی کوششیں بھی شامل تھیں۔

بعد ازاں یہ بھی عیاں ہوا کہ ۱۹۶۰ء اور ۱۹۷۰ء کی دہائیوں میں ایف۔ بی۔ آئی اور فوج کی اینٹی سراغ رساں ایجنسی نے مشترکہ طور پر ایک پروگرام بنام "اسکوپ" چلایا تھا جس کا مقصد اسرائیل کو اس بات سے روکنا تھا کہ وہ امریکی ایجنٹ بھرتی کر کے حساس نوعیت کی فوجی تکنیکی معلومات نہ چرا سکے۔ اس منصوبے میں اسرائیلی سفارت خانے کی بات چیت ٹیپ کرنا اور الیکٹرانک نگرانی شامل تھے۔ ۱۹۷۰ء کی دہائی کے اوائل میں اس بناء پر یہ پروگرام (SCOPE) ختم کرنا پڑا کہ شاید اس سے امریکیوں کے دستوری حقوق کی خلاف ورزی ہو رہی تھی۔

اس کے بعد اپنی ۱۹۹۰ء کی ایک کتاب میں ایک سابقہ اسرائیلی خفیہ ایجنٹ وکٹر آسٹروفسکی نے یہ انکشاف کیا کہ اسرائیل تقریباً چوبیس سے لے کر ستائیس تک موساد (اسرائیلی خفیہ ایجنسی) ایجنٹ امریکہ میں تعینات رکھتا تھا۔ یہ اس کی ایک انتہائی خفیہ انٹیلی جنس ڈویژن "AL" کے ممبران ہوتے تھے۔ عبرانی زبان میں "AL" کا مطلب اوپر اور اعلیٰ کے ہیں۔ بقول اس کے اسرائیلی خفیہ ایجنسی جاسوسی کرتی ہے۔ ایجنٹ بھرتی کرتی ہے اور خفیہ منصوبوں کو روبہ عمل لاتی ہے۔ یہ کام وہ زیادہ تر نیویارک اور واشنگٹن میں انجام دیتی ہے جسے وہ اپنی زبان میں اپنے کھیل کا میدان پکارتے ہیں۔ اس نے لکھا کہ اسرائیل کانگریس پر اثر انداز ہونے کے لیے کلیدی اہمیت پر متعین سینٹروں اور نمائندگان کے لیے یہودی معاون بھرتی کرتی ہے۔

ایک اور محقق نے لکھا ہے کہ وسط ۱۹۶۰ء سے لے کر ۱۹۸۰ء کی دہائی کے وسط تک اسرائیل نے امریکہ کے اندر اتنے منصوبے چلائے کہ اس بارے میں چالیس سرکاری تحقیقات ان امریکنوں کے خلاف ہوئیں جو اسرائیل کے لیے کام کر رہے تھے۔ ان کا کہنا تھا: "امریکی اہلکار کا بیان ہے کہ اسرائیل اس بارے میں انتہائی پر اعتماد ہیں کہ وہ بلا خوف و خطر امریکہ کے بارے میں جاسوسی کر سکتے ہیں۔"

فریب "پولارڈ کی گرفتاری پر اسرائیل نے فوراً معذرت کی اور کہا کہ یہ بلا اجازت تھا۔"

(AIPAC ۱۹۹۲ء)

حقیقت:

۴؍مارچ ۱۹۸۷ء کو امریکی شہریوں جوناتھن جے، پولارڈ اور محترمہ این، ہینڈرسن پولارڈ نے مشترکہ طور پر اسرائیل کے لیے جاسوسی کرنے کا اعتراف کیا۔ اسے عمر قید اور اس کی بیوی کو پانچ سال قید کی سزا دی گئی تھی۔ اس کی بیوی کو ڈھائی سال قید گزارنے کے بعد رہا کر دیا گیا۔ مصنف سیمور ہرش نے پورلاڈ کو ''اسرائیل کے اوّلین جوہری جاسوس'' کا خطاب دیا کیونکہ اس کے دعوے کے مطابق پولارڈ نے امریکی جوہری بموں کے نشانوں کے بارے میں اسرائیلی خفیہ سروس کو معلومات فراہم کیں جو وزیر اعظم یٹزاق شامیر نے جزوی طور پر ۱۹۸۰ء کی دہائی کے اوائل میں واشنگٹن/ ماسکو سرد جنگ کے دور عروج میں سوویت یونین کو پہنچا دیں۔

اسرائیل کے لیے کی جانے والی اس اٹھارہ ماہ کی جاسوسی کے دوران جس کا پولارڈ خود اعتراف کر چکا تھا۔ اس نے ہزار سے زائد خفیہ دستاویزات چرائیں۔ ان میں سے آٹھ سے زائد پر ''حساس ترین انتہائی خفیہ'' کی مہر ثبت تھی۔ ان میں بعض دستاویزات سو صفحات سے بھی زائد پر مشتمل تھیں۔ ان میں سے بیشتر تفصیلی تحقیقاتی مطالعہ جات بمع تکنیکی اعداد و شمار، گراف اور سیارچوں سے لی گئی تصاویر پر مشتمل تھیں۔ دیگر دستاویزات میں ایسے تفصیلی پیغامات درج تھے جن سے امریکی بحری جہازوں کی پوزیشن، بحریہ کے داؤ پیچ اور تربیتی مشقوں کے بارے میں معلومات ملتی تھیں۔ اس میں سوویت میزائل نظام کے بارے میں تحقیقی معلومات درج تھیں جن سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ امریکی کس طرح یہ معلومات حاصل کرتے ہیں۔ اس میں ان امریکی ایجنٹوں کی شناخت کے بارے میں اشارے بھی درج تھے جو امریکہ کے لیے کام کرتے تھے۔ انہی دستاویزات میں ان امریکی مصنفین کی شناخت بھی درج تھی جنہوں نے یہ رپورٹیں مرتب کی تھیں۔ اس طرح وہ دوسری خفیہ سروسز کے لیے ایک نرم اور غیر محفوظ نشانے کی حیثیت اختیار کر گئے۔

اتنی بڑی تعداد میں دستاویزات کی چوری سے یہ قوی شبہات پیدا ہوتے ہیں کہ پولارڈ کو اعلیٰ عہدوں پر کام کرنے والے دو یا زائد امریکی حکومتی اہلکاروں کے آشیرواد حاصل تھے۔ بہرحال کسی بھی دوسرے امریکی کو اس الزام میں نہیں پکڑا گیا۔

سکریٹری دفاع کاسپر وائین برگر نے بعد ازاں کہا: ''میرے لیے بہت مشکل ہے... کہ میں قومی سلامتی کے بارے میں اس سے زیادہ نقصان کا قیافہ کروں جو مدعا علیہ نے پہنچایا ہے۔ وہ یوں

کہ جو اطلاعات اس نے اسرائیل کو فروخت کی ہیں وہ بے حد حساس نوعیت کی۔ امریکہ کے لیے بے حد اہم اور نہایت ہمہ گیر تھیں!"... یہ چوریاں اس قدر وسیع پیمانے پر تھیں کہ ایک اندازے کے مطابق سیکورٹی سسٹم کی اصلاح اور طشت ازبام منصوبوں کی دوبارہ ترتیب و تدوین پر تین سے چار ارب ڈالر لاگت آئے گی۔

فریب "امریکی حکومت کو کئے گئے وعدے کے مطابق پولارڈ کو ہدایت دینے والی یونٹ توڑ دی گئی، اس کے اراکین کو سزا دی گئی، اور مسروقہ دستاویزات لوٹا دی گئیں۔"

(AIPAC ۱۹۹۲ء)

حقیقت:

کوئی بھی امریکی یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا کہ پولارڈ کو بھرتی کرنے والی اسرائیلی جاسوسی یونٹ LAKAM کا کیا بنا لیکن سابقہ اسرائیلی ایجنٹ وکٹر آسٹروفسکی کچھ جاننے کی پوزیشن میں تھا۔ اس کی رپورٹ تھی: 'انہوں نے صرف اتنا ہی کیا کہ ڈاک کا پتہ تبدیل کر دیا اور LAKAM کو دفتر خارجہ کے ساتھ منسلک کر دیا۔"

اسرائیل نے جاسوس کو سزا دینے کے وعدہ کے برخلاف دونوں بڑے متعلقہ جاسوسوں کو ترقی دے دی!

جفادری جاسوس رفائیل عیطان کو جو اسرائیل کی LAKAM تکنیکی جاسوسی ادارے کا ڈائریکٹر تھا بعد ازاں اسرائیل کیمیکلز کا انچارج بنا دیا گیا۔ یہ اسرائیل کی سرکاری کمپنیوں میں سب سے بڑی تھی۔ وہاں اسے اتنا فالتو وقت میسر تھا کہ وہ کولمبیا کے صدر ورجیلیو بارکو وارگاس کا مشیر بن سکے۔

پولارڈ کے رابطہ کار ایئرفورس کرنل Aviem Sella کو جسے امریکہ میں جاسوسی کرنے کا مرتکب پایا گیا تھا، ترقی دے کر بریگیڈیئر جنرل بنا دیا گیا۔ اسے اسرائیل کے سب سے زیادہ ترقی یافتہ ہوائی اڈے یعنی Tel-Nof کی کمان دی گئی۔ یہ عہد عموماً ہوائی افواج کے اعلیٰ ترین عہدہ تک پہنچنے کے لیے سیڑھی کا کام دیتا ہے۔

۱۹۸۸ء میں اسرائیلی حکام نے پولارڈ کی رہائی کی کوششیں شروع کر دیں۔ انہوں نے وائٹ ہاؤس اور اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کو کئی تجاویز پیش کیں۔ اسرائیل میں انہیں "گرفتارانِ صیہون" کا نام دے کر ان کی رہائی کی مہم چلائی گئی۔ اسرائیل پارلیمنٹ (کنشت) کے ۱۲۰ میں سے ۷۰ اراکین نے

صدر ریگن کو ایک یادداشت پیش کی جس میں پولارڈ کی رہائی کی درخواست تھی اسرائیل کے دونوں چیف ربیوں نے بھی صدر کو ان کی طرف سے خط لکھا۔ یہ اپیلیں ۱۹۸۹ء تک جاری رہیں جب اسرائیل کے وزیرِ صحت یاکوف ٹیسر نے اسرائیل میں امریکی سفیر ولیم براؤن سے مسز پولارڈ کی خرابی صحت کی بناء پر رہائی کے لیے کہا۔ اسے ایک انتہائی غیر معمولی معدہ کی بیماری کا سامنا تھا۔ اسرائیلی خواتین کے ایک گروپ نے بھی یہی مطالبہ کیا۔ ان میں لیبر پارٹی کے نمائندے، مذہبی پارٹیاں، وزیر اعظم کی مشیر برائے خواتین اور ہرزلیہ زنانہ مرکز کی منیجر رتھ راسنک شامل تھیں۔ راسنک نے صدر کی بیگم باربرا کو براہ راست تار بھیج کر مدد کی درخواست کی۔

مسز این پولارڈ کو ۱۹۹۰ء میں اپنی قید میں سے ڈھائی سال گزار چکنے کے بعد رہا کر دیا گیا۔ وہ اب اسرائیل میں رہائش پذیر ہے۔ یکم اگست ۱۹۹۰ء کو بن گوریان ہوائی اڈے پر اسرائیل میں پہلی بار آنے پر اس کا گرم جوشی سے استقبال ہوا۔ ان میں نمایاں شخصیات تہیہ پارٹی (دائیں بازو) کی گوئیلہ کوہن، ڈپٹی وزیر اعظم اور لیبر پارٹی کی رکن پارلیمنٹ ایڈنا سولار شامل تھیں۔ پولارڈ خاندان کی رہائی کے لیے اسرائیل میں ایک عوامی کمیٹی بنائی گئی تھی جس کا مقصد رقم اکٹھی کر کے پولارڈ کی رہائی کے لیے کام کرنا تھا۔ اس کے علاوہ ایک اسرائیلی انشورنس کمپنی ''انسانی ہمدردی'' کی بنیادوں پر مسز این پولارڈ کے طبی اخراجات برداشت کر رہی تھی!

جوناتھن پولارڈ کو ابھی رہا نہیں کیا گیا۔ (یہ ۱۹۹۵ء کا بیان ہے... (مترجم) فیڈرل اپیل کورٹ، واشنگٹن ڈی۔ سی۔ میں ۲۰ر مارچ ۱۹۹۲ء کو اس کی عمر قید کی سزا برقرار رکھی گئی تھی۔ اس اپیل میں اس کا وکیل صفائی ہارورڈ کا ایلن ڈرشووٹز تھا۔ بعدازاں امریکی سپریم کورٹ نے بھی اس پر نظر ثانی سے معذرت کر لی۔ اس سب کے باوجود صدارتی مہم کی گہما گہمی کے دوران ڈیموکریٹ بل کلنٹن نے یہودی گروپوں سے یہ وعدہ کر لیا کہ وہ صدر منتخب ہوتے ہی ذاتی طور پر اور بہ عجلت پولارڈ کیس پر نظر ثانی کرے گا۔ ساتھ ہی ساتھ بہت سے امریکی ربیوں نے نیویارک ٹائمز میں ۲۳ر اکتوبر ۱۹۹۲ء کو ایک پورے صفحہ کا اشتہار چھپوایا جس میں صدر بش پر فی الفور پولارڈ کو رہا کرنے کے لیے کہا گیا تھا۔

جہاں تک مسروقہ دستاویزات کا تعلق ہے تو اسرائیل نے صرف ۱۶۳ دستاویزات واپس کیں۔ بہر حال یہ ایک کھوکھلا وعدہ تھا کیونکہ ان تمام کی کاپیاں تیار کروانے کے لیے اسرائیل کے پاس کافی

وقت تھا۔ اسرائیل نے پولارڈ کیس کی تحقیقات کے دوران مکمل تعاون کا جو یقین دلایا تھا وہ بھی سراب ثابت ہوا۔ جون ۱۹۸۶ء میں ایف۔ بی۔ آئی کے ڈائریکٹر ولیم ایچ۔ ویبسٹر نے ایک انتہائی غیر معمولی قدم اٹھایا۔ یعنی اس بات کی کھلے عام شکایت کی کہ اسرائیل نے امریکی تحقیقات میں صرف ''چیدہ چیدہ معاونت'' کی۔ اس نے اسرائیل سے ''مکمل تعاون'' کا مطالبہ کیا لیکن جواب ندارد!



باب: ۱۷

اسرائیل کے جوہری ہتھیار

اسرائیل کا جوہری ہتھیار بنانے کا پروگرام تقریباً اتنا ہی پرانا ہے جتنی اسرائیل کی ریاست! اس کا پہلا سرپرست فرانس تھا جس نے ۱۹۵۰ء کے اواخر اور ۱۹۶۰ء کی اوائل کی دہائیوں میں صحرائے نجف میں ڈیمونا کے مقام پر خفیہ جوہری کارخانہ بنانے میں اسرائیل کی مدد کی۔ اسرائیلی اہلکاروں نے کبھی بھی سرکاری طور پر یہ تسلیم نہیں کیا کہ ان کے ملک کے پاس جوہری ہتھیار ہیں۔ انہوں نے اپنے آپ کو صرف اس اعلان تک محدود رکھا کہ اسرائیل مشرق وسطیٰ میں ان ہتھیاروں کو متعارف کروانے والا ''اولین ملک'' نہیں بنے گا۔ اس کے باوجود اس بات کے واضح شواہد موجود ہیں کہ ۱۹۶۰ء کی دہائی کے وسط سے اسرائیل کے پاس ایسے ہتھیار موجود ہیں۔

فریب ''اسرائیل کا جوہری ہتھیار بنانے کا کوئی ارادہ نہیں اور اس کا (جوہری) پروگرام کلیتاً پرامن مقاصد کے لیے جوہری طاقت استعمال کرنے کا ہے۔''

(اسرائیلی حکومت کا اعلان ۱۹۶۰ء)

حقیقت:

۱۹ دسمبر ۱۹۶۰ء کو واشنگٹن کو سرکاری طور پر یہ یقین دلانے کے بعد کہ اسرائیل کا جوہری ہتھیار تیار کرنے کا کوئی ارادہ نہیں اسرائیلی وزیراعظم ڈیوڈ بن گوریان نے دو دن بعد کنشت کے سامنے یہ تسلیم کیا کہ ڈیمونا میں نجف کے مقام پر ایک جوہری ری ایکٹر زیر تعمیر تھا۔ لیکن اس کا اصرار تھا کہ یہ صرف پرامن مقاصد کے لیے ہے۔ بن گوریان نے قسم کھاتے ہوئے کہا کہ ڈیمونہ کا منصوبہ سائنس، صحت، زراعت اور صنعتی ضروریات پوری کرے گا اور یہ بھی کہا کہ یہاں غیر ممالک کے شاگردوں کو تربیت دینے کی سہولت کھلے عام حاصل ہوگی۔ ان میں سے کوئی بھی بیان سچا ثابت نہ ہوا۔

بن گوریان کا ۱۹۶۰ء کا یہ بیان کہ ڈیمونا کا منصوبہ جوہری تھا ایک قابل ذکر موڑ تھا کیونکہ اس

سے پیشتر اسرائیلی سرکاری وضاحت اس زیر تعمیر منصوبے کے بارے میں... جو فرانس کی مدد سے بن رہا تھا... یہ تھی کہ یہ ایک ٹیکسٹائل فیکٹری یا ایک پمپنگ اسٹیشن ہے۔ اسرائیل کے پہلے انکاری بیانات نے جو ڈیمونا کے اصلی مقصد کی پردہ پوشی کے لیے تھے، امریکہ کے کئی ممبران کانگریس کو خاصہ برافروختہ کیا۔

اوائل ۱۹۶۱ء میں سینٹ کی خارجہ تعلقات کمیٹی کی ایک خفیہ میٹنگ میں سینٹر بورک۔ ہکن لوپر پھٹ پڑا ''میرا خیال ہے کہ اسرائیلیوں نے ہمارے ساتھ اسپ چوروں جیسا جھوٹ بولا ہے۔ انہوں نے ماضی میں مکمل فریب، غلط بیانی اور کذب حقیقت سے کام لیا ہے۔ ہمیں اسے بہت سنجیدگی سے لینا چاہیے۔ ہم جو ان کے اس قدر کام آتے رہے ہیں تو ہمارے ساتھ ہی اپنی اس خفیہ بنائی جانے والی جوہری ری ایکٹر بلڈنگ کے بارے میں اس قدر مستقل مزاجی اور ڈھٹائی سے جھوٹ بولنا اور کہنا کہ وہ نہیں بنا رہے!''

ان جذبات کے باوصف امریکہ نے اسرائیل کو جوہری ہتھیاروں کی تیاری سے باز رکھنے کے لیے بھی کوئی سنجیدہ قدم نہیں اٹھایا۔ صرف ۱۹۶۰ء کے اوائل میں صدر کینیڈی نے ایک نیم سنجیدہ کوشش کی تھی۔ اس نے ڈیمونا میں امریکی معائنہ کاروں کے داخلہ پر اسرائیل سے اصرار کیا۔ لیکن اسرائیلی تکنیکی اہلکاروں نے ڈیمونا کے منصوبہ میں ایک مکمل جعلی کنٹرول روم بنا کھڑا کیا تاکہ امریکی حقیقی تحقیقاتی سرگرمیوں کی نوعیت سے آگاہ نہ ہونے پائیں۔ یہ دھوکہ کامیاب رہا اور یہ معائنہ ۱۹۶۹ء میں ختم کردیا گیا... جب کہ اس سے ایک سال پیشتر CIA نے یہ خبر دی تھی کہ اسرائیل کے پاس جوہری ہتھیار موجود ہیں... ان معائنوں میں کوئی بھی مشتبہ چیز نہ ملی!

اس دوران اسرائیل نے اپنے بیانات میں اعتدال سے کام لینا شروع کردیا۔ شروع شروع میں تو یہ بیانات صرف وزیراعظم لیوی اشکول کے ۱۹۶۰ء کی دہائی کے وسط میں دیے گئے اعلانات تک محدود ہوتے تھے۔ ''میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں اور اب بھی دہراتا ہوں کہ اسرائیل کے پاس کوئی جوہری ہتھیار نہیں ہیں اور وہ انہیں اس خطے میں متعارف کرانے والا پہلا ملک نہیں بنے گا!'' بہرحال اب اس نے جوہری پروگرام کے ہونے یا جوہری ہتھیار رکھنے کے بارے میں انکار پر اصرار کرنا ترک کردیا ہے۔ صرف یہی کہنے پر اکتفا کرتے ہیں کہ اسرائیل مشرق وسطیٰ میں جوہری ہتھیار استعمال کرنے والا پہلا ملک ہرگز نہیں بنے گا!

دنیا بھر کے ماہرین اور CIA کی رائے کے مطابق اسرائیل نہ صرف جوہری ہتھیار رکھتا ہے بلکہ ان کو لمبے فاصلے تک مار کرنے کی صلاحیت کا بھی مالک ہے۔ CIA کی پانچ صفحات پر مبنی رپورٹ مؤرخہ ۴ر ستمبر ۱۹۷۴ء میں درج ہے کہ اس کا یہ نتیجہ کہ اسرائیل ایک جوہری قوت ہے۔ اس بنا پر ہے کہ اسرائیل نے یورینیم کی کافی بڑی مقدار حاصل کرلی ہے۔ جس میں سے کچھ چوری چھپے حاصل کی گئی۔ اسرائیل کی یورنیم افزودہ کرنے کی مشکوک کوششیں اور اسرائیل کے مہنگے میزائل سسٹم پر سرمایہ کاری جن میں جوہری بم نصب کرنے کی صلاحیت ہے... اسرائیل اپنے ''جیریکو'' نامی ۲۶۰ میل تک مار کرنے والی بیلسٹک میزائل پر جوہری بم لگا کر نشانہ تک پہنچا سکتا ہے۔ وہ اپنی ترقی یافتہ ''جیریکو'' میزائل سے بھی ایسا کرسکتا ہے جس کا دائرہ کار ۵۰۰ میل سے زائد ہے۔ یا پھر وہ توپوں اور جہازوں سے بھی یہ بم گرا سکتا ہے۔ ستمبر ۱۹۸۸ء میں اسرائیل نے ایک تجرباتی سیارچہ ''افق-۱'' بیضوی مدار میں چھوڑا تھا۔ یہ ۱۵۰ سے ۱۰۰۰ کلومیٹر کے مدار میں تھا۔ ایک امریکی تجزیہ نگار کا کہنا تھا کہ شواہد اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ جس راکٹ کے ذریعے یہ سیارچہ چھوڑا گیا وہ اتنا طاقتور تھا کہ ایک جوہری بم کو ماسکو یا لیبیا تک لے جاسکے۔

نامہ نگار سیمور ہرش جس نے اسرائیل کے پروگرام کا گہرا مطالعہ کیا، رقم طراز ہے کہ ''۱۹۸۰ء کی دہائی کے وسط تک ڈیمونہ کے ماہرین کم قوت کے سیکڑوں نیوٹرون بم تیار کر چکے تھے جو دشمن کے دستوں کو بڑی تعداد میں تباہ کرسکتے تھے اور ساز و سامان و عمارات کو جو نقصان پہنچتا وہ بالکل معمولی ہوتا۔ اسرائیل کے اسلحہ خانہ میں جتنے اور جس اعلیٰ معیار کے بم تھے انہیں کے برتے پر ایریئل شیرون جیسے اشخاص کو مشرق وسطیٰ کا نقشہ بالکل نئے سرے سے بنانے کے خواب دکھائی دیتے تھے۔ یہ وہ جوہری قوت کی دھمکی سے حاصل کرنا چاہیں گے۔''

امریکی سراغ رساں اداروں سے اسرائیل کا جوہری ہتھیار بنانے کا کوئی بھی قدم چھپا ہوا نہیں رہا تھا۔ پھر بھی امریکہ نے اسرائیلی جوہری جن کو بوتل ہی میں رکھنے کے لیے کچھ نہ کیا۔ ہرش نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ ''اسرائیل کے اسلحہ خانہ کے بارے میں امریکی پالیسی... ایک شفیق و مہربان عدم توجہی ہی نہ تھی بلکہ یہ حقیقت سے جان بوجھ کر آنکھیں چرانے کی پالیسی تھی!''

اسرائیلی دفاعی افواج کے ڈپٹی چیف آف اسٹاف جنرل امنون شہاک لپکن نے نومبر ۱۹۹۲ء میں یہ اعلان کیا کہ میرے خیال میں اب ریاست اسرائیل کو اپنی تمام تر قوت اور کوشش اس امر پر لگا

دینی چاہیے کہ کسی بھی دوسری عرب ریاست کو جوہری قوت کے حصول سے باز رکھا جائے... میری رائے میں اس مقصد کے حصول کے لیے جو بھی ذرائع میسر ہوں یا اختیار کئے جائیں وہ جائز ہوں گے!''

اسرائیل کی یہ دھمکیاں کہ کسی عرب ملک کو جوہری قوت نہیں بننے دیا جائے گا، منافقانہ ہیں۔ درحقیقت اس خطے میں جوہری ہتھیار بنانے والے سب سے پہلے اسرائیلی ہی تھے۔

مزید برآں جوہری ہتھیاروں کے پھیلاؤ کو روکنے کی ذمہ داری تو دی آنا (آسٹریا کا دارالحکومت) میں قائم ''بین الاقوامی جوہری توانائی ایجنسی'' کی ہے۔ یہ بین الاقوامی نگرانی اسے جوہری ہتھیاروں کے عدم پھیلاؤ کے معاہدے کے تحت تفویض کی گئی ہے۔ بیشتر عرب ممالک نے یہ معاہدہ تسلیم کر کے دستخط کر دیے ہوئے ہیں جب کہ اسرائیل نے ایسا نہیں کیا۔

اس کے باوجود اسرائیل نے اس خطے میں جوہری پولیس مین کا کردار سنبھال رکھا ہے جس کے نتائج تباہ کن رہے۔ ۱۹۸۱ء میں اس کے عراقی جوہری تحقیقاتی مرکز واقع "OSIRAK" نزد بغداد پر حملہ نے عراق کو انتہا پسند بننے میں مدد دی۔ یہ جگہ اسرائیل کی سرحدوں سے چھ سو میل دور ہے۔ اس حملہ میں نہ صرف امریکی ساختہ جنگی جہاز استعمال کئے گئے بلکہ براہِ راست امریکی امداد بھی شامل تھی۔ OSIRAK کا یہ مرکز سارے دنیائے عرب میں اعلیٰ ترین تحقیقاتی ادارہ تھا۔ عراق کے لیے یہ نقصان ایک بہت بڑا دھچکا تھا۔ یہ محرومی اس لیے بھی زیادہ تکلیف دہ تھی کہ عراق نے جوہری ہتھیاروں کے عدم پھیلاؤ کے معاہدے پر دستخط کئے ہوئے تھے جب کہ اسرائیل نے نہیں!

۱۹۹۱ء کی خلیج فارس جنگ کے دوران اسرائیل کے امریکی حمایتیوں نے یہودی ریاست کو اس حملہ کی مبارک باد دی تھی کیونکہ یہ صدام کی جارحیت کے لیے ایک پیشگی تھپیڑا تھا۔ اس میں شک کی ذرّہ بھر گنجائش نہیں کہ اسی حملے نے صدام کو امریکی اسرائیلی گٹھ جوڑ کا نکتہ چیں بنا دیا۔ وہ مغرب کے بارے میں قوی شبہ میں پڑ گیا اور اس کی قانون شکنی کو بڑھاوا ملا۔ ایک لیڈر کے طور پر صدام کتنا ہی نامعقول کیوں نہ ہو۔ اس کے یہ شکوک وشبہات کہ امریکہ اور اسرائیل مل کر عراق کو غیر مستحکم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں، حقیقت پر مبنی تھے۔ نیویارک ٹائمز (یہ اخبار ہمیشہ سے یہودی کنٹرول میں رہا ہے لیکن دکھاوے کی خاطر کبھی کبھار مگر مچھ کے ٹسوے بھی بہا دیتا ہے کہ عوام اسے غیر جانب دار سمجھیں... (مترجم) کے ایک اداریے میں یہ کہا گیا کہ اسرائیلی حملہ ایک ''ناقابل معافی اور کوتاہ اندیشی پر مبنی جارحیت'' والی حرکت تھی۔

اس حملے نے صدام کو کئی اہم اقدامات کرنے پر مجبور کردیا۔ جن میں سے ایک بھی امریکہ کے مفاد میں نہ تھا۔ مثلاً ''لبنان کی خانہ جنگی میں زیادہ مداخلت، خطہ میں ابوندال جیسے انتہا پسند دہشت گردوں کی امداد۔ ہوسکتا ہے کہ اس اسرائیلی حملہ سے صدام کو یہ تحریک ملی ہو کہ وہ مغربی ٹیکنالوجی حاصل کرنے کے لیے اپنی کوششیں تیز کردے اور جوہری ہتھیاروں کے بنانے کے لیے خفیہ منصوبے روبہ عمل لائے۔ یہ کوشش مجموعی طور پر عراقی فوجی مشین میں اعلیٰ ترین ٹیکنالوجی ایزاد کرنے میں کامیاب رہی!

درحقیقت یہ اسرائیلی حملہ ایک خفیہ مہم بعنوان ''آپریشن ابوالہول'' کا نکتہ عروج تھا جو عراقی جوہری پروگرام کے خلاف شروع کی گئی تھی۔ یہ آپریشن ۶/اپریل ۱۹۷۹ء کو ہی شروع ہو چکا تھا جب فرانس کی ایک جوہری کمپنی میں تین جوہری ری ایکٹروں کے مرکزی حصوں کو عراق روانگی سے ذرا قبل تین بم دھماکے کرکے اڑا دیا گیا۔ یہ مارسیلز کی بندرگاہ کے نزدیک ہوا۔ اس سبوتاژ سے عراقی پروگرام چھ ماہ کی تاخیر کا شکار ہوا۔ عراق کو سپلائی کرنے والی فرموں کے کلیدی فرانسیسی اور اطالین اہلکاروں کے گھروں اور دفاتر پر اسی سال کے دوران بم دھماکے کئے گئے۔ پھر ۱۳/جون ۱۹۸۰ء کو ڈاکٹر یحییٰ مشاد کو اس کے پیرس کے ہوٹل کمرے میں ہلاک کردیا گیا۔ وہ ایک مصری اور جوہری طبیعات کا ماہر تھا۔ وہ عراق کے جوہری توانائی کمیشن کے لیے کام کررہا تھا۔ مشاد فرانس آکر اس افزودہ یورینیم کی کھیپ کا معائنہ کررہا تھا جو عراق کے جوہری ری ایکٹر کے پہلے ایندھن کے طور پر بھیجی جانے والی تھی۔ اسرائیلی موساد کے منحرف وکٹر آسٹروفسکی کے بموجب مشاد اسرائیلی خفیہ ایجنٹوں کا شکار بنا تھا۔

امریکہ میں اسرائیل کے حمایتی حکومت کی ان کوششوں میں روڑہ اٹکانے پر ہمہ تن تیار رہے ہیں جو وہ دوسرے ممالک میں جوہری ہتھیاروں کے عدم پھیلاؤ کے لیے کررہی تھی۔ ایسا اس خوف کے تحت کیا جاتا تھا کہ اس سے اسرائیل متاثر ہوگا۔ ۱۹۸۱ء میں نیویارک کے دونمائندوں ڈیموکریٹ اسٹیفن۔ جے۔ سولارز اور جوناتھن۔ بی۔ بنگھم نے اپنی وہ ترمیم واپس لے لی جس کے تحت جوہری ہتھیار تیار کرنے والے ممالک کو امریکی امداد مہیا کرنے پر پابندی لگ جاتی۔ کیونکہ اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ نے آگاہ کیا تھا کہ اس پابندی کا اطلاق اسرائیل پر بھی ہوسکتا ہے۔ انڈر سکریٹری آف اسٹیٹ جیمز۔ ایل۔ بکلے سے ذاتی بریفنگ لینے کے بعد سولارز نے کہا: ''ہم یہ نہیں جانتے تھے کہ ہم

نادانستہ اور انتہائے سادگی سے ایسی صورت حال پیدا کر رہے تھے جو اسرائیل کو امداد کی فراہمی رکنے پر منتج ہوتی! انہوں نے ہمیں یہ تاثر دیا کہ ایسی کسی تحقیقات کے نتیجہ میں انتظامیہ کہیں یہ ثابت نہ کر دے کہ اسرائیل کے پاس جوہری بم موجود ہے۔"

فریب ''اسرائیل کی عدم پھیلاؤ معاہدے کی توثیق سے انکار کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اس معاہدے سے خطے میں جوہری عدم پھیلاؤ میں کچھ خاص مدد نہیں ملی!'' (AIPAC ۱۹۹۲ء)

حقیقت:

۱۹۶۸ء میں جب یہ ''جوہری عدم پھیلاؤ'' معاہدہ مشتہر کیا گیا تو اسرائیل اپنے جوہری ہتھیار بنانے کے سفر میں کافی آگے نکل چکا تھا۔ اس وقت کوئی بھی عرب ملک کسی بھی قسم کی جوہری اختراع کے آس پاس بھی نہ بھٹکا تھا۔ اس کے باوجود اسرائیل نے تمام عالمی اور امریکی کوششوں کی مخالفت کر کے اپنے جوہری اداروں کے کھلے عام معائنے اور جوہری عدم پھیلاؤ کے معاہدے کی توثیق سے انکار کیا۔ وجہ صاف ظاہر ہے۔ CIA کے بموجب اسرائیل ۱۹۶۸ء سے جوہری ہتھیار رکھتا ہے۔

تب سے لے کر اب تک کئی خفیہ رپورٹوں کے جزوی انکشاف اور اخباری خبروں سے اسرائیل کے جرأت مندانہ جوہری پروگرام کی ترقی کی جھلکیاں میسر آئی ہیں لیکن اس پروگرام کی مصدقہ تفصیلات ۵/اکتوبر ۱۹۸۶ء کو اس وقت منظر عام پر آئیں جب ڈیمونا کے ایک ناراض کارکن مورڈیکائی وانونو نے لندن کے سنڈے ٹائمز کو بیان دیا۔ بقول وانونو کے اسرائیل کے پاس کم از کم سو یا زیادہ سے زیادہ دو سو جوہری ہتھیار تھے۔ اس نے یہ انکشاف کیا کہ اسرائیل یہ ہتھیار پچھلے بیس برسوں سے تیار کر رہا تھا اور اب وہ ایک اہم جوہری طاقت ہے۔ کسی بھی امریکی اہلکار یا جوہری طبیعات دان نے اس بیان سے اختلاف نہیں کیا!

❀ ❀

باب: ۱۸

اسرائیل اور جنوبی افریقہ

اسرائیل اور جنوبی افریقہ کے درمیان گہرے اور مضبوط تعلقات ہیں۔ یہ کئی برسوں سے ہیں۔ دونوں حکومتوں کی اپنے اپنے اصلی باشندوں پر جبر و تشدد کی پالیسی نے انہیں عالمی برادری میں تنہا کیا اور مشترکہ حفاظتی مسائل کھڑے کئے۔ اس سے بالواسطہ ایک فوجی تعاون کا رشتہ بنا۔ اسرائیل جنوبی افریقہ کو خام مال خصوصاً ناتراشیدہ ہیروں کے عوض اسے بے پناہ قسم کی فوجی تکنیکی امداد مہیا کرتا ہے۔ عام خیال یہی ہے کہ اس تعاون میں جوہری ہتھیار بنانے کی مشترکہ کوششیں بھی شامل ہیں۔

فریب ''اسرائیل میں نسلی تفریق کی مخالفت اس قدر شدید ہے کہ (جنوبی افریقہ کے ساتھ) موجودہ معمولی سے تعلقات پر بھی نظرِ ثانی کی جارہی ہے!''

(ہائمن بک بائینڈر، سابقہ نمائندہ امریکن جیوش کمیٹی ۱۹۸۷ء)

حقیقت:

اسرائیل اور جنوبی افریقہ کے تعلقات اکثر پوشیدہ رہے ہیں۔ اس کی کچھ وجہ فوجی سنسر کے باعث ان ممالک کے درمیان فوجی تعاون کی کوئی بھی خبر اسرائیل کے اندر شائع کرنا سخت منع ہے۔ لیکن نامہ نگار سیمور ہرش نے یہ انکشاف کیا ہے کہ ان دونوں ممالک کے درمیان جوہری تعاون ''صحیح معنوں میں'' ۱۹۶۷ء میں شروع ہوا۔ ایک اسرائیلی اسکالر بن یامین، بیت حلاحمی کے مطابق اسرائیل نے ۱۹۵۵ء میں جنوبی افریقہ کے ہاتھ ہلکے ہتھیار فروخت کئے۔

اتنے تعاون کے باوجود ذرائع ابلاغ میں اس کا ذکر اس قدر عنقا تھا کہ نیویارک ٹائمز کے کالم نگار برائے خارجہ امور سی۔ ایل۔ سلز برگر کو کہیں ۱۹۷۱ء میں جاکر یہ توفیق ہوئی کہ وہ ان دوستانہ تعلقات کے بارے میں ایک خصوصی رپورٹ شائع کرے۔ اس میں اسرائیل اور جنوبی افریقہ کے مابین فوجی تعاون کا بھی ذکر تھا۔ اس توجہ کے نتیجہ میں ۱۹۷۵ء میں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے

اسرائیل کے خلاف قرار داد مذمت منظور کی کیونکہ وہ جنوبی افریقہ کی نسل پرست حکومت کے ساتھ تعلقات استوار کیے ہوئے تھا... سیاسی، فوجی، اقتصادی اور دیگر میدانوں میں!

۱۹۸۲ء تک حالات یہاں تک پہنچ گئے کہ اسرائیل کے اہم ترین اخبار 'لاارض' کے ممتاز سیاسی نامہ نگار یوئیل مارکس نے جنوبی افریقہ کو امریکہ کے بعد دوسرا اہم ترین اتحادی قرار دیا۔ ڈیموکریٹ نمائندے اسٹیفن سولارز نے ۱۹۸۹ء میں CIA سے ایک بریفنگ ملنے کے بعد کہا کہ اسرائیل کے جنوبی افریقہ کے ساتھ فوجی تعلقات... اس سے کہیں زیادہ ہیں جتنا کہ بتایا جاتا تھا یا افواہیں تھیں! یاد رہے کہ اسٹیفن سولارز اسرائیل کا پرجوش حامی ہے۔ تب سے آج تک کوئی ایسی بات نہیں ہوئی کہ ہم اس رائے سے اختلاف کر سکیں۔ (سولارز یہودی ہے... (مترجم)

دونوں ملکوں کے تعلقات بڑھنے کی راہ میں ایک ڈرامائی موڑ اپریل ۱۹۷۶ء میں آیا جب جنوبی افریقہ کے وزیر اعظم جان فورسٹر نے اعلانیہ اسرائیل کا دورہ کیا۔ گو اسرائیل نے اس دورہ کو ایک مذہبی یاترا قرار دیا لیکن فورسٹر کو جنگ عظیم دوئم میں ایک نازی حمایتی کا کردار رکھنے کے باوجود اس کا استقبال ایک خارجی مہمان لیڈر کے تزک و احتشام سے کیا گیا۔

فورسٹر کے لیے ایک عشائیہ کے دوران وزیر اعظم یٹزاق رابن نے دونوں ممالک کے درمیان قریبی تعلقات کی وجوہ بتلاتے ہوئے کہا: ''میرے خیال میں دونوں ممالک کا مسئلہ یہ ہے کہ وہ خارجہ شہہ پر کی جانے والی عدم استحکامی اور گڑبڑ کے باوجود اپنے خطے کے ممالک سے گفتگو کیسے قائم کریں... یہی وجہ ہے ہم یہاں آپ کی ان تاریخی کوششوں کی بڑی قدر کرتے ہیں جو آپ اپنے براعظم میں بقائے باہمی کے سلسلے میں کر رہے ہیں۔ آپ ایک بہتر اور محفوظ مستقبل کے لیے پل تعمیر کر رہے ہیں۔ آپ مل جل کر زندہ رہنے کا ڈھنگ تعمیر کر رہے ہیں جس سے تمام افریقی باشندوں کو ایک خوش حال امداد باہمی والے ماحول کی ضمانت حاصل ہو جائے گی اور یہ سب خارجی دھمکیوں اور دخل اندازی کے بغیر ہوگا!''

فورسٹر کی آمد کے چند ماہ بعد اسرائیل اور جنوبی افریقہ کے تعلقات اور بھی نزدیکی ہو گئے جس کی بڑی وجہ ایک نسلی علیحدگی والے ملک کے لیے اسرائیل کی طرف سے ہتھیار مہیا کرنے پر رضامندی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ اسرائیل نے جنوبی افریقہ کو دو سے لے کر چھ تک میزائل بردار لمبے رینج والی گن بوٹس اور ۲۴ ''کفیر'' جنگی ہوائی جہاز فروخت کیے تھے۔ جنوبی افریقہ کے پچاس بحری اہلکاروں کو

اسرائیل میں تربیت دی جارہی تھی اور اسرائیل نے کوئلے کی سپلائی کے بدلے جنوبی افریقہ کو ترقی یافتہ فوجی الیکٹرانک ساز و سامان مہیا کیا تھا۔ اس میں تقریباً وہ دس لاکھ ٹن کوئلہ بھی شامل تھا جو اسرائیل کی فولادی صنعت میں بھی کام آیا۔

۱۹۸۰ء کی دہائی میں اسرائیل نے جنوبی افریقہ کو وہ ٹیکنالوجی اور نقشے فراہم کئے جس سے وہ اپنے ترقی یافتہ جنگی ہوائی جہاز تیار کر پایا۔ جنوبی افریقہ کے اسلحہ خانہ میں یہ اضافہ اس وقت ہوا جب اسرائیل نے اپنا 'LAVI' جنگی جہاز منصوبہ جو فیل ہو چکا تھا منسوخ کر دیا۔ حالانکہ امریکہ نے اسرائیل کو اس منصوبے کے لیے ڈیڑھ ارب ڈالر کی امداد مہیا کی تھی تاکہ وہ یہ جہاز تیار کر سکے۔ لیکن اسرائیلی اس منصوبے کو اس بجٹ کے اندر محدود نہ رکھ سکے اور انہیں یہ منصوبہ ۱۹۸۷ء میں امریکی دباؤ کے تحت منسوخ کرنا پڑا۔ تب اسرائیل نے جنوبی افریقہ کے ساتھ امداد کا معاہدہ کر لیا تاکہ وہ اسی سے ملا جلا جنگی جہاز بنام SIMBA وہاں تیار کر سکیں۔ LAVI منصوبے کے تمام زائد از ضرورت ہنر مندوں نے جنوبی افریقہ کا رخ کیا تاکہ وہ SIMBA پر کام کر سکیں۔ اقوام متحدہ کے ۱۹۷۷ء میں جنوبی افریقہ کی نسل پرست حکومت کے خلاف ہتھیاروں کی سپلائی پر عالمی پابندی نافذ کرنے کے باوجود اسرائیل کا تعاون جنوبی افریقہ سے جاری رہا۔ اس بات پر کانگریس کے حبشی گروپ کے اعلیٰ نمائندے انتہائی سیخ پا ہوئے۔ جب اسرائیلی وزیر اعظم یٹزاق شامیر نے ۱۹۸۸ء میں واشنگٹن کا دورہ کیا تو ان حبشی اعلیٰ نمائندوں نے اسے ایک خط پیش کیا جس میں کہا گیا تھا کہ ریاستہائے متحدہ نے اسرائیل کو "LAVI" لڑاکا جنگی جہاز بنانے کے لیے بطور امداد تقریباً ڈیڑھ ارب ڈالر دیے۔ اب ہمیں پتہ چلا ہے کہ... LAVI پر کام کرنے والے انجینئروں نے امریکہ سے حاصل شدہ یہ امداد جنوبی افریقہ منتقل کر دی ہے۔ ہمارے خیال میں یہ ہماری امداد کا انتہائی غیر اخلاقی اور غیر ذمہ دارانہ استعمال ہے! شامیر نے اس نوٹ کو نظر انداز کر دیا اور اس بارے میں کوئی قدم نہ اٹھایا۔

نومبر ۱۹۹۱ء میں جنوبی افریقہ کے صدر ایف۔ ڈبلیو۔ ڈی۔ کلرک نے اسرائیل کا چار روزہ سرکاری دورہ کیا اور یہودی ریاست کو یہ یقین دہانی کروائی کہ ''جنوبی افریقہ اب بھی اتنا ہی قابل اعتماد دوست ہوگا جتنا کہ ہمیشہ سے تھا۔'' دونوں ممالک نے ایک مفاہمی یادداشت کی دستاویز پر دستخط کئے جس کے تحت ان کے درمیان اقتصادی سائنسی اور ثقافتی امور میں باہمی تعاون کو فروغ دیا جائے گا اور یروشلم پوسٹ کے بقول ''کچھ اور امور میں بھی'' ان دنوں یہ کہا جاتا تھا کہ دونوں ممالک کے درمیان

۱۹۹۰ء میں تین سو سترہ ملین ڈالر کی غیر فوجی تجارت ہوتی تھی۔ اس میں اسرائیل میں تیار شدہ مال کے عوض جنوبی افریقہ سے خام مال حاصل کیا جاتا تھا۔ فوجی تجارت کا تخمینہ تو ۱۹۸۷ء میں ہی ۸۰ کروڑ ڈالر سے زائد کا تھا جب اسرائیل نے سرکاری طور پر یہ وعدہ کیا تھا کہ وہ جنوبی افریقہ میں مزید نئے فوجی ٹھیکے حاصل نہیں کرے گا۔ بہرحال سنا یہی گیا کہ فوجی تجارت میں کچھ اضافہ ہی ہوا۔

فریب ''اسرائیل اور جنوبی افریقہ کے مابین جوہری تعاون کی سنسنی خیز کہانیوں کے باوصف ان کے ثبوت میں کچھ بھی پیش نہ کیا گیا۔'' (AIPAC ۱۹۹۲ء)

حقیقت:

اسرائیل اور جنوبی افریقہ دونوں ہی نے ''عدم پھیلاؤ معاہدے'' پر دستخط کرنے سے انکار کیا ہے۔ نتیجتاً ان دونوں کی جوہری تنصیبات کا معائنہ عالمی عہدیداروں نے کئی دہائیوں سے نہیں کیا۔ CIA نے تو ۱۹۶۸ء میں ہی یہ معلوم کرلیا تھا کہ اسرائیل کے پاس جوہری ہتھیار ہیں اور ۱۹۷۰ء کی دہائی کے وسط میں یہ خیال عام تھا کہ جنوبی افریقہ کو بھی اپنا جوہری بم بنانے پر دسترس حاصل ہو چکی ہے۔

اس سے بہت پیشتر جنوبی افریقہ اسرائیل کو ڈیمونا جوہری ری ایکٹر چلانے کے لیے یورینیم فروخت کر رہا تھا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ جنوبی افریقہ کو اسرائیل کا قدرتی اتحادی بنانے میں اس کے خام یورینیم کے وسیع ذخائر کا بہت ہاتھ تھا۔ بقول نامہ نگار سیمور ہرش کے ''اسرائیل اپنی جوہری صلاحیت کو جنوبی افریقہ سے خام یورینیم اور دوسرے فوجی لحاظ سے اہم معدنیات کے حصول کے عوض فروخت کر رہا تھا جن کے وسیع ذخائر جنوبی افریقہ میں پائے جاتے ہیں۔''

جنوبی افریقہ اور اسرائیل کے مابین جوہری تعاون کی واضح شہادت امریکہ کے "VELA" نامی سیارچے کے ۲۲ ستمبر ۱۹۷۹ء کے اس جوہری دھماکے کی خصوصی چمک کو ریکارڈ کرنے سے ملی جو جنوبی افریقہ اور بحر منجمد جنوبی کے عین نصف درمیان وقوع پذیر ہوا۔ وائٹ ہاؤس کی مقرر کردہ ایک کمیٹی نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ "VELA" نے جو مشاہدہ ریکارڈ کیا ہے وہ اغلباً کسی جوہری دھماکے کا نتیجہ نہیں تھا۔ لیکن تب سے ہی ناقدین نے اس رپورٹ کے بارے میں سنجیدہ خدشات کا اظہار کیا ہے اور اسے سیاسی محرکات کی بناء پر کی جانے والی ایک لیپا پوتی کی کوشش قرار دیا ہے۔

ناقدین کا اعتراض یہ ہے کہ اس کمیٹی کو صرف محدود معلومات مہیا کر کے اس کا دائرہ کار بے حد

محدود کر دیا گیا تھا۔ اس کے برخلاف CIA نے ساری معلومات دیکھ رکھی تھیں۔ ان کا ۱۹۷۹ء کا نتیجہ غیر مبہم تھا کہ تکنیکی معلومات اور تجزیہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ زمین کی سطح کے قریب فضا میں ایک جوہری دھماکہ برپا کیا گیا تھا۔ ڈائریکٹر سنٹرل انٹیلی جنس اسٹینس فیلڈ ٹرنر نے بعد ازاں واضح کیا کہ اس وائٹ ہاؤس پینل میں سے کسی نے CIA سے معلومات طلب ہی نہ کی تھیں اور بغیر ان معلومات کے پینل کا یہ نتیجہ بالکل بے سروپا تھا۔

اسرائیل/جنوبی افریقہ تعاون جوہری ہتھیاروں کے علاوہ ان کو نشانہ تک پہنچانے والے میزائل سسٹم کے لیے بھی تھا۔ ۲۵/اکتوبر ۱۹۸۹ء کو NBC-TV NEWS نے اسرائیل/جنوبی افریقہ جوہری گٹھ جوڑ پر مفصل رپورٹ دی۔ بقول ان کے رپورٹر کے ''انٹیلی جنس ذرائع نے NBC-TV NEWS کو بتلایا ہے کہ یروشلم/پریٹوریا تعاون بھرپور جوبن پر ہے تاکہ جنوبی افریقہ جوہری بم لے جانے والا میزائل تیار کر سکے۔'' اس رپورٹ میں کہا گیا تھا کہ ۵/جولائی کو جنوبی افریقہ نے جو ۹۰۰ میل رینج والی میزائل خفیہ طور پر چھوڑی تھی وہ اس نے اپنے ایک ادارے بنام "ARMSCORP" میں تیار کی تھی جو حکومت کی ملکیت ہے۔ یہ کام اسرائیلی فنی مہارت کی بنیاد پر کیا گیا تھا۔ اسرائیل کے NBC رپورٹ کے انکار کے باوجود واشنگٹن پوسٹ نے نامعلوم امریکی حکومتی اہلکاروں کا حوالہ دیتے ہوئے اس کے بیشتر مندرجات کی تصدیق کی۔ خصوصاً اس اسرائیلی امداد کی جو اس نے میزائل پروگرام میں جنوبی افریقہ کو مہیا کی۔ ایک امریکی حکومتی اہلکار کا کہنا تھا تل ابیب میں ایک امریکی سفیر اور دوسرے حکومتی اہلکار جو اس معاملہ کے درپے تھے انہیں اسرائیل نے جھڑکنے کے انداز میں کہا کہ امریکہ کا اس معاملے سے کیا تعلق؟

دو سال بعد اکتوبر ۱۹۹۱ء میں امریکی سراغ رساں اداروں نے یہ ثابت کیا کہ سال گذشتہ کے دوران اسرائیل نے جو بین البراعظمی میزائل کے پرزہ جات کی کھیپ جنوبی افریقہ روانہ کی ہے۔ اس میں بیشتر حصہ امریکی فنی مہارت پر مشتمل تھا۔ بہرحال صدر بش نے امریکی قانون کے ماتحت جو پابندیاں عائد ہوتی تھیں ان سے درگزر کرنے کا فیصلہ کیا۔ ان میں اسرائیل کے ساتھ مکمل تجارتی مقاطعہ بھی شامل ہوسکتا تھا۔

❋ ❋

باب: ۱۹

اسرائیل اور تیسری دنیا

اسرائیل کے متعدد تیسری دنیا کے ممالک کے ساتھ گرم جوشی کے تعلقات ہیں۔ اس کی بڑی وجہ امریکہ کے ساتھ تعلقات ہونا ہے اور اپنے فوجی ساز وسامان کی بھرپور فروخت ہے جسے چھوٹے ممالک اپنے استفادہ کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ بعض دفعہ اسرائیل ان امریکی کارروائیوں میں قائم مقامی کا کردار ادا کرتا ہے جہاں واشنگٹن اپنے ملوث ہونے کو خفیہ رکھنا چاہتا ہے۔ اس کی ایک ڈرامائی مثال ''ایران کونٹرا'' معاملہ ہے جس میں اسرائیل نے ہتھیار ایران کو بجھوائے اور منافع سے نکاراگوا کے کونٹراز کی امداد کی جب کہ یہ کانگریس کی لگائی گئی پابندیوں کی خلاف ورزی تھی۔

فریب ''ہم نے ایران کو اسلحہ نہیں بیچا... یہ اطلاعات قطعاً بے بنیاد ہیں۔''

(شمعون پیریز، اسرائیلی وزیراعظم ۱۹۸۶ء)

حقیقت:

۱۹۷۹ء میں آیت اللہ روح اللہ خمینی کے برسر اقتدار آجانے کے بعد بھی اسرائیل کے تعلقات ایران سے جاری رہے۔ گو خمینی کی صیہون مخالف پالیسی کے باعث ان تعلقات میں کچھ سرد مہری آ گئی لیکن اسرائیل پھر بھی ایران کو اسلحہ دیتا رہا۔ اس میں شک کی گنجائش نہیں کہ اسرائیل واشنگٹن کی آشیر باد سے ایسا کرتا رہا۔

ایران کے ۱۹۷۹ء کے اواخر میں ۵۲ امریکیوں کو یرغمال بنالینے (اور اس کی صدارت کے اخیر یعنی جنوری ۱۹۸۱ء تک انہیں قید رکھنے) کی ذلت نے صدر کارٹر کو اس پر مجبور کر دیا کہ وہ ایران کو ہتھیاروں کی سپلائی پر پابندی عائد کر دے۔ نئی آنے والی ریگن انتظامیہ نے بھی یہ پابندی جاری رکھی۔ لیکن اس کے باوجود اسرائیل نے ریگن کے اقتدار کے دوران ایران کو وسیع پیمانے پر ہتھیاروں کی فراہمی جاری رکھی۔ ۱۹۸۶ء میں، زیراعظم شمعون پیریز کے کھلے عام سرکاری انکار کے باوجود دیگر

اسرائیلی حکومتی اہلکار بار بار اعلانیہ یہ کہہ چکے ہیں کہ یہ فراہمی واشنگٹن کی منظوری سے ہوتی تھی۔ ریگن انتظامیہ نے اس وقت تو ایسی کسی منظوری کے اجراء سے انکار کیا تھا۔ بہرحال جب ۱۹۹۱ء میں نیویارک ٹائمز نے یہ خبر شائع کی کہ ریگن انتظامیہ نے خفیہ طور پر اربوں ڈالر کے ہتھیار ایران بھجوانے کے سلسلے میں اسرائیل کو اجازت دی تھی (یہ سلسلہ ۱۹۸۱ء کے موسم بہار سے شروع ہوا) تو سکریٹری آف اسٹیٹ جیمز بیکر نے یہ کہتے ہوئے کہ اغلباً ریاستہائے متحدہ نے ایسے سودوں کی منظوری دی ہوگی۔ اس معاملے کی تصدیق کردی تھی لیکن اس نے کوئی خصوصی دستاویزات نہ دکھلائیں۔ ٹائمز کے نامہ نگار سیمور ہرش کا بیان تھا کہ اس پالیسی کی وضاحت حاصل کرنے کے لیے ریگن انتظامیہ کا ایک بھی اہلکار میسر نہ تھا۔

اس معاملے میں کئی امکانات ہوسکتے ہیں!

سازشی مالی خولیا رکھنے والوں نے فوراً ہی ان انتظامات کو ''اکتوبر سرپرائز سازش'' کے ثبوت کے طور پر پیش کیا۔ اس سازش میں مبینہ طور پر کچھ ناقدین کا یہ دعویٰ تھا کہ ریگن کی انتخابی مہم کے اہلکاروں نے خفیہ طور پر ایران کو ہتھیاروں کی فراہمی کا وعدہ کیا تھا اگر وہ اس کے بدلہ میں ۱۹۸۰ء کے صدارتی انتخاب کے ختم ہونے تک یرغمالیوں کو رہا نہ کرے۔ اس سازش کا محرک یہ خوف خیال کیا جاتا تھا کہ اکتوبر میں امریکی یرغمالیوں کی رہائی کارٹر کے انتخابِ مکرر کے امکانات کو بڑھا دیتی۔ ایسی کسی سازش کا ثبوت تو میسر نہ ہوا لیکن کچھ دلچسپ شواہد ایسے ضرور ملے جن کی وجہ سے باقاعدہ تحقیقات کرانے کی آوازیں اُٹھیں۔

بہرحال کئی اور بھی وضاحتیں ممکن ہیں جن میں سے بیشتر کا تعلق اسرائیل کے ایران کے ساتھ گہرے روابط سے ہے۔

ان میں سب سے پہلے تو یہ بات ہے کہ ایران ایک عرصہ سے اسرائیل کی ''محیطی حکمت عملی'' میں کلیدی کردار کا حامل ہے۔ یہ اسرائیل کی وہ حکمت عملی تھی جو اس نے ۱۹۴۰ء کی دہائی کے اخیر اور ۱۹۵۰ء کی دہائی کے آغاز میں وضع کی تھی اور جس کا مقصد عرب قوموں کا مقابلہ کرنے کے لیے عرب مشرق وسطیٰ کے کنارے واقع غیر عرب اقوام کے ساتھ دوستانہ روابط بڑھانا اور علاقے میں اقلیتی گروپوں سے تعلقات قائم کرنا تھا۔ یا یوں کہیے کہ اس حکمت عملی کا مقصد کردوں، دروزیوں اور مارونیوں کے ساتھ مشرق وسطیٰ کے اندر اور اس کے محیط پر واقع ممالک یعنی ایتھوپیا (حبشہ) ترکی

اور سب سے بڑھ کر ایران کے ساتھ اسرائیل کی دوستی اور امداد قائم کرنا تھا۔

یہ اسی حکمت عملی کا ثمر تھا کہ اسرائیل کو واقعاتی حقیقت کے طور پر تسلیم کرنے والا اولین مسلم ملک ایران تھا۔ یہ ۱۹۵۰ء میں ہوا۔ گزرتے ماہ و سال میں یہ تعلقات بے حد گہرے ہو گئے۔ ایران اسرائیل کو تیل مہیا کرنے والا ایک بڑا ملک بن گیا اور اسرائیل نے امریکی اشتراک سے ۱۹۷۰ء کی دہائی کے اوائل میں شاہ ایران کی مدد عراقی کردوں کو اکسانے سے کی۔

اسرائیل کے ایران کے ساتھ دوستانہ روابط کا خصوصی مقصد عراق کو کمزور رکھنا اور اس کی توجہ عرب/اسرائیل مناقشے سے ہٹائے رکھنا تھا۔ بقول ''الارض'' نامہ نگار ایس شوائیزر کے ''ایران عرب کیمپ کو غیر متوازن حالت میں رکھتا ہے اور ہمارے سب سے زیادہ زہریلے، مضبوط ترین اور ممکنہ دشمنان میں سے ایک یعنی عراق کو بے اثر رکھنے میں مدد دیتا ہے... عالمی سیاست کے قوانین سچے ہیں جو بھی تہران میں حکمرانی کرے گا اسے چار و ناچار یروشلم میں حکمرانی کرنے والے کا اتحادی بننا ہی پڑے گا۔''

اسرائیل کو یہ پریشانی لاحق تھی کہ عراق اپنی توجہ خلیج فارس سے ہٹا کر اپنا بھاری بھرکم فوجی مشین کا رخ اسرائیل کی جانب نہ کر دے۔ جیسا کہ ۱۹۸۸ء میں وزیر دفاع یٹزاق رابن نے کہا تھا کہ اگر عراق اپنے نصف ٹینک بھی اردن اور شام میں بھیج دے تو ہماری یہودی ریاست کو اپنی مشرقی سرحد پر اس سے بھی زیادہ ٹینکوں کا سامنا ہو گا جتنے کہ نیٹو نے یورپ میں پھیلا رکھے ہیں۔ اس طرح آیت اللہ خمینی کے زیر قیادت نئے شیعہ ایران میں اعلانیہ صیہونیت مخالف رویہ کے باوجود برسوں تک اسرائیل کے نزدیک ایک مضبوط ایران ان کے اپنے مفاد میں تھا۔

۱۹۸۰ء کی دہائی میں اسرائیلی لیڈروں نے امریکی پالیسی کو عراق سے دور اور ایران کے قریب لانے کے لیے کئی بار اثر انداز ہونے کی کوششیں کیں۔ یہی چیز واضح کرتی ہے کہ اسرائیل کیوں اس اسکینڈل میں جسے ''ایران کونٹرا'' کا نام دیا گیا بہت دلچسپی لیتا تھا۔ یہ ۱۹۸۰ء کی دہائی کے وسط میں ہوا اور جس میں ریگن انتظامیہ نے ایران کو اسرائیل کے واسطہ سے ہتھیار فروخت کئے۔ اس مرکزی ثالثی کردار نے اسرائیل کے تہران میں اثر و نفوذ میں اضافہ کیا۔ ایران/عراق جنگ کو طول دیا جو اسرائیل کو اپنے قومی مفاد سے ہم آہنگ نظر آتی تھی اور ساتھ ہی ساتھ ایک انتہائی منافع بخش کاروبار بھی جاری رکھا۔

''ایران کونٹرا'' اسکینڈل کے طشت از بام ہو جانے کے بعد بھی ۱۹۸۷ء میں وزیر دفاع رابن نے امریکہ پر اس بارے میں کڑی اعلانیہ تنقید کی کہ وہ عراق کی جانب ضرورت سے زیادہ جھکاؤ رکھتا تھا۔ رابن نے الزام دھرا کہ عراق اور عربوں کو امریکی امداد کے باعث صرف سوویت یونین ہی واحد سپر پاور رہ گیا ہے جو ان دونوں متحارب فریقین سے بات چیت کر سکتا ہے جب کہ امریکہ ایسا نہیں کر سکتا۔'' بقول رابن کے ''وقتی طور پر ایران اسرائیل کا دشمن بنا ہوا تھا لیکن مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ پچھلے ۳۷ سال میں سے ایران ۲۸ برس تک اسرائیل کا دوست رہا ہے۔ اگر یہ ۲۸ سال تک ہو سکتا ہے تو پھر آئندہ کیوں نہیں؟... ذرا ایک مرتبہ اس مجنونانہ شیعہ بنیاد پرستی کو رخصت تو ہونے دیں!''

امریکی پابندیوں کے ہوتے ہوئے اسرائیل کے ایران کو ہتھیار مہیا کرنے کی ایک بنیادی وجہ اس کی وہ تشویش تھی جو اسے وہاں بسنے والی یہودی اقلیت کے بارے میں لاحق تھی۔ ایران میں تقریباً ۷۰ ہزار یہودی آباد ہیں۔ ان میں سے بیشتر نے خمینی کے اقتدار میں آنے کے بعد چند مہینوں میں ہی راہ فرار اختیار کی۔ پھر بھی کم از کم ۳۰ ہزار بقیہ وہیں رہ گئے۔ اسرائیل نے تہران کے ساتھ دوستی کا اظہار کر کے ان کی حفاظت چاہی۔

فریب ''سیاہ فام افریقی اقوام نے نسل پرستی کی وجہ سے اسرائیل کے ساتھ روابط منقطع نہیں کئے۔ زیادہ تر نے ۱۹۷۳ء میں تیل پیدا کرنے والے عرب ممالک کے دباؤ کے زیر اثر ایسا کیا۔'' (AIPAC ۱۹۹۲ء)

حقیقت:

اسرائیلی دوستی کی پینگیں زیریں صحرا افریقی ممالک کے ساتھ بس ذرا سی دیر ہی رہیں اور ان کے خاتمہ بالخیر کا تعلق عرب ممالک کے تیل سرمایہ سے اتنا ہی تھا جتنا کہ اسرائیل کی جارحانہ پالیسیوں سے۔

دوستی کا یہ عرصہ ۱۹۵۶ء میں ایتھوپیا (حبشہ) کے ساتھ سفارتی تعلقات قائم ہونے سے شروع ہوا۔ جلد ہی اس میں بیشتر نو آبادیاتی نظام سے رہائی پانے والے ممالک کا اضافہ ہو گیا اور رسمی تعلقات قائم ہو گئے۔ لیکن ۱۹۶۰ء کی دہائی کے وسط تک اسرائیل کی عالم عرب کے ساتھ جارحانہ پالیسیوں اور افریقہ میں CIA کے ساتھ اس کے نیم خفیہ تعاون نے ان کی غلط فہمی دور کرنا شروع کر دی۔ کہا جاتا ہے کہ CIA نے ۱۹۶۰ء کی دہائی میں اسرائیل کو آٹھ کروڑ ڈالر تک رقم ادا کی۔ اس کا مقصد سیاہ فام

افریقہ کی نوآزاد ریاستوں میں سیاسی راہ و رسم پیدا کرنا بتلایا گیا۔ ۱۹۶۶ء ہی میں ہوانا (کیوبا کا دارالحکومت) میں ہونے والی سہ براعظمی ایکا کانفرنس میں ایک زوردار اسرائیل مخالف قرارداد منظور کی گئی۔ اس میں اسرائیل کی طرف سے (CIA کے تعاون سے) دی جانے والی فنی امداد سے نوآبادیات کو محکوم رکھنے والی حکمت عملی قرار دیا گیا۔ ۱۹۷۶ء تک ماسوائے تین کے، سبھی افریقی اقوام نے اسرائیل کے ساتھ ترکِ تعلق کرلیا تھا۔ یہ تین ممالک ملاوی، سوازی لینڈ اور لیسوتھو تھے۔ مؤخرالذکر دونوں ہی جنوبی افریقہ کے زیرِ حفاظت تھے۔

اسرائیل کے ساتھ ترکِ تعلق کا عمل ۱۹۷۳ء کے عرب تیل بائیکاٹ سے پہلے ہی شروع ہو گیا تھا۔ یعنی ۱۹۷۲ء سے ہی! اس وقت اسرائیلی سفارت کاروں نے ان وجوہ کا صحیح ادراک کیا اور کہا: ''سارے براعظم افریقہ میں انتہا پسندی کا رجحان اور بیشتر افریقی راہ نماؤں کا مغرب کے بارے میں غلط فہمیوں کا دور'' ہونا اس کا باعث تھا۔

ان سے بھی زیادہ وزنی اور خصوصی وجوہ موجود تھیں۔ تیسری دنیا کے ابھرتے ہوئے نوآزاد ممالک نے فلسطینیوں کے ساتھ اسرائیل کے جبر و تشدد والے برتاؤ کو پہچاننا شروع کر دیا تھا۔ ۱۹۶۷ء کی جنگ کے بعد اسرائیل کا رویہ بطور ایک غاصب قوت کے بالکل ویسا ہی تھا جیسا افریقی ممالک نے مغربی استعماریت کے ماتحت ملاحظہ کیا تھا اور جس سے انہیں حال ہی میں چھٹکارا نصیب ہوا تھا۔ اس کے علاوہ رہوڈیشیا اور جنوبی افریقہ کی سفید فام نسلی حکومتوں کے ساتھ اس کے دوستانہ تعلقات بھی ناراضگی کا باعث تھے۔ گنی بساؤ، انگولا اور موزمبیق میں پرتگال کی اپنی نوآبادیوں کو برقرار رکھنے کی کوششوں میں اسرائیلی حمایت بھی اس کا سبب تھی۔ اقوام متحدہ میں اسرائیل کا عام طور پر مغربی ممالک کی حمایت میں ووٹ ڈالنا بھی افریقیوں کو ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔ علاوہ ازیں اسرائیل کی چند انتہائی نفرت انگیز ممالک کی حکومتوں یعنی یوگنڈا میں عدی امین، زائرے میں موبوتو اور وسط افریقہ ری پبلک میں بوکاسا کی حمایت بھی افریقیوں کی آنکھیں کھولنے کا باعث بنی تھی۔

> **فریب** ''اب جب کہ تیل پیدا کرنے والے عربوں کی تشدد آمیز طاقت کا بھرم ٹوٹ چکا ہے۔ افریقی ممالک اسرائیل کے ساتھ تجدیدِ تعلقات کر رہے ہیں۔ ہمارے ساتھ تعاون کے لیے منصوبے تلاش کر رہے ہیں۔'' (AIPAC ۱۹۹۲ء)

حقیقت:

ان دنوں افریقی ممالک کے لیے اسرائیل سے تجدید تعلقات کا سب سے بڑا محرک ان کی یہ توقع ہے کہ اس طرح امریکی کانگریس میں اسرائیل کے اثر ونفوذ سے ان کو فائدہ ہوگا۔ دنیا کے بہت سے لیڈروں... صرف افریقی ہی نہیں!... کا یہ خیال ہے کہ اسرائیل کے ساتھ اچھے تعلقات کا مطلب امریکہ کے ساتھ خود بخود اچھے تعلقات ہونا ہے۔

مثال کے طور پر زائرے نے ۱۹۸۲ء میں دوبارہ تعلقات قائم کئے۔ زائرے کے ڈکٹیٹر موبوتو سیسے سیکو کا عام طور پر افریقہ کے بددیانت ترین لیڈروں میں شمار کیا جاتا تھا لیکن یہ تجدید تعلقات فوراً ہی رنگ لے آئی۔ امریکہ نے زائرے کو امداد دینے پر مکمل پابندی عائد کر رکھی تھی لیکن اسرائیل کے ساتھ تعلقات بحال ہوتے ہی کانگریس نے یہ امدادی پروگرام زائرے کے لیے دوبارہ شروع کر دیا۔ درحقیقت ایک اسرائیلی اخبار کی خبر کے مطابق موبوتو نے تعلقات کی بحالی کے لیے یہ خصوصی درخواست کی تھی کہ اسرائیل امریکہ میں اس کے تصور کو بحال کرے۔ کہا جاتا ہے کہ اسرائیلی وزیراعظم یتزاق شامیر نے وعدہ کیا تھا کہ امریکہ میں یہودی تنظیموں پر اپنے اثر ورسوخ کے ذریعے اسرائیل زائرے کی مدد کرے گا۔ اس سے زائرے کا تصور بہتر ہوگا۔

افریقہ سے ماوراء ایک مثال رومانیہ کی ہے۔ نکولائی چاؤسیسکو کی بدنامِ زمانہ حکومت کے باوجود امریکہ میں اس ظالم حکمران کے بارے میں کافی اچھی رائے پائی جاتی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس نے ۱۹۶۷ء کی جنگ میں سوویت یونین اور کئی دوسری مشرقی یورپی اقوام کی مانند اسرائیل سے اپنے تعلقات منقطع نہیں کئے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ امریکی ذرائع ابلاغ اور کانگریس چاؤسیسکو کے لیے نرم گوشہ رکھتے تھے۔ اسرائیل اور اس کے حمایتیوں نے کانگریس کے اندر رومانیہ کے لیے پسندیدہ ترین قوم کا مرتبہ قائم رکھنے میں مدد دی۔ چاؤسیسکو کے دور میں یونہی رہا اور اس سے رومانیہ کو ٹیکس میں چھوٹ سے لاکھوں ڈالر کی بچت ہوتی تھی۔

رومانیہ کے ساتھ اسرائیل کے تعلقات کی ایک خفیہ وجہ یہ بھی تھی کہ اسرائیل رومانیہ کو اس بات کے لیے ادائیگی کرتا تھا کہ وہ اپنے یہودی باشندوں کو اسرائیل نقل وطن کر جانے کی اجازت دے۔ یہ آپریشن ۱۹۵۰ء کی دہائی میں شروع ہوا اور تقریباً تیس سال چلا۔ کہا جاتا ہے کہ تین لاکھ رومانوی یہودیوں کی آزادی خریدنے کے لیے اسرائیل نے ایک ارب ڈالر سے زائد رقم رومانیہ کو ادا کی! اس

سودے میں اسرائیل کا یہ وعدہ بھی شامل تھا کہ وہ رومانیہ کی طرف سے کانگریس میں لابی کرے گا۔ اس عمل سے امریکہ میں اس ڈکٹیٹر کی تصویر صحیح رنگوں میں نہ ابھری!

(ذرا یہاں یہ فریب ملاحظہ کریں کہ آزادی خریدی جارہی ہے۔ جب کہ رومانیہ میں کبھی بھی یہودیوں کے خلاف نفرت اور تشدد کے واقعات سننے کو نہیں ملے۔ گویا یہ ان ہنستے بستے یہودیوں کو فریب سے نقلی جنت کے پروپیگنڈہ سے ورغلا کر ترک وطن پر آمادہ کرنے کی مثال ہے۔ اغلباً پال فنڈلے کی نگاہ بھی اس فریب کا پردہ چاک کرنے سے معذور رہی!... (مترجم)

فلپائن کی آئی میلڈا مارکوس نے ۱۹۸۱ء میں ایک اسرائیلی اخبار کو بیان دیتے ہوئے انتہائی صاف گوئی سے بتلایا تھا کہ اس کا شوہر یعنی صدر مارکوس امریکی یہودیوں اور اسرائیل کے ساتھ اپنے تعلقات بہتر بنانے کا خواہاں تھا تا کہ وہ امریکی ذرائع ابلاغ میں (فلپائن کے) گھناؤنے تصور کو بہتر کر سکے اور امریکی کانگریس میں اپنی بدنامی کو گھٹا سکے!

فریب ''تیسری دنیا میں اسرائیلی سرگرمیوں کی وسعت نہ صرف اسرائیلیوں کے دوست بلکہ دشمن کے لیے بھی اچنبھے کا باعث ہیں!'' (بن یامین، بیت، حلاحمی، اسرائیلی اسکالر)

حقیقت:

تیسری دنیا میں اسرائیل کی وسیع سرگرمیاں کسی کے لیے بھی اچنبھے کا باعث نہیں ہونا چاہئیں۔ انٹیلی جنس ادارے تو یہ جانتے ہی ہوں گے! انہیں یہ معلوم ہے امریکہ کے لیے اسرائیل کی اہمیت کچھ یوں بھی ہے کہ وہ امریکہ کا بچہ جمورا بننے کے لیے ہمہ تن تیار رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسرائیل اپنے سے کئی گنا بڑی ریاستوں میں دخل دینے کی بے پناہ صلاحیت رکھتا ہے۔

اس بات کی بہت روشن مثالیں وسطی اور لاطینی امریکہ کے علاوہ افریقہ میں بھی ملتی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ جب ریگن انتظامیہ نے نکاراگوا کے باغیوں... جنہیں "CONTRA" پکارا جاتا تھا... کی مدد کے لیے کانگریس کی مخالفت کا توڑ کرنا چاہا تو اس نے اسرائیل سے مدد طلب کی۔ جیسا کہ اسرائیلی سابقہ جرنل مطیع یا ہو پلید نے ۱۹۸۰ء کی دہائی کے وسط میں کہا تھا: ''وسطی امریکہ میں گندے کام کروانے کے لیے امریکی انتظامیہ اسرائیل کو استعمال کرتی ہے۔ اسرائیل ریاست ہائے متحدہ کے ایک بازو اور شریکِ جرم کا کردار ادا کر رہا ہے''... دوسری اقوام کے لیڈروں کی مانند لاطینی امریکہ کے حکام بھی کانگریس میں اسرائیل کے اثر ونفوذ کی قدر کرتے ہیں۔ واشنگٹن پوسٹ کے نامہ

نگار ایڈورڈ کوڈی نے ۱۹۸۳ء میں لکھا تھا کہ ''سالواڈورین حکومت یہ آس لگائے بیٹھی تھی کہ امریکہ میں طاقتور اسرائیل نواز لابی کانگریس میں ہونے والے ان مباحث پر محتاط انداز میں ان کی امداد کرے گی جو انتظامیہ کی وسطی امریکہ پالیسی کے بارے میں ہوں گے۔''

ریگن انتظامیہ کی بولینڈ ترمیمی بل (جس میں کونٹرا کو امداد دینا خلاف قانون کہا گیا تھا) کو جان بوجھ کر نظر انداز کرنے کی پالیسی نے ہی اسرائیل کو اکسایا کہ وہ ایران کو ہتھیار بیچنے سے حاصل شدہ منافع کو CONTRA کے لیے ہتھیار فراہم کرنے کی جانب موڑ دینے کا خیال پیش کرے۔ یہ اس اسکینڈل کا مرکزی نکتہ تھا جس میں کرنل اولیور نارتھ اور ایڈمرل جان پوئینڈ یکسٹر ملوث تھے۔

اسرائیلی وزیر اعظم شمعون پیریز نے اس وقت یہ کہا تھا کہ اسرائیل کے ہاتھ ایک پھوٹی کوڑی بھی نہیں لگی اس میں۔ یہ اسرائیلی منصوبہ تھا ہی نہیں! یہ امریکہ کا معاملہ تھا۔ ہمارا مقصد تو جانیں بچانے میں ایک دوست ملک کی امداد کرنا تھا۔ اسرائیل کو امداد کے لیے پکارا گیا اور اس نے لبیک کہا!

بہرحال اس اسکینڈل کی حتمی رپورٹ جو ''ٹاور کمیشن'' نے تحقیقات کے بعد پیش کی، اس میں اخذ کیا گیا تھا کہ ''یہ صاف ظاہر ہے... کہ اسرائیل کے اپنے بھی مفادات تھے۔ جن میں سے کچھ ریاستہائے متحدہ کے مفادات سے براہِ راست متصادم تھے۔ لہٰذا اسرائیل نے امریکہ سے اس معاملہ پر اصرار کر کے پیش رفت کروائی۔ ان کی اصرار کی یہی وجہ تھی۔ اس نے اس مقصد کے حصول کے لیے نیشنل سیکورٹی کونسل کے اسٹاف نیشنل سیکورٹی مشیر اور صدر کے کاموں میں مداخلت کی۔''

ایک اسرائیلی اسکالر ہارون۔ ایس۔ کلیمان نے کہا کہ وسطی امریکہ اسرائیلی ہتھیاروں اور سیکورٹی سروسز کے لیے ایک بڑی مارکیٹ بن چکا ہے۔ بقول اس کے ''اسرائیل نے لبنان میں چھینے گئے اسلحہ کا ذخیرہ باہم بانٹنے کی پیش کش کی۔ کوسٹاریکا میں سراغ رسانی میں مدد کی۔ گوئٹے مالا میں بھی کی اور کہا جاتا ہے کہ ان دونوں ممالک کے علاوہ ہنڈوراس اور ال سلواڈور میں بھی حکومتی افواج کو باغیوں سے نبٹنے میں تربیت دی... کہا جاتا ہے کہ وسطی امریکہ میں اسرائیل سب سے زیادہ سپلائی کرنے والے دوسرے درجے کے ممالک کی صف میں شامل ہے۔''

اسرائیل نے جنوبی امریکہ کی بعض بدنامِ زمانہ شخصیتوں کی مشاورت سے بھی منافع کمایا ہے۔ پاناما میں جب دسمبر ۱۹۸۹ء میں آمر مینوئیل نوری ایگا کو پکڑنے کے لیے امریکی افواج داخل ہوئیں تو اسرائیلی موساد کا ایجنٹ مائیک ہراری انہیں غچہ دینے میں کامیاب رہا۔ ۱۹۸۰ء میں ملازمت سے

ریٹائر ہونے کے بعد اس نے پانامہ میں ہتھیاروں کے علاوہ کئی دوسرے کاروبار بھی شروع کر دیے تھے۔ وہ نوری ایگا کا انتہائی قریبی مشیر بن گیا تھا۔ بعدازاں ہراری اسرائیل میں جا نمودار ہوا جب کہ نوری ایگا کو گرفتار کر کے امریکی جیل میں بند کیا گیا۔

کولمبیا میں ایک سابقہ لیفٹیننٹ کرنل یائر کلین پر یہ الزام لگایا گیا کہ وہ ''اسکاریوز'' نامی ڈرگ ڈیلروں... (ان کی زبان میں ''اسکاریو'' کا مطلب دغاباز قاتل ہے) کو اعلیٰ ترین فوجی داؤ پیچ اور دھماکہ خیز مواد کا استعمال سکھلاتا تھا۔ وہ تل ابیب میں قائم شدہ ایک سیکورٹی کمپنی ''اسپئیر ہیڈ لمیٹڈ'' کا مالک تھا۔ کلین بھاگ کر اسرائیل پہنچ گیا اور وہاں اس نے یہ بیان دیا کہ وہ تو یہ سمجھ رہا تھا کہ وہ کولمبیا کے کسانوں کو باغیوں سے اپنا دفاع کرنے کی تربیت دے رہا ہے! بعدازاں اسرائیل نے کلین پر غیر قانونی ہتھیار برآمد کرنے کا الزام دھرا۔ کلین نے تین معاملات یعنی ہتھیار اور اپنی فوجی مہارت کو بیچنے کے بارے میں صحتِ جرم کو تسلیم کر لیا۔ ۳ رجنوری ۱۹۹۱ء کو اسے ۷۵۰۰۰ ڈالر جرمانہ اور ایک سال معطل شدہ سزائے قید سنائی گئی۔ کولمبیا کے وزیرِ خارجہ نے اس قدر نرم سزا دیے جانے پر احتجاج کیا۔

ان ڈرگ ڈیلروں اور نوری ایگا جیسے معمولی بدمعاشوں کے علاوہ اسرائیل نے کچھ وحشی/ بے رحم آمروں کی دوستی بھی کوشش کر کے حاصل کی۔ مثلاً چلی کے جنرل آگسٹو پنوشے۔ ال سلواڈور کے رابرٹو ڈی ابوئی سن۔ گوئٹے مالا کے جنرل رومیو لیوکاس گارشیا۔ ہیٹی کا جین کلاڈ ڈوالیئر، نکاراگوا کا انسٹاشیو سوموزا ڈی بیل اور پیراگوئے کا جنرل الفریڈو اسٹروسز۔ افسوس کی بات تو یہ ہے کہ ہمیں یہ اعتراف ندامت کرنا پڑتا ہے کہ ریاستہائے متحدہ بھی انہی قابل نفرین شخصیات کے ساتھ تعلقات میں ملوث رہا ہے۔

❋ ❋

حصہ سوئم

اندیشہ ہائے امن

باب: ۲۰

یٹزاق رابن کی حکومت

یٹزاق رابن کے گذشتہ برتاؤ سے ہمیں کوئی بھی امید افزا اشارے نہیں ملتے کہ اسرائیل کی موجودہ حکومت امن کے قیام میں مخلص ہوگی۔ رابن اسرائیل کا سب سے زیادہ تجربہ کار اہلکار ہے۔ جب ۱۹۷۴ء میں وہ بطور وزیر اعظم اقتدار میں آیا تو اسرائیل کا پہلا مقامی نژاد لیڈر تھا۔ اس کا اقتدار ۱۹۷۷ء تک رہا جب مناخم بیگن کی لیکوڈ پارٹی جیت گئی اور اگلے پندرہ برس تک اسرائیل کے سیاسی افق پر چھائی رہی۔ جب ۲۳رجون ۱۹۹۲ء کو لیکوڈ انتخابات میں ہار گئی تو رابن دوبارہ وزیر اعظم بن گیا۔

(یاد رہے کہ یہ الفاظ ۱۹۹۳ء میں لکھے گئے۔ بعد ازاں رابن کو ایک انتہا پسند یہودی نوجوان کے ہاتھوں گولی مار کر ہلاک کئے جانے کا واقعہ پیش آیا۔ اس نوجوان کو صرف سزائے قید دی گئی۔ چند سال بعد وہ پھر آزاد ہوگا اور تیس سال سے کم عمر ہوگا!... (مترجم)

رابین یکم مارچ ۱۹۲۰ء کو یروشلم میں پیدا ہوا اور ۱۹۴۱ء کو وہ ان رضا کاروں کے پہلے دستہ میں بھرتی ہوا جسے ''پال میک'' (حملہ آور) کے نام سے پکارا جاتا تھا اور یہ اسرائیل کے اوّلین خفیہ فوجی یونٹ تھے۔ بطور ایک ''پال میک کمانڈر'' کے وہ ہزاروں فلسطینیوں کو ان کے گھروں سے زبردستی بے دخل کرنے کا ذمہ دار تھا۔ ۱۹۶۴ء میں جب وہ فوج کا چیف آف اسٹاف مقرر ہوا تو یہ اس کے فوجی کیریئر کی معراج تھی۔ ۱۹۶۷ء کی جنگ اسرائیل نے اس کی راہبری میں شروع کی تھی جس میں مغربی کنارہ، غزہ جولان کی پہاڑیاں اور جزیرہ نمائے سینائی فتح کر لیے گئے اور لاکھوں مزید فلسطینی بے گھر ہوئے۔ ۱۹۶۸ء میں اس نے فوجی سروس چھوڑ کر پانچ سال کے لیے امریکہ میں اسرائیلی سفیر کی ذمہ داری سنبھالی۔ ۱۹۸۴ء میں اس نے وزیر دفاع کا عہدہ سنبھالا۔ اس دوران فلسطینیوں کے انتفادہ کو بے رحمی سے کچلنے کا بندوبست اسی نے کیا۔ جون ۱۹۹۰ء میں رابین کو وزیر دفاع کے عہدہ سے

ہٹا دیا گیا۔

فریب ''میں آج یا کل سفر کرنے پر تیار ہوں۔ عمان، دمشق یا بیروت کسی بھی جگہ، امن کی خاطر، کیونکہ امن کی جیت سے بڑھ کر کوئی جیت نہیں!''

(یزاق رابن، اسرائیلی وزیر اعظم ۱۹۹۲ء)

حقیقت:

وزیر اعظم رابن کے گذشتہ برتاؤ کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کے تلاشِ امن کے متلاشی دعوے کو قدرے محتاط انداز سے دیکھنا چاہیے۔

ان گئے برسوں میں وزیر اعظم رابن متعدد بار یہ واضح کر چکے ہیں کہ وہ مقبوضہ علاقوں میں سے بیشتر حصہ بلکہ سبھی علاقے واپس کرنے کے حق میں نہیں ہیں۔ اُسے فلسطینی ریاست منظور نہیں۔ اپنے افتتاحی خطاب میں انہوں نے یروشلم کی حیثیت پر کسی بھی سمجھوتے یا مفاہمت کے امکان پر بات چیت کو کلی طور پر رد کر دیا تھا۔ انہوں نے یہ کہہ کر کہ حفاظتی بستیوں کی تعمیر جاری رہے گی۔ گویا بالواسطہ ان مقبوضہ علاقوں کے بڑے حصہ یعنی مغربی کنارہ، جولان کی پہاڑیوں اور غزہ کی پٹی پر اپنا حق جتلایا۔ اقوام متحدہ کی قرارداد نمبر ۲۴۲ کا ذکر تک نہیں کیا جس میں علاقہ برائے امن کا فارمولا درج ہے۔ اس نے PLO کی طرف اشارہ تک نہیں کیا جو فلسطینیوں کی واحد جائز نمائندہ تنظیم ہے۔ وہ اسرائیل کے اندر آباد فلسطینیوں کو اسرائیلی شہریت دیے جانے کا بھی مخالف ہے۔

اس سے یہ واضح ہے کہ اس کی پالیسی درشت ہے۔

رابن کے ریکارڈ سے عیاں ہے کہ اسے فلسطینیوں کا اعتماد حاصل نہیں۔ بطور وزیرِ دفاع اس نے ۱۹۸۷ء کے اواخر میں انتفاضہ کے آغاز پر ان تمام ظالمانہ کارروائیوں کی منظوری دی جو اسرائیل مقبوضہ علاقوں میں فلسطینیوں کو زیر کرنے کے لیے بروئے کار لایا۔ اس میں لاکھوں فلسطینیوں کے لیے دن رات کا لگاتار کرفیو، پناہ گزیں کیمپوں میں بجلی اور فون منقطع کرنا اور انتہائی ضروری سامان خورد ونوش کی ناکہ بندی شامل تھے۔ جب وزیرِ دفاع رابن سے پوچھا گیا کہ آیا اسرائیل ان پناہ گزینوں کو خوراک سے محروم رکھے گا؟ تو اس کا جواب تھا ''دریں چہ شک! ہم کسی بھی بیرونی امداد کو چاہے وہ تنظیموں کی طرف سے ہو یا ممالک کی جانب سے۔ اندر نہیں پہنچنے دیں گے!''

رابن ہی وہ اہلکار تھا جس نے بدنامِ زمانہ ''ہڈی توڑ'' پالیسی کا اعلان یہ کہتے ہوئے کیا تھا کہ

اسرائیل انتفاضہ کو کچلنے کے لیے قوت، طاقت اور گھونسوں کا استعمال کرے گا۔ اس کے ذرا دیر بعد ہی اسرائیلی پریس میں ۱۹۷ فلسطینیوں کی شکستہ ہڈیوں کی علاج کی خبر چھپی۔ یہ غزہ کی پٹی میں گذشتہ تین دنوں میں ہوا تھا اور یہ براہ راست تشدد کا نتیجہ تھا۔ نیویارک ٹائمز کا کہنا تھا کہ سارے مقبوضہ علاقہ جات میں ایسے واقعات ''سیکڑوں یا شاید اس سے بھی زیادہ تعداد'' میں پیش آئے۔

رابن نے فلسطینیوں کی ملک بدری میں بھی اضافہ کردیا اور انتظامی حراست کے عدالتی طریقہ کار کو بھی معطل کردیا تاکہ مشکوک لوگوں کو جیل میں رکھنا آسان ہوجائے۔ اب ملزمان کا بغیر کسی الزام اور مقدمے کے لامتناہی عرصے کے لیے قید رکھنا ممکن تھا۔ ان مشکوک لوگوں میں ڈاکٹر، وکیل صفائی اور یونین لیڈران، یونیورسٹی اہلکار اور طالب علم شامل تھے۔ رابین کے دور حکومت میں سبھی فلسطینی اسکول بند کردیے گئے۔ اس طرح نوجوان فلسطینیوں کو تعلیم میسر نہ تھی۔ نیویارک ٹائمز نے شہ سرخی لگائی کہ ''غربی کنارے کے عربوں کے لیے تعلیم کو ایک مجرمانہ فعل قرار دیا گیا ہے۔''

رابن نے مقبوضہ علاقے کے باشندوں کو اسرائیل کے اندر مغربی کنارے کے بڑے شہروں کے مابین سفر کرنے سے منع کردیا۔ نامہ نگاروں کا مقبوضہ علاقوں میں داخلہ ممنوع تھا۔ صرف وہاں پر آباد یہودی آبادکاروں کو آزادانہ نقل و حمل کی اجازت تھی۔ رابین نے ایسے پتھر پھینکنے والوں کے لیے پانچ سال قید کی سزا کا اعلان کیا جو اہم نقصان پہنچانے کا باعث بنیں اور جن چودہ سال سے کم عمر بچوں کو پتھر پھینکتے پکڑا جائے ان کے والدین کو ایک ہزار ڈالر جرمانہ کیا جاتا۔

جب فلسطینی احتجاج جاری رہا تو رابن نے کہا کہ اسرائیلی شہری کسی بھی فلسطینی کو جو ''مولوٹوف کاک ٹیل'' (یہ آتش گیر مادہ رکھنے والی بوتل کو کہتے ہیں جو پھٹ کر شعلے پھیلا دیتی ہے۔ قارئین نے TV کی خبروں میں اکثر آئرلینڈ کے پرتشدد احتجاجوں میں نوجوانوں کو یہ ''کاک ٹیل'' پولیس پر پھینکتے دیکھا ہوگا... (مترجم) اٹھائے نظر آئے دیکھتے ہی گولی مار سکتے ہیں۔ امریکہ اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ نے اس پالیسی پر احتجاج کیا۔ اس نے مشکوک افراد کے گھروں کو مسمار کردینا یا سیل بند کردینے میں اضافہ کردیا۔ چاہے اس سے دیگر افراد خانہ کو بھی محروم کیوں نہ ہونا پڑے۔

جب پلاسٹک کی گولیوں کے استعمال سے اسرائیلی فوج نے فلسطینیوں میں نقصانات کو ڈرامائی طور پر بڑھا دیا تو رابین کا کہنا تھا کہ ہم بالکل یہی چاہتے ہیں... ہمارا مقصد پرتشدد واقعات میں حصہ لینے والوں کو زیادہ تعداد میں زخمی کرنا ہے ناکہ ہلاک کرنا!'' ایک اقوام متحدہ اہلکار نے ان ہتھکنڈوں کو

فلسطینیوں کے اوپر ''کھلا موسم'' قرار دیا۔[1]

رابن میں یہ شقاوت قلبی کوئی نئی بات نہیں۔ ۱۹۴۸ء میں وہ فلسطینی مفتوحہ شہروں رملہ اور لیڈا کا بطور بریگیڈ کمانڈر انچارج تھا۔ یہ دونوں شہر سو فیصد عرب آبادی والے تھے۔ اقوام متحدہ کی تقسیم فلسطین پلان میں یہ عرب ریاست کا حصہ تھے۔ ڈیوڈ بن گوریان کے احکام کے تحت رابن نے یہاں سے پچاس ہزار یا اغلباً ساٹھ ہزار فلسطینیوں کو بے دخل کر کے پناہ گزیں بننے پر مجبور کر دیا تھا۔

۱۹۶۷ء کی جنگ میں رابن چیف آف اسٹاف تھا۔ اس کی نگرانی میں بہت سارے فلسطینی گاؤں تباہ کیے گئے اور تین لاکھ تیئس ہزار فلسطینیوں کو پناہ گزیں بنا دیا گیا۔ ان میں سے ایک لاکھ تیرہ ہزار دوسری دفعہ پناہ گزیں بن رہے تھے۔ یہ ان سات لاکھ چھبیس ہزار پناہ گزینوں میں شامل تھے جو ۱۹۴۸ء میں بے گھر ہوئے تھے۔ گویا یہ ان بدقسمت بکھرے ہوئے لوگوں کے اندر ایک مزید انسانی سیلاب کی آمد تھی۔

۱۹۷۴ء میں جب رابن پہلی مرتبہ وزیر اعظم بنا تو اس نے جنوبی لبنان کے اندر فلسطینی چھاپہ ماروں کے اڈوں پر ایک نئی اسرائیلی انتقامی پالیسی شروع کی۔ اس پالیسی میں جنگی فضائی طاقت کا بے محابا استعمال شامل تھا۔ رابن کی اس نئی پالیسی کے تحت پہلے ہی فضائی حملے میں کم از کم ۱۰۰ عرب ہلاک ہوئے اور ۲۰۰ زخمی۔

رابن کے ماتحت اسرائیل نے ۱۹۷۵ء میں مصر کے ساتھ جزیرہ نمائے سینائی کے بارے میں گفت وشنید کرتے وقت اس قدر غیر لچکدار رویے کا مظاہرہ کیا کہ صدر جیرالڈ فورڈ کو زچ ہو کر یہ اعلان کرنا پڑا کہ امریکہ اپنی مشرق وسطیٰ پالیسی کے بارے میں ایک بڑی نظر ثانی کرنے والا ہے۔ یہ ہنری کسنجر سیکریٹری آف اسٹیٹ کی حکمت عملی کی رو سے اسرائیل پر ایک قدرے مبہم داؤ تھا تا کہ وہ ان دونوں اقوام کے مابین دوسرا سمجھوتہ طے کروا سکے۔ لیکن رابن نے پیچھے ہٹنے سے انکار کر دیا۔ جب اسرائیل لابی نے ایک احتجاجی خط پر ۷۶ سینیٹروں کے دستخط کروا لیے تو فورڈ نے یہ نظر ثانی ملتوی کر دی۔

---

[1] نوٹ: یہاں اشارہ شکار کے قوانین کی طرف ہے۔ جب پرندوں کے انڈے دینے اور سینے کا موسم ہوتا ہے تو افزائش نسل کے لیے شکار بند کر دیا جاتا ہے اور جب اس شکار کی اجازت ہو تو اسے ''کھلا موسم'' کہتے ہیں... (مترجم)

جب کسنجر نے رابن کو بے پناہ اقتصادی، فنی اور سفارتی امداد کی یقین دہانی کروا دی تب ہی اسرائیل ''سینائی۔II'' جزوی انخلاء کے معاہدہ پر راضی ہوا!

اگر مندرجہ بالا حقائق کو نگاہ میں رکھا جائے تو رابن کی حالیہ امن تجویز کا امریکہ کو جتنا تاوان دینا پڑے گا اس کا خیال ہی سوہانِ روح ہے! ''سینائی۔II'' ان مہنگے ترین معاہدات میں سے ایک ہے جو واشنگٹن نے آج تک کئے! کسنجر نے اسرائیل کو اگلے پانچ سال تک تقریباً دو ارب ڈالر کی امداد کا وعدہ کیا۔ اسے بعدازاں بڑھا کر تین ارب کر دیا گیا۔ لیکن یہ تو امریکی مال و دولت کی اس بارش کے صرف چند قطرے تھے جو اسرائیل پر برسنے والی تھی!

دیگر فوائد میں خفیہ مفاہمتوں کا ایک سلسلہ تھا جو ۱۹۷۵ء میں طے پایا اور جس کے تحت بہت سی مختلف النوع یقین دہانیاں کرائی گئی تھیں۔ ان میں سے ایک بڑی خفیہ مفاہمت میں کسنجر نے اسرائیل کو یہ امریکی یقین دہانی کروائی کہ ہم ''پوری کوشش کریں گے کہ... اسرائیل کی وقتاً فوقتاً......... فوجی ساز و سامان اور دیگر دفاعی ضروریات کی ہنگامی اور طویل المیعاد پوری پوری ذمہ داری لیں اور ساتھ ہی ساتھ اس کی توانائی اور اقتصادی ضروریات کا بھی خیال رکھیں۔'' اس دستاویز میں سرکاری طور پر امریکہ کی جانب سے یہ یقین دہانی کرائی گئی تھی کہ وہ کسی عالمی قوت... مطلب سوویت یونین تھا... سے خطرہ کی صورت میں امداد کرے گا۔ رابن حکومت کو جو دیگر وعدے میسر آئے وہ درج ذیل ہیں:

- ریاستہائے متحدہ پانچ برس کے لیے اس بات کی ضمانت دیتا ہے کہ اسرائیل اپنی تیل کی ساری داخلی ضروریات حاصل کر سکے گا۔ چاہے یہ امریکہ ہی سے مہیا کرنی پڑیں۔
- امریکہ ایک سال کی ضرورت کے برابر تیل ذخیرہ کرنے کی تنصیبات تعمیر کرنے کا پورا خرچہ برداشت کرے گا۔
- امریکہ ہنگامی حالات میں اسرائیل کو فوجی ساز و سامان پہنچانے کے لیے اپنا ہنگامی پروگرام تیار رکھے گا۔
- امریکہ نے اسرائیل کا موقف مشترکہ طور پر تسلیم کرنے کا وعدہ کیا کہ وہ اردن کے ساتھ جو بھی گفت و شنید کرے گا وہ مکمل معاہدہ امن پر محیط ہوگی۔ یعنی مغربی کنارے پر قدم بہ قدم سفارت کاری کے لیے کوئی گنجائش نہ ہوگی۔
- ریاستہائے متحدہ کے اس خفیہ معاہدے کے ایک خفیہ ضمیمہ میں یہ وعدہ کیا گیا کہ انتظامیہ ہر

سال کانگریس کو اسرائیل کی اقتصادی اور فوجی امداد کا اکٹھا مطالبہ پیش کیا کرے گی۔ اس میں یہ بھی اعلان کیا گیا کہ ریاستہائے متحدہ اس بات کا عہد کرتی ہے کہ وہ اسرائیل کو اعلیٰ ترین ساز و سامان یعنی ایف۔۱۶ ہوائی جہاز مہیا کر کے اس کی دفاعی قوت برقرار رکھنے کی پابند ہوگی۔ اس کے علاوہ امریکہ نے اس بات پر غور کرنے کا بھی وعدہ کیا کہ وہ اسرائیل کو اعلیٰ ٹیکنالوجی اور انتہائی اعلیٰ مہارت والی اشیاء جن میں زمین سے زمین پر مار کرنے والی پرشنگ میزائل بھی شامل ہے، منتقل کرنے کی کوشش کرے گا۔ یاد رہے کہ یہ میزائل عموماً جوہری بم گرانے کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ جب یہ معاہدہ افشا ہوگیا تو امریکہ کے پرشنگ کی منتقلی سے انکار کردیا۔

ایک اور خفیہ دستاویز میں کسنجر نے ریاستہائے متحدہ کو اس کا پابند کرا دیا کہ ''وہ تنظیم آزادی فلسطین کو نہ تو تسلیم کرے گا اور نہ ہی اس کے ساتھ گفت وشنید کرے گا۔ جب تک کہ وہ پہلے اسرائیل کے زندہ رہنے کے حق کو تسلیم نہ کرے اور سیکورٹی کونسل قرار داد ۲۴۲ اور ۳۳۸ کو تسلیم نہ کرلے۔'' ۱۹۵۸ء میں کانگریس نے انہی الفاظ کو قانون کا جامہ پہنا دیا۔ ریاستہائے متحدہ نے مستقبل میں ہونے والی کسی بھی جینوا کانفرنس سے پیشتر مکمل اور جامع حکمت عملی طے کرنے کے لیے باہمی مشاورت کا بھی عہد کیا۔ گویا اسرائیل کا PLO کو تسلیم کرنے سے انکار اور PLO کے اندر اس وقت طاقتور گروپوں کا قرارداد نمبر ۲۴۲ اور ۳۳۸ ماننے سے انکار۔ یہ دونوں عوامل غربی کنارے کے تعطل کو دائمی جمود عطا کر دیتے ہیں۔

- صدر فورڈ نے ایک خط لکھ کر وزیر اعظم رابن سے یہ وعدہ کیا کہ امریکہ کوئی بھی امن تجاویز پیش کرنے سے پہلے ان کے بارے میں اسرائیل سے صلاح ومشورہ کرنے کا پابند ہوگا۔ یہ ایک کافی اہم رعایت تھی کیونکہ اس کے باعث اسرائیل کو درحقیقت امریکہ کی مشرق وسطیٰ پالیسی کے بارے میں پیشگی اطلاعات حاصل ہوگئیں۔
- اس کے علاوہ صدر فورڈ نے ایک اور خط لکھ کر وعدہ کیا کہ ریاستہائے متحدہ اسرائیل کے اس موقف کو کہ شام کے ساتھ کسی بھی معاہدہ امن کی بنیادی اسرائیل کے جولان کی پہاڑیوں پر قابض رہنے پر ہوگی۔ پوری اہمیت دے گا۔

اس قدر امریکی دولت، ٹیکنالوجی، عزت اور سفارتی امداد کے بدلے رابن اسرائیلی قابض

افواج نہر سوئز کے ۲۰ سے ۴۰ میل مشرقی جانب پیچھے ہٹانے پر رضامند ہوا۔ یعنی اب بھی آدھے سے زائد جزیرہ نما سینائی اس کے کنٹرول میں رہا!

رابن کے بارے میں ایک مرتبہ کسنجر نے کہا تھا کہ اگر اسے ریاستہائے متحدہ امریکہ کی ساری کی ساری اسٹریجک ایئر کمانڈ (S.A.C.) بطور ایک مفت تحفے کے بھی پیش کی جاتی تو وہ اول یہ رویہ ظاہر کرتا کہ آخر کار اسرائیل کو اس کا حق مل کر رہا اور دوم وہ ان جہازوں میں کچھ ایسے فنی نقائص کو نکال دیتا کہ ان کا قبول کرنا امریکہ کے اوپر ایک احسان سمجھا جاتا!

فریب ''ہم زور دے کر یہ کہنا چاہیں گے کہ حکومت محاذ آرائی کی تمام سرحدوں پر یہودی بستیوں کی تعمیر اور استحکام کو جاری رکھے گی۔ یہ سیکورٹی کے لیے بہت ضروری ہے۔''

(رابن، اسرائیل وزیر اعظم ۱۹۹۲ء)

حقیقت:

اسرائیلی جرنیلوں اور کئی دیگر افراد کی ایک قابلِ توجہ تعداد نے پچھلے برسوں میں یہ کہا ہے کہ مقبوضہ علاقوں میں یہودی بستیوں کی کوئی بھی سیکورٹی اہمیت نہیں۔ بن یامین ضعیف بگین جیسے یکسو نظریہ ساز نے بھی جو ایک سابقہ وزیر اعظم کا فرزند اور لیکڈ پارٹی کی امتیازی صدا ہے کہا کہ ''حربی نکتہ نگاہ سے یہ بستیاں (جوڈیا، سماریہ اور غزہ میں) قطعاً اہم نہیں ہیں۔'' بقول اس کے ''اِن کی اہمیت اس وجہ سے تھی کہ یہ ایک نا قابلِ عبور رکاوٹ تھیں جس کے باعث دریائے اردن کے مغرب میں کبھی بھی ایک عرب ریاست قائم نہ ہو سکے گی!''

اسرائیلی سپریم کورٹ نے یہ فیصلہ دیا ہے کہ مقبوضہ غرب اردن میں نابلوس کے قصبہ کے اردگرد سیکورٹی نکتہ نظر سے یہودی بستیاں بسانے کے لیے فلسطینی علاقے پر قبضہ کرنا جائز نہیں۔ ۱۹۷۹ء کے اس عدالتی فیصلے کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ ان بستیوں کی حفاظتی اہمیت اتنی نہیں کہ ان کے لیے فلسطینی علاقہ ضبط کر لیا جائے۔ یہ عدالتی فیصلہ جزوی طور پر... زوردار مصدقہ بیانِ حلفی پر منحصر تھا جو سابقہ چیف آف اسٹاف حائم بارلیف نے عدالت میں پیش کیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ ''جوڈیہ اور سماریہ کے آباد علاقوں میں ان یہودی بستیوں سے موجودہ سیکورٹی میں ذرہ بھر اضافہ نہ ہوگا۔ برخلاف اس کے یہ سیکورٹی میں رکاوٹ کا باعث بنیں گی... ان آبادکاروں کی جانب کسی بھی سیکورٹی کے جذبے کو نتھی کرنا گمراہ کن اور حقیقت کو مسخ کرنے والی بات ہے۔ یہ بستیاں سیکورٹی کے حق میں نہایت ضرر رساں ہیں۔''

وزیراعظم رابن نے اب ''سیکورٹی بستیوں'' اور ''سیاسی بستیوں'' میں علیحدہ علیحدہ تمیز کرنا شروع کردی ہے۔ جب وہ ''سیکورٹی بستیوں'' کا ذکر کرتا ہے تو اس کا مطلب اردن کی سرحد پر واقع وادی اردن اور شام کی جولان کی پہاڑیوں پر قائم اگلی سرحدی بستیاں ہیں۔ جب وہ ''سیاسی بستیاں'' کہتا ہے تو اس کی مراد مشرقی یروشلم کے علاوہ فلسطینی آبادیوں کے مراکز میں قائم شدہ یہودی بستیاں ہوتی ہیں۔ رابن کے دوبارہ منتخب ہونے کے وقت مغربی کنارے پر ۵۱۰۰۰ نوآبادکاروں پر مشتمل تقریباً ۹۰ سیکورٹی بستیاں موجود تھیں... یعنی مغربی کنارے پر آباد کل ۱۸۰ بستیوں کا نصف جن میں تقریباً ایک لاکھ نوآبادکار بستے تھے۔ (یہ بتلانے کی ضرورت تو نہ ہونی چاہیے کہ ''نوآبادکار'' سے مراد یہودی تارکین وطن ہی ہوتا ہے... (مترجم)

سابقہ وزیر دفاع آذر وائیزمین ان بستیوں کی حمایت کرتا ہے لیکن صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہتا ہے ''سیکورٹی کی وجہ سے... یہ اسرائیل میں سکہ رائج الوقت الفاظ ہیں! ہم نے اپنی تمام جنگوں میں جو سبق سیکھا ہے وہ اس کے الٹ ہے۔ سرحدی بستیاں کبھی بھی فوج کا نعم البدل ثابت نہیں ہوئیں۔ ۱۹۴۸ء میں بھی جن بستیوں نے عرب افواج کے خلاف ڈٹ کر مقابلہ کیا تو وہ عام طور پر فوج کی امداد سے کیا۔ علاوہ ازیں اسرائیل کو یوم کپور جنگ میں جولان کی پہاڑیوں سے آبادکاروں کا انخلاء عمل میں لانا پڑا تھا کیونکہ وہ میدان جنگ کے عین درمیان پھنس کر رہ گئے تھے۔ کمزور اور بکھری ہوئی الگ الگ بستیاں فوجی نکتہ نظر سے ایک دردِ سر اور بوجھ شمار ہوتی ہیں۔''

یروشلم کے اندر اور اردگرد بستیاں قائم کرنے کے لیے رابن کسی سیکورٹی کے بہانے کا سہارا نہیں لیتا۔ وہاں پر یہودی بستیاں آباد کرنے کا واحد مقصد سارے یروشلم کو اسرائیل کا دارالحکومت کہہ کر ہتھیانا ہے۔ اپنے ۱۹۹۲ء کے افتتاحی اعلان میں رابن نے کہا: ''یہ حکومت بھی اس سے پیشتر تمام حکومتوں کی مانند اس بات پر یقین رکھتی ہے کہ اس ایوان میں یروشلم کا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اسرائیل کا دارالحکومت ہونے پر کسی قسم کا اختلاف رائے نہیں ہے۔ یروشلم، مکمل اور متحدہ طور پر اسرائیلی حاکمیت اعلیٰ میں رہے گا اور یہ ہمیشہ اسرائیلیوں کا دارالحکومت رہے گا۔ یہ وہ جگہ ہے جس کا خواب ہر اسرائیلی دیکھتا ہے اور اسے دیکھنے کی تمنا رکھتا ہے۔ یہ حکومت اس بات پر پختگی سے قائم ہے کہ یروشلم پر کوئی سودے بازی نہیں ہوسکتی۔ آئندہ برسوں میں بھی میٹروپولیٹن یروشلم کے اندر تعمیرات کو وسعت دینا جاری رہے گا۔ ہر یہودی چاہے وہ مذہبی ہو یا لادینی (سیکولر) اس کا عہد کرتا ہے کہ 'اے یروشلم! اگر

میں تجھے بھول جاؤں تو میرا دایاں ہاتھ برباد ہو!' یہ عہد ہم تمام کو متحد کرتا ہے اور میرے اوپر بھی لاگو ہوتا ہے کیونکہ میں تو یروشلم کا مقامی باشندہ ہوں۔"

فریب "دائمی حل کی طرف پہلے قدم کے طور پر ہم جوڈیا، سماریہ اور غزہ کے اضلاع میں حکومت خود اختیاری کو رائج کرنے کے بارے میں گفت وشنید کریں گے۔"

(رابن، اسرائیلی وزیر اعظم ۱۹۹۲ء)

حقیقت:

اپنے ۱۹۹۲ء کے افتتاحیہ اعلان میں وزیر اعظم رابن نے بڑا واضح طور پر کہا کہ اسرائیل مقبوضہ فلسطینیوں کو داخلی خودمختاری عطا کرنے پر رضامند ہے لیکن فلسطینیوں میں اس سے کوئی جوش پیدا نہ ہوا۔

وجہ؟ رابن وہی پلان پیش کر رہا تھا جو مناخم بیگن نے پندرہ برس پہلے پیش کیا تھا۔ مدت ہوئی اسے یہ کہہ کر رد کیا جاچکا تھا کہ یہ مقبوضہ علاقوں پر اسرائیلی قبضہ جاری رکھنے کے لیے ایک تاخیری حربہ ہے!

بیگن کی اس خودمختاری پلان میں مقبوضہ علاقے کے فلسطینیوں کو صرف معمولی سے معاملات مثلاً کچرا اٹھانے اور سڑکوں کی مرمت وغیرہ پر ایک بہت محدود سی خودمختاری دی جا رہی تھی لیکن ضروری معاملات مثلاً پانی یا زمین جس پر وہ رہائش پذیر تھے اس سے خارج تھیں۔ دریں اثناء اس کی رو سے قابض اسرائیلی دستے وہیں موجود رہتے اور مرکزی مسئلہ کہ ان علاقوں پر حاکمیت اعلیٰ کس کی ہوگی؟ اس کا پلان میں ذکر ہی نہ تھا اور نہ ہی اِس مسئلے کے حل کی کوئی میعاد مقرر کی گئی تھی۔

بقول اسرائیلی وزیر دفاع آذر وائیز مین "(بیگن) کے اس ایمان نے کہ مغربی کنارے اور غزہ کی پٹی پر اسرائیل کا قبضہ ہمیشہ رہنا چاہیے اُسے اِس خودمختاری پلان کی راہ دکھائی دی!" دوسرے لفظوں میں یہ ایک چالاکی تھی کہ فلسطینیوں کو بہت بڑی بڑی رعایتیں دینے کا تاثر دے کر اسرائیلی قبضے کو دوام بخشا جائے۔ سبکدوش ہونے والے وزیر اعظم یٹزاق شامیر کے وزیر انصاف ڈین میری ڈور نے ۱۹۹۲ء ہی میں یہ تسلیم کیا تھا کہ یہ خودمختاری پلان جوڈیا، سماریہ اور غزہ پر اسرائیلی تسلط برقرار رکھنے کا مؤثر ترین طریقہ ہے!

بیگن پلان کی تو کئی اسرائیلیوں نے بھی مذمت کی۔ ان میں یروشلم کی عبرانی یونیورسٹی کا پروفیسر

جیکب ٹال مون سب سے پیش پیش تھا۔ وہ صہیونیت اور ماڈرن نیشنل ازم پر ایک مستند عالم مانا جاتا ہے۔ ایک طویل خط میں ٹال مون نے بیگن کو لکھا کہ ''جناب وزیر اعظم! آپ جس طرز کی خودمختاری کا خیال پیش کر رہے ہیں وہ ایک قصہ پارینہ ہو چکی! یہ غیر یہودیوں کو بند کر دینے کی ایک چال ہے جو بھی پچھلی صدی کے اختتام پر کثیرالقوی سلطنتوں کی تاریخ سے ذرا سا بھی آگاہ ہے... وہ اس تاریخی کوڑے دان سے کھنگال کر نکالی گئی تجویز پر صرف حیرت سے اپنا سر ہی ہلا سکتا ہے۔

جناب وزیر اعظم! حکومت کے سربراہ کے طور پر پوری تعظیم روا رکھتے ہوئے اور ایک ساتھی مؤرخ کی حیثیت سے مجھے اجازت دیں کہ میں آپ کو نیشنل ازم کی تاریخ پر کچھ بتلاؤں۔ یہ کئی دہائیوں کی تحقیق اور تجسس کا نچوڑ ہے۔ وہ یہ کہ ہمارے معروضی ارادے چاہے جس قدر بھی قدیم، خصوصی، قابل عزت اور منفرد ہوں۔ لیکن غلبہ حاصل کرنے اور حکومت کرنے کی کوشش اور وہ بھی بیسویں صدی کے اواخر میں، ایک ایسی معاندانہ بدیشی آبادی پر جس کی زبان مختلف، تاریخ، ثقافت، مذہب، قومی امنگیں اور ضمیر، اقتصادیات، سماجی ڈھانچہ، غرضیکہ ہر چیز ہم سے جدا ہو... بالکل ایسے ہی ہے جیسے نوآبادیاتی نظام کو دوبارہ تازہ کرنا!''

> **فریب** ''حکومت ابتدائی اقدام کے طور پر... اغلباً دوسرے ممالک کے تعاون سے... اس بات پر توجہ دے گی کہ اسرائیل کے دشمنوں کے ہاتھ جوہری اسلحہ آجانے کی ہر ممکنہ کوشش کو ناکام بنا دیا جائے۔''
> (یتزاق رابن، اسرائیل وزیر اعظم ۱۹۹۲ء)

حقیقت:

اسرائیل کا یہ ڈھونگ کہ وہ جوہری اسلحہ کے پھیلاؤ کو روکنے کے لیے ایک طرح کا ٹھیکیدار بنا بیٹھا ہے۔ انتہائی مضحکہ خیز لگتا ہے جب کہ درحقیقت اس خطہ میں وہی ایک ایسا ملک ہے جس کے پاس جوہری اسلحہ ہے۔ لیکن زیادہ تشویش انگیز بات رابن کا یہ اشارہ ہے کہ دیگر ممالک بھی اسرائیل کے ساتھ اس رول میں اشتراک کریں۔ یقیناً رابن کا اشارہ امریکہ کی جانب ہے۔ گویا دونوں ممالک کا عربوں کے خلاف مزید ایک خفیہ اشتراک ہوگا۔ صدر بش اس بات کی تصدیق کرتا معلوم ہو رہا تھا جب وہ رابن کی افتتاحی تقریب کے بعد اسے ملا۔ ۱۱ اگست کو اس نے ایک مشترکہ نیوز کانفرنس میں کہا: ''ہم گویا اپنے آپ کو اس بات کا پابند کر رہے ہیں کہ روایتی ہتھیاروں کے علاوہ ہم مہیب اجتماعی تباہی لانے والے ہتھیاروں کے پھیلاؤ کو بھی روکنے کی کوشش کریں گے۔'' اگر ایسا ہی ہے تو گویا یہ

امریکہ اور اسرائیل کی پالیسیوں کو آپس میں گوندھنے کی مزید ایک اور کوشش ہے۔

اسرائیل کے ساتھ امریکہ کا ہتھیاروں کے پھیلاؤ کے معاملے میں گٹھ جوڑ کس طرح امریکی پالیسی کو مسخ کرتا ہے۔ اس کی ایک مثال جون ۱۹۹۲ء کو منظر عام پر آئی جب کامرس ڈیپارٹمنٹ کی ایک رپورٹ بعنوان ''گائیڈ برائے خطرناک ترین راکٹ منصوبہ جات/تیسری دنیا'' شائع ہوئی۔ اس فہرست کا مقصد یہ تھا کہ صنعتی فرموں کو ایسے منصوبوں کی نشاندہی کر دی جائے اور اس طرح ایسے سودوں کو روکا جائے جو اس میں معاون ثابت ہو سکتے ہوں۔ انتہائی حیرانی کی بات یہ تھی کہ اس میں مشرق وسطیٰ کے کئی بے حد خطرناک راکٹ منصوبوں کا ذکر ہی نہ تھا! جوہری ماہر گیری یل ہولن کے بقول اس کی وجہ یہ تھی کہ اسرائیلیوں نے انتظامیہ کی ۱۹۹۱ء کی فہرست کی مخالفت کی کیونکہ اس میں ''جیریکو'' کا نام بھی شامل تھا جو ان کی سب سے بڑی میزائل تھی۔ جب اسرائیل کے اس مطالبے کے سامنے ہتھیار ڈال دیے گئے کہ ''جیریکو'' کا نام فہرست سے خارج کیا جائے تو انتظامیہ کو مجبوراً وہ تمام راکٹ منصوبے بھی خارج کرنے پڑے جو مصر، لیبیا اور شام میں زیر تکمیل تھے۔ کیونکہ انتظامیہ کے اہلکاروں نے مجھے ذاتی حیثیت میں بتلایا کہ ایسا نہ کرنا اُن کے لیے سیاسی شرمندگی کا باعث ہوتا۔''

گویا دوسرے الفاظ میں امریکہ کو مشرق وسطیٰ کے تمام میزائل منصوبوں سے اس لیے چشم پوشی کرنا پڑی تاکہ وہ اسرائیل کو ''جیریکو'' نامی میزائل کو اس فہرست میں درج نہ کرے! یاد رہے کہ یہ میزائل کسی بھی عرب دارالحکومت پر جوہری ہتھیار گرانے کی صلاحیت رکھتی ہے۔

❄ ❄

باب: ۲۱

فلسطینیوں کی حالتِ زار!

عرب/اسرائیلی مناقشے کی بنیادی وجہ مدتوں سے غلط فہمی کا شکار رہی ہے کیونکہ اسرائیل اسے بڑی کامیابی اور پرکاری سے بطور عرب/یہودی نزاع کے پیش کرتا رہا ہے۔ درحقیقت یہ تنازع بہت محدود اور ذاتی نوعیت رکھتا ہے۔ اس کا مرکزی نکتہ صہیونیوں کی وہ کوشش ہے جو وہ فلسطینیوں کو ان کو گھربار سے بے دخل کرنے کے لیے کررہے ہیں۔ یہ ظالمانہ کوشش آج بھی اُسی شدت سے جاری و ساری ہے۔ اس کا عرب پہلو محض ایک اضافی شے ہے۔ جب تک اس تنازع کا بنیادی نکتہ نہ سمجھا جائے امن کی کوششیں کامیاب نہیں ہوسکتیں۔ امریکہ کو یہ سمجھنا ہی پڑے گا۔

فریب "دراصل فلسطینی/عرب مسئلہ اس نزاع کا نتیجہ ہے جس کی بنیاد مشرقِ وسطیٰ میں عربوں کا ایک یہودی ریاست کے قیام کو ماننے سے انکار ہے!" (AIPAC ۱۹۹۲ء)

حقیقت:

فلسطینی اس عرب/اسرائیل مناقشے کا علیہ ماعلیہ ہیں۔ ۱۹۴۸ء اور پھر ۱۹۶۷ء کی جنگوں میں فلسطینیوں ہی کو اپنے گھربار سے محروم ہونا پڑا تھا۔ وہ اسرائیلیوں کے ہاتھوں اپنی کاروباری جگہوں، اپنے کھیتوں، اپنے زیتون، سنگترے کے باغات اور زمینوں سے محروم ہوئے۔ ان میں سے بیشتر اور ان کی اولاد آج تک پناہ گزیں ہے!

مشرقِ وسطیٰ میں اسرائیلی "مسئلہ" کی بنیاد ہی ناامیدی اور برافروختہ لوگ ہیں۔ ۱۹۶۷ء سے اسرائیلی فوجی مقبوضہ علاقہ میں بسنے والے بیس لاکھ فلسطینی بھی اس احتجاج میں ان کے ہمنوا بن چکے ہیں۔

صہیونیوں کے پہلے راہنما دستہ کو فلسطینیوں کی مرکزیت کا پورا پورا ادراک تھا۔ اسرائیل کے پہلے وزیراعظم ڈیوڈ بن گوریان نے تو بہت قبل ہی ۱۹۳۶ء میں یہ کہہ دیا تھا "ہم اور وہ (فلسطینی) ایک ہی چیز کے طلب گار ہیں۔ ہم دونوں کو فلسطین درکار ہے اور یہی بنیادی تنازع ہے۔"

فریب ''یو۔این۔ جنرل اسمبلی اس حد تک روبہ تنزل ہو چکی ہے کہ کوئی بھی تجویز... چاہے وہ کتنی ہی نامعقول کیوں نہ ہو!... اس کی حمایت سے بہرہ ور ہو سکتی ہے۔ جب عرب/سوویت ووٹ کافی نہیں ہوتے تو پھر انہیں اضافی حمایت ان ممالک کے ووٹوں سے حاصل ہوتی ہے جو عربوں کے حمایتی ہیں یا ان کے تیل کی بلیک میلنگ کے آگے گھٹنے ٹیکنے والے!''

(یگال ایلن، اسرائیلی وزیر خارجہ ۱۹۷۴ء)

حقیقت:

اسرائیل برسہا برس سے اقوام متحدہ کا وقار گرانے میں مشغول رہا ہے۔ کیونکہ اقوام متحدہ اسرائیل، فلسطینی تنازع کے بنیادی وجوہ پہچاننے میں پیش پیش رہا ہے۔ ۱۹۶۹ء میں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے عالمی رائے عامہ کو اس تنازع کا صحیح ادراک کروانے کی طرف پہلا بڑا قدم اٹھایا جب اس نے فلسطینیوں کو ایک الگ قوم قرار دے کر ان کے ''ناقابل تنسیخ حقوق'' کو تسلیم کیا۔ قرارداد نمبر ۲۵۳۵ میں یہ درج ہے کہ اسمبلی یہ تسلیم کرتی ہے کہ فلسطینی پناہ گزینوں کا مسئلہ ان کو اقوام متحدہ کے چارٹر اور انسانی حقوق کے عالمی اعلان کے ذریعہ حاصل شدہ ناقابل تنسیخ حقوق نہ دیے جانے سے پیدا ہوا ہے۔ امریکہ ان ۲۲ ممالک میں سے ایک تھا جنہوں نے اس قرارداد کی مخالفت میں ووٹ دیا۔

اس قرارداد کی منظوری سے یہ عالمی احساس اجاگر ہونا شروع ہوا کہ فلسطینی ایک ایسی دربدر کی گئی قوم ہیں جن کے بین الاقوامی قوانین کے مطابق کچھ بنیادی حقوق بھی ہیں۔ پیشتر ازیں زیادہ تر عرب حکومتیں اور اسمبلی فلسطینیوں کو پناہ گزیں اور جنگ سے متاثرین جان کر فرداً فرداً برتاؤ کرتی تھیں۔ یہ رویہ اسرائیل کی بے پناہ کوششوں کا نتیجہ تھا۔ ان کا ہمیشہ سے اصرار تھا کہ فلسطینی کسی کمیونٹی کا حصہ نہیں بلکہ صرف افراد ہیں۔ یہ بالکل ویسی ہی بات تھی جیسے یہودیوں کو بیسویں صدی کے شروع اور ذرا قبل مشرقی یورپ میں ایک فرقہ تسلیم نہیں کیا جاتا تھا۔

۱۹۷۰ء اور ۱۹۷۴ء کے درمیان اسمبلی کی کئی قراردادوں میں فلسطینیوں کے بنیادی حقوق کا تعین کیا گیا۔ اسمبلی نے یہ تسلیم کیا ''فلسطین کے باشندوں کو اقوام متحدہ کے چارٹر کے ماتحت مساوی حقوق اور حق خود ارادیت حاصل ہے۔'' (قرارداد نمبر ۲۶۷۲)... یہ بھی مانا گیا کہ غیر ملکی تسلط اور نوآبادیاتی نظام کے شکار لوگوں کو احتجاج کرنے کا قانونی حق حاصل ہے۔ انہیں یہ حق ہے کہ وہ جو بھی ذرائع ان کے اختیار میں ہوں انہیں استعمال کر کے اپنے حق خود ارادیت کو حاصل کریں (قرارداد نمبر

۲۶۴۹) اور یہ اعلان بھی کیا کہ فلسطینیوں کے ناقابل تنسیخ حقوق میں پناہ گزینوں کی وطن واپسی کے حق کا حق خود ارادیت سے منسلک کرنا بھی شامل ہے۔ (قرارداد نمبر ۳۰۸۹)

فلسطینیوں، جدوجہد کی جائز قانونی اور اخلاقی بنیاد یہی قرار دادیں ہیں۔ ایک فلسطینی اسکالر غیاث ارمانازی کے بقول ''فلسطینیوں کو اب عالمی برادری سے ان چار حقوق کی پوری پوری حمایت حاصل تھی۔ وطن واپسی کا حق، حق خود ارادیت، جدوجہد کا حق اور اپنی اِس جدوجہد میں امداد حاصل کرنے کا حق۔''

امریکہ نے اِن سب قراردادوں کی مخالفت کرنے میں اسرائیل کا ساتھ دیا۔ بہرحال واشنگٹن نے ۱۹۴۸ء میں قرارداد نمبر ۱۹۴ کی ضابطہ کی کارروائی کے طور پر حمایت کی تھی۔ اس میں فلسطینیوں کو واپسی یا بصورتِ دیگر معاوضہ لینے کا حق دیا گیا تھا۔ اس قرارداد میں درج تھا ''جو پناہ گزیں واپس آنا اور بطور امن پسند ہمسایوں کے رہنا چاہیں انہیں واپسی کا حق ہوگا۔ وہ پہلی ممکنہ تاریخ کو واپس آسکتے ہیں اور جو واپس نہ آنے کا فیصلہ کریں ان کو اس جائیداد کے نقصان یا محرومی کا جو انہوں نے چھوڑ دی تھی معاوضہ ادا کیا جائے گا۔''

۱۲ رمئی ۱۹۹۲ء کو ریاستہائے متحدہ نے ایک مرتبہ پھر اس واپسی یا معاوضہ کے فارمولا کی حمایت کی تھی۔ اس کے اور قرارداد نمبر ۳۰۸۹ کے الفاظ میں جو فرق تھا وہ یہ تھا کہ مؤخر الذکر میں فلسطینیوں کی واپسی کا ذکر بطور حق کے درج تھا۔

فلسطینیوں کی صورت حال کو مزید استحکام ۱۹۷۴ء میں اس وقت حاصل ہوا جب جنرل اسمبلی PLO کو ''فلسطینیوں کی نمائندہ جماعت تسلیم کرلیا۔ ریاستہائے متحدہ نے اس قرارداد کی بھی مخالفت کی۔ دو ہی ہفتوں بعد مراکو کے شہر رباط میں عرب ریاستوں کے ایک اجلاس میں پی۔ ایل۔ او کو فلسطینیوں کی واحد جائز نمائندہ تنظیم اور ''فلسطینیوں کی آواز'' قرار دیا گیا۔

اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ نے آخر کار ۱۲ رنومبر ۱۹۷۵ء کو یہ اعلان عام کرکے کہ ''کئی طرح سے عرب اسرائیل تنازعے کا فلسطینی پہلو ہی اس مناقشے کی بنیاد ہے۔ آخری تصفیہ... بغیر ان عرب باشندوں کے حقوق اور دائمی پوزیشن طے کئے جو اپنے آپ کو فلسطینی کہتے ہیں ممکن نہ ہوگا۔'' اپنا ناطہ اسرائیل سے توڑا۔ امریکہ کے ڈپٹی اسسٹنٹ سیکریٹری آف اسٹیٹ برائے امورِ مشرقِ قریب ہیرالڈ ایچ۔ سونڈرز کا یہ بیان فلسطینیوں کے بارے میں پہلا مفصل امریکی بیان تھا۔

اسرائیلی کابینہ نے سونڈرز کے اس بیان پر گہری تشویش کا اظہار کیا اور الزام لگایا کہ اس میں کئی نقائص اور غلط بیانیاں موجود تھیں۔ اسرائیل میں اس بیان پر وہ اودھم مچا کہ سکریٹری آف اسٹیٹ ہنری کسنجر کو یہ سونڈرز دستاویز نظر انداز کرنی پڑی۔ یہ بعد ازاں ایک جامع اور علمی مشق کے طور پر مشہور ہوئی!... حالانکہ اسے ہنری کسنجر نے خود ذاتی طور پر جانچا پرکھا تھا۔ عربوں کے حوصلے کچھ دیر کے لیے تو اس بیان سے بڑھے لیکن جلد ہی انہیں یہ پتہ چل گیا کہ امریکی نکتہ نظر میں کوئی زیادہ سنجیدہ فرق رونما نہیں ہوا تھا۔

عرب/اسرائیل تنازع میں یہ سونڈرز دستاویز ایک اہم نشانِ راہ ثابت ہوئی۔ اس کے بعد ہی امریکی تجزیہ نگاروں نے پہلی مرتبہ فلسطینیوں کو ایک قوم گردانا شروع کیا نہ کہ بطور پناہ گزیں دہشت گرد یا مقبوضہ عرب!

فریب ''عرب مخالف ''نسل پرستی'' کا الزام ایک اوچھا ہتھکنڈا ہے!''

(ہائمن بک بائنڈر، امریکی جیوش کمیٹی کا سابقہ نمائندہ ۱۹۸۷ء)

حقیقت:

جونہی دنیا میں یہ احساس جاگا کہ عرب/اسرائیل مناقشے کا مرکز فلسطینی تھے۔ اسرائیلی پروپیگنڈہ بازوں اور لیڈروں نے فلسطینیوں کی اہمیت گھٹانا اور انہیں انسانیت سے گرانے کی کوششیں شروع کردیں۔ جب ۱۹۷۷ء میں دائیں بازو کی لیکڈ پارٹی برسراقتدار آئی تو اس رجحان میں بے حد سرگرمی آگئی۔ اسرائیلی لیڈروں کے بیانات میں فلسطینیوں کا ذکر کھلے عام نسل پرستی کے ذکر سے معمور ہوتا۔

وزیراعظم مناخم بیگن فلسطینیوں کو ''دوپایہ جانور'' سے تشبیہ دیتا۔ اس کے جانشین یتزاق شامیر نے فلسطینیوں کو مکھی اور جھینگر کے مساوی قرار دیا۔ شامیر تو اس حد تک چلا گیا کہ وہ ان فلسطینیوں کو جو صدیوں سے فلسطین کی سرزمین پر آباد تھے ''وحشی، جنگلی، ارضِ اسرائیل کے غیرملکی حملہ آور، ارضِ اسرائیل جس پر صرف اور صرف قومِ اسرائیل کا حق ہے'' کہہ کر پکارنے لگا۔ ادھر ۱۹۸۲ء کے لبنان پر فوج کشی کے دوران اسرائیل کے ملٹری چیف رافیل عیطان کے بقول ''جب ہم پوری طرح آبادکاری کر چکے ہوں گے تو عرب صرف زہر پاشی کیئے گئے کاکروچوں کی مانند بوتل کے اندر ادھر اُدھر سرپٹک رہے ہوں گے!''

عیطان نے بعد ازاں ''ٹی سومٹ'' (جنکشن) پارٹی تشکیل دی جو انتہائی دائیں بازو کی پارٹی

تھی۔ جس کا مقصد فلسطینیوں کو منتقل کرنا تھا۔ اس کے لیے وہ انہیں دو گروہ قرار دیتا تھا۔ ایک کو وہ اچھا اور دوسرے کو برا کہتا۔ برے گروہ کو موت کے گھاٹ اتار دینا چاہیے اور اچھے کو ملک بدر۔ ۱۹۹۲ء کے انتخابات میں عیطان کی اس پارٹی کو بیحد عروج حاصل ہوا اور اس نے کنسٹ میں اپنی نشستوں کو چار گنا یعنی آٹھ کے پرشکوہ میزان تک پہنچا دیا!

لیبر پارٹی کے لیڈران نے بھی جو عرصہ دراز تک اقتدار میں رہے متعدد مرتبہ فلسطینیوں کے وجود سے انکار کیا۔ ۱۹۶۹ء میں وزیراعظم لیوی اشکول کا دعویٰ تھا کہ ''یہ فلسطینی کیا شے ہیں؟ جب میں یہاں آیا تو یہاں ڈھائی لاکھ غیر یہودی آباد تھے۔ زیادہ تر عرب اور بدو! یہ ایک صحرا تھا! غیر ترقی یافتہ سے بھی کم! صفر!''

چند ماہ بعد جب مسز گولڈا مائیر اشکول کی جانشین بنی تو اس کا کہنا تھا ''ایک آزاد فلسطینی قوم کی فلسطینی ریاست تھی ہی کب؟ یہ پہلی عالمی جنگ سے قبل جنوبی شام تھا اور پھر یہ فلسطین بن گیا جس میں اردن بھی شامل تھا۔ ایسا تو نہیں ہوا کہ پہلے سے ایک فلسطینی قوم تھی جس کو ہم نے آ کر نکال باہر کیا اور ان کے ملک پر قبضہ کر لیا۔ ان کا تو سرے سے وجود ہی نہ تھا!''

۱۹۸۰ء کی دہائی کے وسط میں وزیراعظم رہنے والے شمعون پیریز نے ۱۹۷۰ء میں اپنی شائع شدہ کتاب میں کہا تھا کہ یہ ملک صرف ایک خالی صحرا تھا جس میں عربوں کے صرف چند جزیرے آباد تھے!

بہت سے اسرائیلی اب بھی اس بات پر اڑے ہوئے ہیں۔ ایک انتہا پسند ربی مائیر کہانے، جس نے تشدد پسند یہودی ڈیفنس لیگ قائم کی تھی اور جو اب مرحوم ہو چکا ہے، ایک مرتبہ نیویارک ٹائمز میں ایک اشتہار دیا تھا کہ ''فلسطینی قوم نام کی کسی شے کا کوئی وجود نہیں۔ کوئی فلسطینی نہیں ہیں!''

فلسطینیوں کو اس طرح انسانیت کے مرتبے سے گرا کر دکھلانے سے اسرائیلیوں کی مراد یہ ہوتی ہے کہ وہ فلسطینیوں سے چاہے جس قدر انسانیت سوز سلوک بھی کریں وہ اس سے بہتر کے مستحق ہرگز نہیں!

❋ ❋

باب: ۲۲

یروشلم پر اسرائیلی دعویٰ

قیامِ امن میں ایک بڑی رکاوٹ یروشلم کی حیثیت پر کشمکش ہے۔ یہ حقیقت کہ یہودی، عیسائی اور مسلمان سب ہی یروشلم کا احترام کرتے ہیں۔ اس کی حیثیت کو بین الاقوامی جہت عطا کرتا ہے۔ ۱۹۴۷ء کی اقوامِ متحدہ کی تقسیمِ فلسطین پلان میں اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہوئے اسے یعنی یروشلم کو "Corpus Separatum" یعنی سب شہروں سے جدا شہر قرار دیا گیا تھا۔ اس پر یہودی یا عرب حکمرانی کی بجائے اقوامِ متحدہ کے ماتحت ایک بین الاقوامی حکومت ہوگی۔ اسرائیل نے تقسیم پلان کو منظور کرتے وقت اور پھر بعد ازاں ۱۹۴۹ء میں اقوامِ متحدہ میں داخلے کے وقت اسے تسلیم کیا تھا۔ لیکن اسرائیل نے مسلسل اس وعدہ کی خلاف ورزی کی ہے۔ وہ اسے یہودیوں کا ابدی دارالحکومت قرار دیتے ہیں۔ ۱۹۶۷ء سے سارے یروشلم پر اسرائیل کا راج ہے۔ ۳۰ر جولائی ۱۹۸۰ء کو انہوں نے باقاعدہ اعلان کر دیا کہ سارے کا سارا یروشلم متحدہ طور پر اسرائیل کا دارالحکومت ہے۔ وہ آج تک اسی دعویٰ پر ڈٹے ہوئے ہیں!

فریب ''یہودی یروشلم اسرائیلی ریاست کا اٹوٹ انگ ہے!''

(ڈیوڈ بن گوریان پہلا اسرائیلی وزیر اعظم ۱۹۴۹ء)

حقیقت:

۱۹۴۷ء کی تقسیم پلان کو منظور کر کے یہودیوں نے اِس بین الاقوامی تنظیم کا یہ فیصلہ تسلیم کر لیا تھا کہ یروشلم بطور ایک الگ شہر کے نہ عرب کنٹرول میں ہوگا اور نہ یہودی کنٹرول میں۔ اس پر بین الاقوامی کنٹرول ہوگا۔ اس عہد و پیمان کی اس وقت توثیق مکرر کی گئی جب ۱۱ر مئی ۱۹۴۹ء کو اسرائیل کو اقوامِ متحدہ کی رکنیت عطا کی گئی۔ یاد رہے کہ یہ اس کی تیسری درخواست رکنیت تھی۔ اس کی پہلی دونوں درخواستوں کو نامنظور کرنے کی جزوی وجہ یروشلم کے بارے میں اس کی نیت پر بین الاقوامی شکوک و

شبہات ہی تھے۔

جلد ہی اسرائیل نے عالمی برادری کی حکم عدولی کرتے ہوئے یروشلم پر اپنا پورا حق جتلایا۔ ۵/دسمبر ۱۹۴۹ء کو اسرائیل کے پہلے وزیر اعظم ڈیوڈ بن گوریان نے اعلان کیا "یروشلم ریاست اسرائیل کے قلب کا قلب ہے!... ہم یہ سوچ بھی نہیں سکتے کہ اقوامِ متحدہ کی تنظیم یروشلم کو ریاست اسرائیل سے نوچ کر الگ کرنے کی کوشش کرے گی یا ریاست اسرائیل کے ابدی دارالحکومت پر اسرائیلی حاکمیتِ اعلیٰ کے دعویٰ کی تکذیب کرے گی۔"

اس کے ردِ عمل میں یو۔ این۔ جنرل اسمبلی نے چار روز بعد ہی تقسیم پلان میں یروشلم کے سارے شہر کو "Corpus Separatum" یعنی ایک جداگانہ شہر قرار دیے جانے کی مکرر تصدیق کی۔ گو اسرائیل کے دعویٰ کو رد کر دیا گیا لیکن اسرائیل نے دیدہ دلیری کا مظاہرہ کرتے ہوئے عالمی تنظیم کو یکسر نظر انداز کر دیا اور ۱۱/دسمبر کو باضابطہ اعلان کیا کہ یروشلم اسرائیل کے قیام کے روزِ اوّل سے ہی اس کا دارالحکومت تھا!

۱۶/دسمبر کو بن گوریان نے عالمی برادری کی نافرمانی کرتے ہوئے اپنا وزیر اعظم کا دفتر یروشلم منتقل کر دیا۔ اس نے ۱۹۵۰ء کے اوائل کو تمام سرکاری دفاتر کے یروشلم منتقل کئے جانے کی تاریخ قرار دیا ماسواء دفاتر خارجہ، دفاع اور پولیس ہیڈ کوارٹر کے۔

اسرائیل کے دفاتر کی یروشلم منتقلی اس انتباہ کے باوجود جاری رہی جب ۲۰/دسمبر کو یو۔ این۔ ٹرسٹی شپ کونسل (تولیتی ادارہ) نے اسرائیل سے یہ مطالبہ کیا کہ وہ یروشلم سے تمام دفاتر ہٹا لے کیونکہ یہ اس کے اقوام متحدہ کے ساتھ کئے گئے وعدہ کی خلاف ورزی تھی۔ ۳۱/دسمبر کو اسرائیل نے کونسل کو باقاعدہ طور پر آگاہ کیا کہ وہ یروشلم سے اپنی حکومت کو ہرگز نہ ہٹائے گا۔

اسرائیل کی اقوام متحدہ کی حکم عدولی کامیاب رہی۔ دسمبر ۱۹۴۹ء سے لے کر آج تک اسرائیل یروشلم کو اپنا قانونی جائز اور تسلیم شدہ دارالحکومت کہتا چلا آرہا ہے!

فریب "توسیع کی اصطلاح کا استعمال... برمحل نہیں! جو بھی اقدام (۱۹۶۷ء کی جنگ کے بعد) اٹھائے گئے ہیں ان کا تعلق یروشلم کو انتظامی اور میونسپل حلقہ اثر میں ضم کرنے سے ہے اور اس سے یروشلم کے مقاماتِ مقدسہ کو قانونی بنیاد پر تحفظ فراہم ہوتا ہے۔"

(ابا ایبان، اسرائیلی وزیر خارجہ ۱۹۶۷ء)

حقیقت:

۱۹۶۷ء کی جنگ کے خاتمہ پر اسرائیل نے بڑی عجلت سے شہر کی حدود میں توسیع کرتے ہوئے سارے کے سارے یروشلم پر اپنے ''ابدی دارالحکومت'' ہونے کا دعویٰ کیا۔ ۱۹۶۷ء تک یروشلم ایک قدیم فصیل شدہ شہر تھا جو آرمینیائی، عیسائی، یہودی اور مسلم حصوں میں بٹا ہوا تھا۔ اس کے اردگرد بھی آبادی تھی جو مشرق میں عربوں اور مغرب میں یہودیوں پر مشتمل تھی۔

۱۱ر جون کو صبح منہ اندھیرے ہی... جب کہ جنگ کو ختم ہوئے صرف ایک دن ہی ہوا تھا!... یروشلم کے شہر قدیم کے مغربی حصہ میں رہنے والے فلسطینیوں کو اسرائیلی دستوں نے صرف تین گھنٹے کے اندر اندر اپنے گھر خالی کرنے کا نوٹس دیا۔ یہ جگہ دیوار گریہ (جو کہ 'ٹمپل ماؤنٹ' کہلاتی ہے) اور حرم الشریف (بیت المقدس) کے پار مغرب کی جانب واقع ہے۔ اس وقفہ کے بعد اسرائیلی بل ڈوزروں نے دو مساجد اور تمام رہائشی عمارات کو اکھاڑ پھینکا!... اس طرح ۱۳۵ گھرانے یعنی ۶۵۰ مرد، عورتیں اور بچے بے گھر ہو گئے! یہ جنگ کے بعد ہونے والی فلسطینی جائیداد کی پہلی ضبطی تھی۔

ہفتہ بھر بعد یعنی ۱۸ر جون کو اسرائیلی فوجیوں نے فلسطینیوں کو شہر قدیم کے یہودی محلے سے نکل جانے کا حکم دیا۔ شروع شروع میں تو صرف چند سو باشندے ہی شہر بدر کیے گئے لیکن ان کئی سالوں میں یہودی حصہ سے تمام ہی فلسطینیوں کو گھر بدر کیا جا چکا ہے جن کی تعداد ۶۵۰۰ بنتی ہے۔ یہودیوں نے تو اکتوبر ۱۹۶۷ء سے ہی یہاں آ کر آباد ہونا شروع کر رکھا تھا۔

یہودیوں نے عرب مشرقی یروشلم پر اپنی گرفت مضبوط کرنے کے لیے جنگ کے خاتمے سے دو ہفتے بعد ہی فیصلہ کن اقدام کیے۔ یعنی ۲۷ر جون کو کنشت میں دو بنیادی آرڈیننس منظور کیے گئے۔ یعنی 'لاء اینڈ ایڈمنسٹریشن آرڈیننس' اور 'میونسپل کارپوریشنز آرڈیننس'۔ مؤخر الذکر نے وزیرِ داخلہ کو یہ اختیار عنایت کیا کہ وہ یروشلم کی حدود میں تبدیلی کر سکے اور اول الذکر نے اسے یہ اختیار دیا کہ وہ توسیع شدہ میونسپلٹی پر اسرائیلی قانون لاگو کر سکے۔ ۲۸ر جون یعنی اگلے ہی دن اس نے یہ دونوں کام انجام دے دیے۔ اس نے جنوب میں دس میل اور شمال میں نو میل سرحدوں کو بڑھا کر یروشلم کا رقبہ تقریباً ڈھائی گنا کر دیا۔ یعنی چالیس مربع کلومیٹر سے بڑھا کر ایک سو مربع کلومیٹر!

یروشلم کی نئی سرحدوں کا تعین بڑی احتیاط سے کیا گیا تھا۔ تاکہ بقول ڈپٹی میئر میرون بین وینستی اس بات کو یقینی بنایا جا سکے کہ نئی حدود کے اندر یہودیوں کی غالب اکثریت ہو جائے۔ وہ تمام

علاقے جہاں گنجان آباد فلسطینی آبادی تھی باہر رکھے گئے جب کہ عرب بستیوں کی وہ زمین جو اندر در آئی تھی اس توسیع شدہ شہر میں ضم کردی گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ توسیع شدہ شہری حدود کے اندر یروشلم میں ۶۸۰۰۰ فلسطینیوں کے مقابلہ میں ۱۹۷۰۰۰ یہودی آباد تھے۔ یہ ۱۹۴۷ء والی تقسیم سے پہلے کی حالت میں ایک ڈرامائی تبدیلی تھی۔ اس وقت ۱۰۵۰۰۰ فلسطینیوں کے مقابلے میں وہاں صرف ایک لاکھ یہودی عظیم یروشلم میں آباد تھے۔ قدیم میونسپلٹی کی شہری حدود میں یہ نسبت اب ساٹھ ہزار فلسطینی بمقابلہ ایک لاکھ یہودی تھی۔

۱۴ر جولائی ۱۹۶۷ء کو یو۔ این۔ جنرل اسمبلی نے اسرائیل کی اس بات پر مذمت کی کہ اس نے اسمبلی کی ۴ر جولائی والی قرارداد کو ماننے سے انکار کردیا تھا جس میں اسرائیل کو وہ تمام اقدام کالعدم کرنے کو کہا گیا تھا جن سے یروشلم کی حیثیت متاثر ہوتی ہو اور ایسے تمام اقدامات کو ناجائز قرار دیا گیا تھا۔ اس میں سکریٹری جنرل کو یروشلم کی صورت حال پر رپورٹ پیش کرنے کو بھی کہا گیا تھا۔

سفیر ارنسٹو ٹالمان جس کا تعلق سویٹزرلینڈ سے تھا، سکریٹری جنرل کا نمائندہ چنا گیا۔ اس کی رپورٹ تھی: ''اس میں شبہ کی کوئی گنجائش نہیں کہ اسرائیل وہ تمام اقدام اٹھا رہا ہے جس سے یروشلم کے ان حصوں پر اس کی حاکمیت اعلیٰ قائم ہوجائے جو جون ۱۹۶۷ء سے پیشتر اس کے کنٹرول میں نہ تھے... اسرائیلی حکام نے بغیر کسی لگی لپٹی رکھے یہ بتلایا کہ ادغام کا یہ عمل ناقابل واپسی اور ناقابل سمجھوتہ ہے!''

اسرائیلی وزیر خارجہ ابا ایبان کی اقوامِ متحدہ کو ان یقین دہانیوں کے باوجود کہ اسرائیل عرب مشرقی یروشلم کو اپنے ساتھ شامل نہیں کررہا۔ ان تمام اقدامات کا عملی نتیجہ یہی تھا۔ اس وقت سے ہی عرب مشرقی یروشلم کو اسرائیل کے آبی سپلائی نظام سے مربوط کردیا گیا اور سارے شہر کو اسرائیل کی یہودی ریاست کا جزو لاینفک قرار دیا گیا۔

اسرائیل نے سارے یروشلم کو باضابطہ اعلانیہ طور پر اپنے ساتھ شامل کرنے کے لیے ۳۰ر جون ۱۹۸۰ء تک انتظار کیا جب اس نے اعلان کیا کہ ''یروشلم کلیتاً ایک متحدہ شہر کے طور پر اسرائیل کا دارالحکومت ہے!'' اس آرڈیننس کو بنیادی قانون کا درجہ عطا کرکے گویا اسرائیلی کنشت نے اسے نیم دستوری مرتبہ دے دیا ہے۔ یہ قدم اس سے اگلے دن ہی اٹھایا گیا جب اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے اسرائیلی انخلاء اور فلسطینی ریاست کے قیام کو بذریعہ رائے شماری منظور کیا۔ اس انخلاء میں عرب مشرقی

یروشلم بھی شامل تھا۔

یہ ادغام اسرائیل کی اس طویل جدوجہد کی راہ کا ایک اہم سنگِ میل تھا جو وہ یروشلم کو ایک مکمل مقبوضہ اسرائیلی شہر بنانے کے لیے عالمی برادری کے خلاف کررہا تھا۔ اس ادغام سے فوری احتجاج کا ردِعمل سامنے آیا لیکن اسرائیل نے اپنا قدم واپس لینے سے انکار کردیا اور وہ آج تک اس مقدس شہر پر قابض ہے!

فریب ''۱۹۶۷ء میں ایک نئی امریکی پالیسی کا افتتاح ہوا جو آج تک بغیر کسی تبدیلی کے جاری ہے۔ یعنی متحدہ یروشلم پر اسرائیل کے قبضہ کی بطور حقیقت بالواسطہ منظوری!''

(یوصی فینگ، اسرائیلی اسکالر ۱۹۸۷ء)

حقیقت:

ریاستہائے متحدہ نے سارے شہر پر اسرائیلی کنٹرول کی لگاتار مخالفت کی ہے۔ دوسری بہت سی اقوام کی مانند اس نے بھی یروشلم کی بجائے تل ابیب میں ہی اپنا سفارت خانہ قائم کررکھا ہے تاکہ یہ اسرائیل کے پورے یروشلم پر دعویٰ حاکمیت کی مخالفت کی علامت رہے۔

۱۹۵۰ء کی دہائی کے اوائل میں تو آئیزن ہاور انتظامیہ اس حد تک چلی گئی کہ اس نے امریکی سفارت کاروں کو یروشلم میں واقع اسرائیلی حکام سے معاملات کرنے سے منع کردیا۔ یہ ڈرامائی قدم اس وقت اٹھایا گیا جب ۱۳ر جولائی ۱۹۵۳ء کو اسرائیل نے اپنی وزارت خارجہ کو تل ابیب سے یروشلم منتقل کردیا۔ اس کے ردِعمل میں امریکہ، برطانیہ اور دوسرے کئی ممالک نے یروشلم میں منعقدہ تمام تقاریب کا بائیکاٹ کردیا۔ انہوں نے وزات خارجہ میں جانے سے انکار کردیا کیونکہ یہ تبدیلی اسرائیل کے اس اقدام کی حمایت ہوتی جس کے تحت وہ سارے یروشلم کو اسرائیل کا دارالحکومت بنانے کا دعویٰ کررہا تھا۔

امریکی وزیر خارجہ جان فوسٹر ڈلس نے یہ بائیکاٹ ڈیڑھ سال تک جاری رکھا لیکن بعد ازاں عملی مشکلات اور اسرائیلی مستقل مزاجی کے آگے گھٹنے ٹیک دیے۔ ۱۲ر نومبر ۱۹۵۴ء کو اس نے اسرائیل میں نئے متعینہ امریکی سفیر ایڈورڈ لاسن کو اپنی اسناد یروشلم میں پیش کرنے کی اجازت دے دی اور اس طرح یہ بائیکاٹ ختم ہوا۔

ایک داخلی دستاویز کے مطابق اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ نے یہ تہیہ کررکھا تھا کہ وہ ''یروشلم کے مسئلہ کو ٹھپ نہ ہونے دیں گے اور نہ ہی اسے بطور ایک طے شدہ امر یا دشمن کے تھکا کر ہار مان لینے پر مجبور

کر دینے والی حکمت عملی کو کامیاب ہونے دیں گے۔" چنانچہ اسرائیل نے یروشلم میں اپنی نئی پارلیمنٹ بلڈنگ کا افتتاح کیا تو کوئی بھی امریکی سفارت کار شامل نہ ہوا۔ البتہ کانگریس کے نمائندوں کا ایک گروپ موجود تھا۔

اِس سب کے باوجود یروشلم پر امریکی پالیسی پچھلے سالوں میں انحطاط پذیر رہی ہے۔ ۱۹۴۹ء میں ہی انتظامیہ نے یروشلم کو ایک بین الاقوامی شہر کہنا ترک کر دیا حالانکہ ۱۹۴۷ء کے تقسیم فلسطین پلان میں وہ اسے منظور کر چکے تھے۔ اس کی بجائے یہ تجویز کیا گیا کہ وہاں عرب اور اسرائیلی مقامی حکومت کے حلقے ہوں جن کے اوپر ایک یو۔ این۔ کمشنر مقرر ہوگا جو مقاماتِ مقدسہ اور خارجہ تعلقات کی نگرانی کرے گا اور یروشلم کسی بھی ملک کا دارالحکومت نہ ہوگا۔

۱۹۶۹ء میں نکسن انتظامیہ نے مزید پسپائی اختیار کرتے ہوئے یو۔ این۔ کمشنر کا ذکر حذف کر دیا۔ یروشلم کے بین الاقوامی شہر ہونے پر اصرار ترک کر دیا اور اپنی حکمت عملی کو اس سادے سے فارمولے تک محدود کر دیا کہ یروشلم ایک غیر منقسم شہر رہے گا جس کا مستقبل متعلقہ فریق باہمی مشاورت سے طے کریں گے۔ بہر حال انتظامیہ نے ۱۹۶۹ء میں یہ اعلان بھی کیا کہ عرب مشرقی یروشلم جسے اسرائیلیوں نے ۱۹۶۷ء میں فتح کر لیا تھا وہ ایک مقبوضہ علاقہ ہے جیسے کہ باقی سب مقبوضہ علاقے!

صدر جارج بش نے ۳ر مارچ ۱۹۹۰ء کو اعلانیہ طور پر اس پالیسی کا اعادہ کیا اور عرب مشرقی یروشلم کو مقبوضہ علاقہ قرار دیا۔

فریب "یروشلم اسرائیل کا دارالحکومت ہے اور اسے ایسا ہی رہنا چاہیے!"

(امریکی سینٹ اور ایوان نمائندگان قرارداد ۱۹۹۰ء)

حقیقت:

اگر ایک طرف امریکی حکومت اس اسرائیلی دعویٰ کی کہ یروشلم اس کا دارالحکومت ہے لگاتار مخالفت کرتی آئی ہے تو دوسری طرف کانگریس حسب ضابطہ لگاتار ایسی غیر واجب قراردادیں منظور کرتی چلی آئی ہے کہ یروشلم کو اسرائیل کا دارالحکومت تسلیم کر لیا جائے۔

۱۹۸۸ء میں تو نارتھ کیرولینا کے ری پبلکن سینٹر جیسی ہیلمز نے یہ تجویز تک پیش کر دی کہ Deptt. of State Appropriations Act میں ترمیم کر کے اسرائیل میں دو علیحدہ علیحدہ سفارت خانوں کا قیام عمل میں لایا جائے۔ یعنی ایک تل ابیب میں اور دوسرا یروشلم یا "مغربی کنارے"

میں! ناقدوں کے خیال میں یہ اسرائیل کے حمایتیوں کی ایک مزید کوشش تھی جس کے تحت امریکی سفارت خانے کو یروشلم منتقل کیا جانا مقصود تھا۔ ری پبلکن اقلیتی لیڈر رابرٹ ڈول جو ریاست کینسا سے تھا، ۱۹۹۰ء میں یہ شکایت کرتا پایا گیا کہ کانگریس ایسی قراردادوں کو جو ''بغیر کسی بحث مباحثہ کے پندرہ سیکنڈ کے اندر اندر منظور کر لی جاتی ہیں'' منظور کر کے غیر ذمہ داری کا ثبوت دے رہی ہے۔ ڈول کا کہنا تھا کہ ۱۹۹۰ء کی قرارداد یروشلم کو اسرائیل کا دارالحکومت قرار دیتی ہے!... جو کہ اسرائیلی حکومت کا نکتہ نظر ہے اور یہ عرب حکومتوں اور فلسطینیوں کے نکتہ نظر کے بالکل مخالف ہے۔ سب سے اہم بات تو یہ ہے کہ قرارداد ایک ایسے مسئلے پر رائے زنی کر رہی ہے جسے ہماری حکومت... اور کئی بیرونی مبصر بھی... فریقین کے باہمی گفت وشنید پر چھوڑ دینا زیادہ مناسب خیال کرتے ہیں نہ کہ یکطرفہ کارروائی کے ذریعہ فیصلہ کرنے کو!''

باایں ہمہ ڈیموکریٹک پارٹی نے اسرائیل کی یہ پوزیشن باضابطہ طور سے اپنے سیاسی پلیٹ فارم پر صاد کر دی ہوئی ہے۔ انہوں نے مطالبہ کیا ہے کہ امریکہ کا سفارت خانہ یروشلم منتقل کر دیا جائے۔ ۱۹۸۴ء کا ڈیموکریٹک اعلان کہتا ہے کہ ڈیموکریٹک پارٹی یروشلم کو اسرائیل کا دارالحکومت تسلیم کرتی ہے اور اس کی طے شدہ حیثیت کو مانتی ہے۔ اس حقیقت کے مظہر کے طور امریکی سفارت خانے کو تل ابیب سے یروشلم منتقل کر دیا جانا چاہیے!

اسی سال ایوان کی یورپ اور مشرق وسطیٰ اور بین الاقوامی آپریشن کی ذیلی کمیٹیوں نے یہ غیر واجب قرارداد منظور کی کہ کانگریس کی نیت سفارت خانے کو جس قدر جلد ممکن ہو یروشلم منتقل کر دینے کی ہے۔ یہ امریکی یہودی لابی کے بڑے اہداف میں سے ایک ہے۔ حد تو یہ ہے کہ اسرائیل کے جارج شلز جیسے سرگرم حمایتی نے بھی کانگریس کو متنبہ کیا کہ ایسا کرنا مصلحت اندیشی کے خلاف ہوگا۔

ان سب کے باوصف ڈیموکریٹک پارٹی نے یروشلم کے معاملے میں اسرائیل کی حمایت جاری رکھی ہوئی ہے۔ ۱۹۸۸ء میں ڈیموکریٹک صدارتی امیدوار مائیکل ڈوکاکس نے سفارت خانے کو یروشلم منتقل کرنے پر اپنی رضامندی ظاہر کی تھی اور ۱۹۹۲ء میں بل کلنٹن نے بھی یہی کہا۔ ۱۹۹۲ء میں ڈیموکریٹک پلیٹ فارم نے یروشلم کو اسرائیل کا دارالحکومت تو کہا لیکن اس بات پر اصرار کی حد تک نہ گیا کہ سفارت خانہ وہاں منتقل کیا جائے۔

❋ ❋

باب: ۲۳

یہودی بستیاں

فلسطینیوں کی سرزمین پر مقبوضہ علاقے میں جو یہودی بستیاں قائم کی گئی ہیں وہ امن کی تلاش میں ایک بہت بڑی رکاوٹ ہیں۔ اقوامِ متحدہ کے میثاق میں علاقہ زبردستی قبضہ کرنا خصوصی طور پر خلاف قانون قرار دیا گیا ہے اور ۱۹۴۹ء کی 'چوتھی جینوا کنونشن برائے تحفظ شہری افراد بوقت جنگ' تو قابض قوت کو بطورِ خاص اس بات سے منع کرتی ہے کہ وہ اپنی آبادی کے کسی بھی جزو کو مقبوضہ علاقے میں لے جاکر بسائے۔ اسرائیل نے ان دونوں بین الاقوامی ضابطوں کو ہمیشہ ہی بالائے طاق رکھا ہے۔ ۱۹۶۷ء سے اس نے بزورِ شمشیر عرب مشرقی یروشلم، غربی کنارہ، جولان کی پہاڑیاں اور غزہ کی پٹی پر قبضہ جما رکھا ہے اور ان تمام علاقوں میں یہودی بستیاں بسانے کا عمل لگاتار جاری ہے۔

اس جرم میں ریاستہائے متحدہ امریکہ برابر کا حصہ دار ہے کیونکہ اس نے فلسطینیوں کی سرزمین کو ایک نوآبادی میں تبدیل کرنے اور فوجی قبضہ کرنے میں اسرائیل کا پورا پورا ساتھ دیا ہے۔ گو امریکن پالیسی سرکاری طور پر تو یہی ہے کہ یہودی بستیاں مزید نہ بسائی جائیں لیکن یہ کوشش کبھی نہیں کی گئی کہ اسرائیل کو سالانہ دی جانے والی فوجی اور اقتصادی امداد جو تین ارب ڈالر ہے روک کر یہودی ریاست پر دباؤ ڈالا جائے کہ وہ مقبوضہ علاقوں میں اپنے نوآبادیاتی عمل کو ترک کرے۔

اگر امریکی امداد میسر نہ ہو تو اسرائیل ہرگز ہرگز اپنا فوجی قبضہ جاری رکھنے یا نوآبادیاں بسانے پر قادر نہ ہوگا کیونکہ اس کے پاس اس کے لیے وسائل ہی نہ ہوں گے۔

فریب ''ہمارا حق (مقبوضہ علاقے پر) مسلمہ ہے!''

(یتزاق رابین، اسرائیلی وزیر اعظم ۱۹۷۴ء)

حقیقت:

ہر امریکی انتظامیہ چاہے وہ ڈیموکریٹ تھی یا ری پبلکن، ماسوائے بے حد جانبدار اور اسرائیل

نواز ریگن صدارتی دور کے... اسرائیل کے ۱۹۶۷ء میں ہتھیائے گئے علاقوں پر دعویٰ کے خلاف رہی ہے۔ انہوں نے ہمیشہ اسے میثاقِ اقوام متحدہ اور چوتھی جنیوا کنونشن برائے تحفظ شہریاں بوقت جنگ کی خلاف ورزی قرار دیا ہے اور غیر قانونی کہا۔ اقوامِ متحدہ نے بھی یہی موقف اختیار کیا ہے۔

اول یہ امریکی پالیسی صدر نکسن کے سفیر برائے اقوامِ متحدہ چارلیس ڈبلیو۔ یوسٹ نے بیان کی تھی۔ اس نے ۱۹۶۹ء میں کہا تھا کہ ''یروشلم کا وہ حصہ جو جون کی جنگ سے اسرائیل کے کنٹرول میں آیا ہے وہ اسرائیل کے تمام دوسرے مقبوضہ علاقوں کی مانند ایک مقبوضہ علاقہ ہے۔ لہٰذا اس پر وہ تمام عالمی حقوق اور ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں جو ایک مقبوضہ قوت پر ہونی چاہئیں!''

۲۳ر مارچ ۱۹۷۶ء کو اقوامِ متحدہ میں امریکی سفیر ولیم، ڈبلیو، سکرینٹن جسے صدر جیرالڈ فورڈ نے بھجوایا تھا۔ سلامتی کونسل میں یہ اعلان کیا کہ مقبوضہ علاقوں میں یہودی نوآبادکاروں کی بستیاں غیر قانونی ہیں اور اس کا پورے یروشلم پر دعویٰ بالکل بے بنیاد ہے! بقول سکرینٹن: ''میری حکومت کا خیال ہے کہ (اسرائیل کی بستیوں پر لاگو) قانون اس بارے میں مناسب معیار مقرر کرتا ہے۔ کسی بھی قابض کو مقبوضہ علاقہ ممکن حد تک جوں کا توں رکھنا چاہیے۔ اسے ان علاقوں کے رواجی قوانین میں دخل نہیں دینا چاہیے۔ اگر کوئی تبدیلی اشد ضروری بھی ہو تو وہ علاقے کے باشندوں کے حق اور عالمی قوانین کے تناظر میں ہونی چاہیے۔ چوتھی جنیوا کنونشن میں آرٹیکل ۴۹ میں صاف طور پر تبادلہ آبادی کے مسئلہ کا ذکر ہے۔ یعنی قابض قوت اپنے شہریوں کو اپنے مقبوضہ علاقوں میں لا کر بسانا یا ملک بدر کر کے ڈھکیلنا ہرگز نہیں کرے گی۔ صاف ظاہر ہے کہ مقبوضہ علاقوں بشمول مشرقی یروشلم کے اسرائیلی شہری آبادی کو لا کر بستیاں قائم کرنا غیر قانونی ہے۔ یہ کنونشن کی خلاف ورزی ہے۔ اس سے اس فیصلے پر جو مستقبل میں مشرقِ وسطیٰ کی ریاستوں کی حد بندی کے لیے کیا جائے گا ہرگز زد نہیں پڑنے دی جائے گی۔ ان بستیوں کا وجود میری حکومت کے خیال میں اسرائیل اور اس کے ہمسایوں کے مابین حتمی امن مذاکرات کی کامیابی کی راہ میں ایک واضح رکاوٹ ہے۔''

اسرائیل نے سرکاری طور پر اس تقریر کے بارے میں احتجاج کیا۔ اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کا جواب تھا کہ سکرینٹن صرف ایک مسلمہ قدیم امریکی پالیسی بیان کر رہا تھا!

ان بستیوں کے خلاف امریکی بیانات سب سے زیادہ کارٹر انتظامیہ کے دور میں دیے گئے۔ صدر کارٹر اور اس کے سکریٹری آف اسٹیٹ سائرس وانس نے تو اعلانیہ ان اسرائیلی بستیوں کو غیر قانونی

قرار دیا۔ ۱۲راپریل ۱۹۷۸ء کو اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کے قانونی مشیر ہربرٹ ہینسل نے واشنگٹن کی پوزیشن کو قانونی طور پر یوں واضح کیا: ''یہ بستیاں بین الاقوامی قانون کے خلاف ہیں!'' اس رائے میں اس بات پر بھی زور دیا گیا تھا کہ ان مقبوضہ علاقوں یعنی غربی کنارہ اور غزہ کی پٹی پر بھی اس چوتھی جنیوا کنونشن کا اطلاق ہوتا ہے۔ حالانکہ اسرائیل اس کو نہیں مانتا۔ اس کا کہنا تھا کہ ان علاقوں پر حقِ حاکمیت متنازع ہے۔

۱۹۸۱ء میں رونالڈ ریگن کی صدارت شروع ہونے تک یہی پالیسی رہی۔ حتیٰ کہ ۲رفروری کو ریگن کے حیران کن بیان نے اسے گنگ کر دیا۔ بقول ریگن ''میں نے گذشتہ انتظامیوں کے ساتھ اس بارے میں (یعنی اسرائیلی نوآبادیوں کو غیر قانونی کہنا) اختلاف رائے کیا تھا... یہ غیر قانونی نہیں ہیں!'' ریگن کی پالیسی میں ان بستیوں کی قانونی حیثیت اصل میں کیا تھی؟ اس کو کبھی واضح نہیں کیا گیا۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا اس پر یہ عیاں ہوتا گیا کہ یہ بستیاں معاہدہ امن کی راہ میں ایک بہت بڑی رکاوٹ تھیں۔ اس نے بارہا یہ کہا۔ اس کے خیال میں ان بستیوں کے قیام میں اسرائیل کی یہ پھرتی ان کے بارے میں خواہ مخواہ کے شکوک وشبہات پیدا کرتی تھی۔

اس دوران باقی ساری دنیا ان کو غیر قانونی مانتی اور کہتی رہی۔ یورپی یونین نے ہمیشہ یہ کہا ہے کہ اسرائیل نے ۱۹۶۷ء سے مقبوضہ علاقے بشمول مشرقی یروشلم میں جو بھی یہودی بستیاں آباد کی ہیں وہ بین الاقوامی قانون کے مطابق غیر قانونی ہیں اور یہ کہ اسرائیلی نوآبادی پالیسی اس خطہ میں امن کے لیے سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔

صدر ریگن کے اس ''غیر قانونی نہیں ہیں'' کے اعلان کے بعد صدر بش نے اپنی صدارت کے دوران گھڑی کی سوئیاں الٹی گھمانا پسند نہ کیا۔ لیکن بش انتظامیہ کے اہلکاروں کا بالواسطہ یہ اعتراف تھا کہ یہ بستیاں نہ صرف امن کی راہ میں رکاوٹ ہیں بلکہ غیر قانونی بھی ہیں۔ ۱۹۹۱ء میں سکریٹری آف اسٹیٹ جیمز بیکر نے کہا: ''ہم ان (اسرائیلی بستیوں) کو غیر قانونی قرار دیتے تھے مگر اب ہم انہیں امن کی راہ میں رکاوٹ بھی سمجھتے ہیں۔''

وزیراعظم یتزاق شامیر کا فلسفہ ہی جدا تھا۔ ۱۹۹۲ء میں انتخابی شکست کے فوراً بعد اس نے کہا: ''لیکڈ نے جوڈیا اور سماریہ (غربی کنارہ اور غزہ کے اسرائیلی نام... تاکہ دنیا کو نام بدل کر دھوکا دیا جاسکے... (مترجم) پر اپنی حاکمیت کے دعویٰ کو کبھی چھپایا نہیں کہ وہ ان پر حتمی معاہدہ کے وقت مکمل

قبضہ چاہے گی۔ اس نے اس اصول کو اپنایا تھا کہ وہ تمام وقفہ گفت و شنید میں یہودیوں کے ارضِ اسرائیل کے کسی بھی حصے میں جا کر آباد ہونے کے حق کا دفاع کرے گی۔ دریائے اردن کے غربی کنارے پر عرب حاکمیت اعلیٰ کے خلاف صرف یہی یہودی شہری اور دیہاتی بستیاں سارے جوڈیا اور سماریہ کے لیے ایک ضمانت ثابت ہوسکتی ہیں۔"

فریب "یہودیوں کو مقبوضہ علاقے میں آباد ہونے کا حق حاصل ہے۔"

(مناخم بیگن، اسرائیل وزیر اعظم ۱۹۸۰ء)

حقیقت:

ریاستہائے متحدہ اور اقوام متحدہ نے بارہا خبردار کیا ہے کہ یہودیوں کو مقبوضہ علاقوں میں آباد ہونے کا کوئی خصوصی حق ہرگز حاصل نہیں۔ اس کے باوجود اسرائیل نے ۱۹۶۷ء کی جنگ کے ختم ہونے کے دن سے لے کر آج تک عالمی رائے عامہ کو مقبوضہ علاقوں میں لگاتار بستیاں بسا کر جوتے کی نوک پر رکھا ہوا ہے۔ ۲۷؍جون کو یعنی بمشکل تین ہی ہفتے بعد اسرائیل نے مشرقی یروشلم کا عملی طور پر الحاق کرلیا اور ۱۵؍جولائی کو اسرائیل نے ان علاقوں میں پہلی بستی قائم کردی!... جو کہ جولان کی پہاڑیوں پر قنیطرہ کے قریب میروم ہیگولان کے نام سے قائم کی گئی!

وزیر اعظم لیوی ایشکول نے اسرائیل کے ابتدائی آبادکاری پلان کی اعلانیہ تشہیر سے پیشتر ۲۴؍ستمبر تک انتظار کرنا مناسب جانا۔ اس کا کہنا تھا کہ یہ محدود ہوگی۔ اس نرم و ملائم بیان پر بھی امریکی ردِ عمل نکتہ چینی کا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ ایشکول کے اس اعلان سے اسرائیل کے بستیاں نہ بسانے کی پہلی پالیسی میں تبدیلی کا اظہار ہوتا ہے۔ امریکی بیان میں یہ بھی کہا گیا کہ اسرائیل نے اپنی اس تبدیلی سے واشنگٹن کو بروقت آگاہ نہیں کیا تھا۔ اس بیان کی مزید وضاحت کرتے ہوئے اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کے ایک نمائندے نے کہا کہ یہ نئی پالیسی صدر جانسن کے ۱۹؍جون والے بیان سے متصادم تھی جس میں امریکہ نے اس تمام خطے میں علاقائی سلامتی قائم رکھنے میں امداد دینے کا وعدہ کیا تھا۔

یہ چار دنوں کے اندر واشنگٹن کی جانب سے دوسری بار اسرائیل کی اعلانیہ سرزنش تھی۔ یو۔این میں امریکی نمائندے آرتھر گولڈ برگ نے خبردار کیا کہ یہ امن کی کوئی خدمت نہیں اگر "ایک ممبر کو اس کی فوجی فتح اس قدر مغرور کردے کہ وہ یہ فراموش کردے کہ اس کے ہمسایوں کے بھی کچھ حقوق اور

مفادات ہیں!'' اس کے باوجود اسرائیل نے ۱۹۶۷ء کے اواخر تک مصر، اردن اور شام سے ہتھیائے گئے تمام مقبوضہ علاقوں میں یہودی بستیاں قائم کردی تھیں۔ ۱۹۶۷ء کے بعد اسرائیل کے بستیاں بسانے کے عمل میں مزید تیزی آ گئی۔

۱۹۴۸ء سے قبل اس علاقے میں جو ۱۹۶۷ء کی جنگ میں ہتھیایا گیا صرف سات یہودی بستیاں تھیں اور صرف ایک فیصد زمین پر یہودیوں کا قبضہ تھا۔ ربع صدی بعد یعنی مئی ۱۹۹۲ء میں اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کی رپورٹ کے مطابق عرب مشرقی یروشلم میں ۱۲۹۰۰۰ یہودی آباد تھے (بمقابلہ ۱۵۵۰۰۰ فلسطینیوں کے)۔ غربی کنارے پر آباد ۱۸۰ نوآبادیوں میں ۹۷۰۰۰ یہودی آباد تھے اور آدھا زمینی رقبہ ان کے زیر تصرف تھا۔ غزہ کی پٹی کی بیس بستیوں میں ۳۶۰۰ یہودی تھے اور جولان کی پہاڑیوں پر تیس بستیوں میں ۱۴۰۰۰ یہودی آباد تھے۔ ایک دوسری رپورٹ کے مطابق انہی پچیس سالوں میں اسرائیل نے غربی کنارے کا ۵۵ فیصد، غزہ کی پٹی کا ۴۲ فیصد اور جولان کی پہاڑیوں کا تمام علاقہ فلسطینیوں کی ملکیت سے چھینا یا دیگر طریقوں سے ہتھیا لیا ہے۔ اسرائیل نے یہ سارا علاقہ بمع عرب مشرقی یروشلم کے اپنی ریاست میں ضم کرلیا ہوا ہے۔ پانی کے تمام ذرائع اسرائیلی کنٹرول میں ہیں اور غربی کنارے کے پانی کا ۳۰ فیصد اسرائیل یا اس کے نوآبادکاروں کی طرف موڑ دیا گیا ہے۔

اس کے علاوہ اسرائیلی انتہا پسند قوم پرست مثلاً ''عطرت کو ہانیم'' کے ممبران جو قدیم یروشلم شہر کے اندر واقع ٹمپل ماؤنٹ/حرم الشریف پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں، قدیم شہر کی حدود میں بڑے زور وشور سے آباد ہو رہے تھے۔ شامیر حکومت کی شہ پر تقریباً ۶۰۰ یہودی آبادکار (جن کی زیادہ تر تعداد دینی مدرسوں کے طلباء پر مشتمل تھی) قدیم شہر کے یہودی محلے کی روایتی حدود سے باہر... یعنی عیسائی، آرمینی اور مسلم محلوں میں... ۵۵ جگہوں پر آباد تھے۔

انتہائی دائیں بازو کا لیڈر اور شامیر کا ہاؤسنگ کا وزیر یعنی ایریئل شیرون ۱۹۸۷ء میں مسلم محلے میں ایک اپارٹمنٹ لے کر رہائش پذیر ہوا۔ شیرون کا کہنا ہے کہ ہم نے اپنا ایک ہدف یہ مقرر کیا ہے کہ ہم مشرقی یروشلم کا کوئی بھی محلہ یہودیوں سے پاک نہیں رہنے دیں گے۔ صرف یہی ایک طریقہ ہے جس سے ہم یہ یقینی بنا سکتے ہیں کہ یہ شہر متحدہ اور اسرائیلی حاکمیتِ اعلیٰ کے تحت رہے!

❋ ❋

باب: ۲۴

اسرائیل اور اقوام متحدہ

جب تک اسرائیل اقوامِ متحدہ کے میثاق کی خلاف ورزی اور اس کی قراردادوں کی مخالفت جاری رکھتا ہے، امن کے امکانات معدوم رہیں گے۔ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی اور سیکورٹی کونسل میں جتنی بار اور جس قدر شدید نکتہ چینی اسرائیل کی ہوئی ہے اتنی آج تک کسی اور ملک کی نہیں ہوئی اور نہ ہی کسی اور ملک کا اتنا زیادہ دفاع امریکہ کی جانب سے کیا گیا ہے۔ اقوام متحدہ کے سارے ممبران کی مانند اسرائیل نے بھی اقوامِ متحدہ کے میثاق پر عمل کرنے کا بھرپور پیمان کیا تھا اور کہا تھا کہ وہ ''ہرگز کوئی ایسی پالیسی اختیار نہیں کرے گا... کسی بھی سوال یا مسئلے پر!... جو اسمبلی یا سیکورٹی کونسل کی قراردادوں سے متصادم ہو۔'' اسرائیل نے اپنے کسی بھی عہد کا پاس نہیں کیا۔ اس کے باوجود امریکہ نے رائے شماری میں ہمیشہ اسرائیل کی طرف داری کی ہے۔ بلکہ اس حد تک کہ ۱۹۸۳ء میں امریکہ نے یہ دھمکی بھی دے ڈالی کہ اگر اقوامِ متحدہ کی قرارداد پر عمل درآمد نہ کرنے کی پاداش میں اسرائیل کو خارج کیا گیا تو وہ بھی جنرل اسمبلی سے قطع تعلق کر لے گا۔

فریب ''اقوام متحدہ تو گویا ایک مسجد بن چکی ہے! جہاں سے اسرائیل کی حاکیت اعلیٰ اور بقاء کے خلاف آواز بلند ہو رہی ہے!... اسے کوڑی سمجھا جا رہا ہے!... اسے جائز ہی تسلیم نہیں کیا جا رہا۔ جب کہ اسلام اپنا وہی پرانا اسرائیل کے خاتمے کا ڈھنڈورہ پیٹ رہا ہے!''

(آئی۔ایل۔کینن سابقہ AIPAC کا بانی ۱۹۸۱ء)

حقیقت:

عالمی برادری میں اسرائیل کی تنہائی سیکورٹی کونسل کی ان قراردادوں کی مرہون منت ہے جن میں اس کے کردار پر نکتہ چینی کرتے ہوئے منظور کیا گیا۔ کونسل کے قوانین کے مطابق ایسی تمام قراردادوں کی امریکہ کی کھلے عام حمایت حاصل ہونی چاہیے یا پھر ووٹ دینے سے اجتناب کر کے بالواسطہ حوصلہ افزائی کرنی چاہیے۔ سیکورٹی کونسل کے پانچ مستقل ممبران میں سے ایک ہونے کے ناطے ریاستہائے متحدہ

اس کونسل میں پیش کی گئی کسی بھی قرارداد کو اپنا حق استرداد (VETO) استعمال کر کے نامنظور کر سکتا ہے۔

واشنگٹن کی مستقل حمایت اسرائیل کو حاصل ہے لیکن پھر بھی پچھلے سالوں میں امریکہ نے بلاواسطہ یا بالواسطہ طور پر ۶۹ ایسی قرار دادوں کی حمایت کی ہے جو یہودی ریاست کی نکتہ چینی پر مبنی تھیں۔ یہ ایک ایسی مثال ہے جس کی نظیر ملنی مشکل ہے۔ ان میں نرم طرح کی قراردادیں بھی ہیں جن میں اسرائیل کو صرف کوئی کام کرنے یا باز رہنے کا مشورہ دیا گیا ہے اور سخت تلخ والی بھی ہیں جن میں اس کی سخت مذمت کی گئی ہے اور عمل درآمد کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ (اس باب کے خاتمہ پر فہرست ملاحظہ کریں)۔

اگر امریکہ کی سفارش میسر نہ ہو تو عالمی مذمت کا ریکارڈ اور بھی سیاہ نظر آئے۔ امریکہ نے ۲۹ مرتبہ اپنا حق استرداد استعمال کر کے اسرائیل کو کونسل کی نکتہ چینی سے بچایا ہے۔

جنرل اسمبلی میں جہاں عام طور پر سادہ اکثریت سے قراردادیں منظور کی جاتی ہیں اور کسی ملک کو استرداد کا حق حاصل نہیں ہے وہاں اسرائیل کے خلاف منظور کی جانے والی قراردادیں تعداد میں زیادہ متنوع ہیں۔ اسمبلی نے متعدد بار اسرائیل کے عرب علاقے پر قبضے کی مذمت کی ہے۔ اس کے لبنان پر حملے کی بھی مذمت کی ہے۔ مقبوضہ علاقے میں رہنے والے فلسطینیوں کے انسانی حقوق کی پائمالی اور چوتھی جنیوا کنونشن کی خلاف ورزی، متحدہ یروشلم پر صرف اپنا دارالحکومت ہونے کا دعویٰ، اس کے جنوبی افریقہ سے روابط اور جوہری پروگرام سب پر مذمت کی قراردادیں موجود ہیں۔

اس کے ساتھ ساتھ اسمبلی نے سرکاری طور پر فلسطینیوں کے حقوق تسلیم کیے ہیں۔ اس نے فلسطینیوں کو ایک الگ قوم کے طور پر تسلیم کیا ہے جن کے ناقابل تنسیخ حقوق ہیں۔ ان میں خود ارادیت کا حق، اپنے وطن میں قیام کا حق، وطن واپسی یا مناسب معاوضے کا حق اور اپنے حقوق کے لیے "جو بھی ذرائع انہیں میسر ہوں" استعمال کرنے کا حق شامل ہے۔

فریب "عرب اسرائیل تنازع کے حل کرنے میں یو۔این کے کسی مفید رول ادا کرنے پر ہمیں شک ہے!... (کیونکہ وہ) لگاتار اسرائیل مخالف رویہ رکھتی ہے!" (AIPAC ۱۹۹۲ء)

حقیقت:

عرب اسرائیل تنازع طے کرانے میں اقوام متحدہ کا کردار بنیادی ہے۔ ۱۹۴۷ء میں اقوام متحدہ نے ہی فلسطین کی تقسیم کی سفارش کی تھی اور یہ اقوام متحدہ ہی ہے جو ۱۹۴۸ء اور ۱۹۶۷ء میں گھر بدر ہو جانے والے پناہ گزینوں کی ہمدردی کی بنیاد پر امداد جاری رکھے ہوئے ہیں۔

اقوام متحدہ ہی ایک ایسا ادارہ ہے جہاں پر آپ کو اس تنازع کے بارے میں مکمل اور کھلے عام دستیاب حقائق مل سکتے ہیں۔ اس کے سرکاری پبلک ریکارڈ آفس (Archives) میں آپ کو اس تنازع کے آغاز سے لے کر موجودہ تعطل تک ساری دستاویزات مل جائیں گی۔ اقوام متحدہ ہی وہ ادارہ تھا جس نے ۱۹۴۸ء میں بے گھر ہوجانے والے فلسطینیوں کی اصلی تعداد (۷۲۶۰۰۰) کا سرکاری طور پر تعین کیا تھا اور اسی نے روزانہ کی بنیاد پر اسرائیلی فوجیوں کی ان خلاف ورزیوں کا ریکارڈ رکھا ہے جو وہ مقبوضہ علاقوں میں آباد فلسطینیوں کے انسانی حقوق کی پائمالی کر کے کرتے ہیں۔

واشنگٹن کی ملی بھگت سے ہی اسرائیل اپنی ان کوششوں میں اب تک کامیاب رہا ہے جو وہ اقوام متحدہ کو امن کوششیں کرنے سے باز رکھنے کے لیے کرتا آیا ہے۔ اسرائیل صرف اس لیے اقوام متحدہ کی مخالفت کرتا ہے کہ عالمی ممالک نے متعدد بار یہ واضح کیا ہے کہ وہ اسرائیلی قبضے کے مخالف ہیں۔ ۱۹۸۲ء کی قرارداد نمبر ES-9/1 کے الفاظ میں: ''اسرائیل کی حرکات اور ریکارڈ یہ بات واضح ترین طور پر ثابت کرتا ہے کہ وہ ایک امن پسند ممبر نہیں ہے اور اس نے اپنی میثاقی ذمہ داریاں پوری نہیں کی ہیں۔'' اگر اقوام متحدہ کو اس تنازع کے حتمی فیصلہ کا اختیار دیا جائے تو پھر اسرائیل کو اس کے میثاق اور سیکورٹی کونسل کی مختلف قراردادوں کو ماننا اور اس پر عمل کرنا پڑے گا۔ گویا دوسرے لفظوں میں اسے اپنا قبضہ ختم کرنا ہوگا۔ پناہ گزینوں کو واپس لینا یا مناسب معاوضہ دینا ہوگا اور سارے یروشلم پر اپنے دعویٰ سے دستبردار ہونا ہوگا۔

فریب ''سلامتی کونسل میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ ایک سیاسی مباحثہ یا حل طلب مسئلے کو نمٹانے سے زیادہ ایک ٹھگ کی کارروائی سے زیادہ مشابہت رکھتا ہے!''

(جین کرک پیٹرک، اقوام متحدہ میں امریکی سفیر ۱۹۸۳ء)

حقیقت:

اسرائیل اور اس کے حواریوں کی تمام تر کوششوں کے باوجود اقوام متحدہ جیسی عالمی تنظیم میں اس عرب/اسرائیل تنازع کے بارے میں حیران کن حد تک اتفاق رائے رہا ہے۔ سیکورٹی کونسل میں یہ اور بھی واضح رہا ہے۔ اس کی پہلی اسرائیل مخالف نکتہ چیں قرارداد (۵۹) ۱۹/ اکتوبر ۱۹۴۸ء میں کونسل کی طرف سے متفقہ طور پر منظور کی گئی۔ اس میں اس بات پر تشویش کا اظہار کیا گیا تھا کہ اسرائیل نے اب تک سیکورٹی کونسل یا اس کے قائم مقام مصالحت کنندہ کو اس قتل کی تفتیش کے بارے میں پروگرس رپورٹ

پیش نہیں کی جس میں اقوام متحدہ کا خصوصی نمائندہ کاؤنٹ فوک برناڈوٹ قتل کر دیا گیا تھا۔ دوسری قرارداد (۹۳) ۱۸رمئی ۱۹۵۱ء کو منظور کی گئی جب صفر کے مقابلہ میں دس ووٹ کی اکثریت (ایک رکن یعنی سوویت یونین نے ووٹ نہ ڈالا) سے کونسل نے اسرائیل کو یہ ہدایت کی کہ وہ گیلیلی بالا میں واقع ہیولہ جھیل اور دلدلوں سے پانی کا اخراج بند کر کے ان فلسطینی مہاجرین کو واپس آ کر شام اور اسرائیل کے متحدہ غیر فوجی خطہ میں آباد ہونے کی اجازت دے جنہیں اسرائیلی فوج نے بے دخل کر کے نکال دیا تھا۔

اسرائیل کی اولین براہ راست مذمت ۲۴رنومبر ۱۹۵۳ء کی ہوئی جب کونسل کی قرارداد (۱۰۱) میں اسرائیل کے فلسطینی قبضہ قبیا پر حملے کی شدید ترین مذمت کی گئی۔ اس میں ۶۶ افراد ہلاک اور ۷۵ زخمی ہوئے۔ ان میں غالب تعداد عورتوں اور بچوں کی تھی۔

ان تین پیشگی قراردادوں کے علاوہ مندرجہ ذیل ۶۵ سیکورٹی کونسل قراردادیں بھی اسرائیل پر نکتہ چینی والی ہیں۔ ان سب میں امریکہ کی بالواسطہ حمایت یا تائید شامل تھی:

قرارداد	تاریخ	متن
۱۰۶	۱۹۵۵/۳/۲۹ء	غزہ پر حملہ کے لیے اسرائیل کی مذمت
۱۱۱	۱۹۵۶/۱/۱۹ء	شام پر اسرائیلی حملے کی مذمت۔ ۵۶ افراد ہلاک ہوئے
۱۲۷	۱۹۵۸/۱/۲۲ء	یروشلم میں اسرائیل کے قائم شدہ ممنوعہ خطہ کے خاتمے کی سفارش
۱۶۲	۱۹۶۱/۴/۱۱ء	اسرائیل سے اصرار کہ وہ اقوام متحدہ کے فیصلوں پر عمل کرے
۱۷۱	۱۹۶۲/۴/۹ء	شام پر حملہ کر کے اسرائیل نے کھلم کھلا خلاف ورزی کی ہے
۲۲۸	۱۹۶۶/۱۱/۲۵ء	غربی کنارے پر ساموکی اردنی بستی پر اسرائیلی حملے کی مذمت
۲۳۷	۱۹۶۷/۶/۱۴ء	اسرائیل سے مطالبہ کہ وہ ۱۹۶۷ء میں تازہ بے گھر ہونے والے فلسطینی مہاجرین کو واپس آنے دے
۲۴۸	۱۹۶۸/۳/۲۴ء	اردن کے قصبہ کرامہ پر زبردست اسرائیلی حملہ کی مذمت
۲۵۰	۱۹۶۸/۴/۲۷ء	اسرائیل سے مطالبہ کہ وہ یروشلم میں فوجی پریڈ نہ کرے
۲۵۱	۱۹۶۸/۵/۲ء	قرارداد ۲۵۰ کی خلاف ورزی کرتے ہوئے یروشلم میں فوجی پریڈ کے انعقاد پر گہرے تاسف کا اظہار۔
۲۵۲	۱۹۶۸/۵/۱۲ء	یروشلم کو متحد کر کے اسرائیل کا دارالحکومت بنانے کے اقدام کو

		کالعدم قرار دیا گیا
۲۵۶	۱۹۶۸/۸/۱۶ء	اردن پر اسرائیلی حملوں کی مذمت کرکے انہیں شدید خلاف ورزیاں قرار دیا گیا
۲۵۹	۱۹۶۸/۹/۲۷ء	مقبوضہ علاقوں کے لیے یو۔این۔مشن کو ماننے سے انکار پر تاسف
۲۶۲	۱۹۶۸/۱۲/۱۳ء	بیروت ایئرپورٹ پر اسرائیلی حملہ کی مذمت
۲۶۵	۱۹۶۹/۴/۱ء	اردن میں سالٹ پر حملہ کی مذمت
۲۶۷	۱۹۶۹/۷/۳ء	یروشلم کی حیثیت کو تبدیل کرنے والے انتظامی اقدامات پر اسرائیل کی سرزنش
۲۷۰	۱۹۶۹/۸/۲۶ء	جنوبی لبنانی دیہات پر فضائی بمباری پر اسرائیل کی مذمت
۲۷۱	۱۹۶۹/۹/۱۵ء	یروشلم کے بارے میں یو۔این۔ کی قرارداد پر عمل درآمد نہ کرنے پر اسرائیل کی مذمت
۲۷۹	۱۹۷۰/۵/۱۲ء	لبنان سے اسرائیلی فوج کی واپسی کا مطالبہ
۲۸۰	۱۹۷۰/۵/۱۹ء	لبنان پر اسرائیلی حملوں کی مذمت
۲۸۵	۱۹۷۰/۹/۵ء	لبنان سے فوری اسرائیلی انخلاء کا مطالبہ
۲۹۸	۱۹۷۱/۹/۲۵ء	اسرائیل کے یروشلم کی حیثیت تبدیل کرنے پر افسوس
۳۱۳	۱۹۷۲/۲/۲۸ء	اسرائیل سے یہ مطالبہ کہ وہ لبنان پر حملے بند کرے
۳۱۶	۱۹۷۲/۶/۲۶ء	لبنان پر بار بار حملے کرنے پر اسرائیل کی مذمت
۳۱۷	۱۹۷۲/۷/۲۱ء	لبنان میں اغواء کئے گئے عربوں کو آزاد کرنے سے انکار پر اسرائیل کی مذمت
۳۳۲	۱۹۷۳/۴/۲۱ء	لبنان پر اسرائیل کے مکرر حملوں کی مذمت
۳۳۷	۱۹۷۳/۸/۱۵ء	لبان کی حاکمیتِ اعلیٰ کو روندنے پر اسرائیل کی مذمت
۳۴۷	۱۹۷۳/۴/۲۴ء	لبنان پر اسرائیلی حملوں کی مذمت
۴۲۵	۱۹۷۸/۳/۱۹ء	اسرائیل سے اپنی افواج لبنان سے واپس بلانے پر اصرار
۴۲۷	۱۹۷۸/۵/۳ء	اسرائیل سے اپنی افواج لبنان سے مکمل طور پر واپسی کا اصرار

۴۴۴	۱۹۷۹/۱/۱۹ء	یو۔این کی امن فوج سے اسرائیل کے عدم تعاون پر اظہارِ افسوس
۴۴۶	۱۹۷۹/۳/۲۲ء	اس بات کو طے کرتی ہے کہ اسرائیلی نوآباد بستیاں امن کی راہ میں زبردست رکاوٹ ہیں۔ اسرائیل سے چوتھی جنیوا کنونشن پر عمل کرنے کو کہا گیا
۴۵۰	۱۹۷۹/۶/۱۴ء	اسرائیل سے یہ مطالبہ کہ وہ لبنان پر حملے بند کرے
۴۵۲	۱۹۷۹/۷/۲۰ء	اسرائیل سے یہ مطالبہ کہ وہ مقبوضہ علاقوں میں بستیاں تعمیر کرنے سے باز رہے
۴۶۵	۱۹۸۰/۳/۱ء	اسرائیل کے بستیاں تعمیر کرنے پر افسوس کا اظہار۔ تمام ممبر ممالک سے مطالبہ کہ وہ اسرائیل کی بستیاں تعمیر کرنے کے پروگرام میں مدد نہ کریں
۴۶۷	۱۹۸۰/۴/۲۴ء	لبنان میں اسرائیلی فوجی مداخلت کی پرزور مذمت
۴۶۸	۱۹۸۰/۵/۸ء	اسرائیل سے یہ مطالبہ کہ وہ دو فلسطینی ججوں اور ایک میئر کی ملک بدری کے احکام واپس لے تاکہ وہ واپس جاسکیں۔
۴۶۹	۱۹۸۰/۵/۲۰ء	اسرائیل کی پرزور مذمت کہ وہ کونسل کے حکم کے برخلاف فلسطینیوں کی ملک بدری جاری رکھے ہوئے ہے
۴۷۱	۱۹۸۰/۶/۵ء	اسرائیل کی چوتھی جنیوا کنونشن کی خلاف ورزی پر گہرے تأسف کا اظہار
۴۷۶	۱۹۸۰/۶/۳۰ء	اس بات کا مکرر اعادہ کہ یروشلم پر اسرائیل کے دعویٰ کی قطعاً کوئی حقیقت نہیں۔
۴۷۸	۱۹۸۰/۸/۲۰ء	اپنے بنیادی قانون میں اسرائیل کے یروشلم پر دعویٰ کرنے کی سخت ترین الفاظ میں مذمت
۴۸۴	۱۹۸۰/۱۲/۱۹ء	''اِس بات کا حکم دیتی ہے'' کہ اسرائیل دونوں ملک بدر کیئے گئے فلسطینی میئروں کو واپس لے
۴۸۷	۱۹۸۱/۶/۱۹ء	عراقی جوہری تنصیب پر اسرائیلی حملے شدید مذمت

۴۹۷	۱۹۸۱/۱۲/۱۷ء	یہ فیصلہ کرتی ہے کہ اسرائیل کا شام کی جولان پہاڑیاں ضم کرنے کا فیصلہ کالعدم تصور ہوگا اور یہ مطالبہ کرتی ہے کہ اسرائیل فوراً اپنا یہ فیصلہ منسوخ کرے۔
۴۹۸	۱۹۸۱/۱۲/۱۸ء	اسرائیل سے لبنان خالی کرنے کا مطالبہ
۵۰۱	۱۹۸۲/۲/۱۵ء	اسرائیل سے تقاضا کہ وہ لبنان پر حملے بند کرے اور اپنی افواج واپس بلائے
۵۰۹	۱۹۸۲/۶/۶ء	اسرائیل سے یہ مطالبہ کہ وہ لبنان سے اپنی افواج غیر مشروط طور پر فوری واپس بلوائے
۵۱۵	۱۹۸۲/۷/۲۹ء	اسرائیل سے یہ مطالبہ کہ وہ بیروت کا محاصرہ فوری طور پر ختم کر کے اشیاء خورد و نوش لانے کی اجازت دے
۵۱۷	۱۹۸۲/۸/۴ء	اس بات پر اسرائیل کی مذمت کہ اس نے یو۔این قرار دادوں پر عمل نہیں کیا۔ لبنان سے فوجوں کی واپسی کا مطالبہ
۵۱۸	۱۹۸۲/۸/۱۲ء	اسرائیل سے یہ مطالبہ کہ وہ لبنان میں یو۔این کی فوج سے پورا تعاون کرے
۵۲۰	۱۹۸۲/۹/۱۷ء	مغربی بیروت پر اسرائیلی حملے کی مذمت
۵۷۳	۱۹۸۵/۱۰/۴ء	ٹیونس میں PLO کے صدر دفتر پر اسرائیلی حملے کی شدید مذمت
۵۸۷	۱۹۸۶/۹/۲۳ء	اسرائیل سے کیے گئے سابقہ مطالبات کہ وہ لبنان سے افواج واپس بلائے، کا اعادہ اور تمام فریقین سے انخلاء کا تقاضا
۵۹۲	۱۹۸۶/۱۲/۸ء	بیرضیط یونیورسٹی میں اسرائیلی افواج کے ہاتھوں فلسطینی طلباء کی ہلاکت کی پرزور مذمت
۶۰۵	۱۹۸۷/۱۲/۲۲ء	فلسطینیوں کے انسانی حقوق پائمال کرنے پر اسرائیل کی پالیسیوں اور اعمال کی پرزور مذمت
۶۰۷	۱۹۸۸/۱/۵ء	اسرائیل سے مطالبہ کہ فلسطینیوں کو ملک بدر نہ کرے اور پرزور درخواست کہ وہ چوتھی جنیوا کنونشن پر عمل کرے

۶۰۸	۱۹۸۸/۱/۱۴ء	"گہرے افسوس کا اظہار" کرتی ہے کہ اسرائیل نے اقوامِ متحدہ کی خلاف ورزی کرتے ہوئے فلسطینی شہریوں کو ملک بدر کیا۔
۶۳۶	۱۹۸۹/۷/۶ء	اسرائیل کے فلسطینیوں کو ملک بدر کرنے پر گہرا تأسف
۶۴۱	۱۹۸۹/۸/۳۰ء	اسرائیل کا فلسطینیوں کی ملک بدری جاری رکھنے پر تاسف۔
۶۷۲	۱۹۹۰/۱۰/۱۲ء	حرم الشریف/ٹمپل ماؤنٹ پر فلسطینیوں پر تشدد روا رکھنے پر اسرائیل کی مذمت
۶۷۳	۱۹۹۰/۱۰/۲۴ء	اقوام متحدہ سے تعاون سے انکار کرنے پر اظہار تاسف
۶۸۱	۱۹۹۰/۱۲/۲۰ء	فلسطینیوں کی دوبارہ ملک بدری پر اسرائیل کی مذمت
۶۹۴	۱۹۹۱/۵/۲۴ء	فلسطینیوں کی ملک بدری پر اسرائیل کی مذمت اور مطالبہ کہ وہ بحفاظت اور فوری واپسی کو یقینی بنائے
۷۲۶	۱۹۹۲/۱/۶ء	فلسطینیوں کی ملک بدری کی پرزور مذمت
۷۹۹	۱۹۹۲/۱۲/۱۸ء	۴۱۳ فلسطینیوں کی ملک بدری کی شدید مذمت اور فوری واپسی کا مطالبہ

ان اڑسٹھ (۶۸) قراردادوں میں شمولیت کرنے کا بالواسطہ رضامندی کا اظہار کرنے کے ساتھ ساتھ واشنگٹن نے انتیس (۲۹) الگ الگ مواقع پر اپنا حق استرداد استعمال کر کے سیکورٹی کونسل کو اسرائیل کے خلاف قرارداد منظور کرنے سے باز رکھا۔

مندرجہ ذیل قراردادوں کے خلاف امریکہ نے حق استرداد استعمال کیا:

نمبر شمار	تاریخ	متن
۱	۱۹۷۲/۹/۱۰ء	جنوبی لبنان اور شام پر اسرائیلی حملہ کی مذمت۔ ووٹ... حق میں-۱۳، خلاف-۱... احتراز-۱
۲	۱۹۷۳/۷/۲۶ء	فلسطینیوں کے حقِ خودارادی کی توثیق۔ مساوی تحفظ اور ریاست کا حق منظور۔ ووٹ... حق میں-۱۳، خلاف-۱، چین غیر حاضر۔
۳	۱۹۷۵/۱۲/۸ء	جنوبی لبنان پر اسرائیلی حملے اور فضائی بمباری کی مذمت اور معصوم شہریوں کی ہلاکت پر افسوس۔

		ووٹ... حق میں-۱۳، خلاف-۱، احتراز-۱
۴	۱۹۷۶/۱/۱۶ء	فلسطینیوں کے حق خوداختیاری کا مطالبہ۔ ووٹ... حق میں-۹، خلاف-۱، احتراز-۳
۵	۱۹۷۶/۳/۲۵ء	یروشلم کی حیثیت تبدیل کرنے پر اسرائیل کے خلاف اظہار افسوس۔ دنیا کی بیشتر اقوام اور اقوام متحدہ اسے ایک بین الاقوامی شہر تسلیم کرتی ہیں۔ ووٹ... حق میں-۱۴، خلاف-۱
۶	۱۹۷۶/۶/۲۹ء	فلسطینیوں کے ناقابل تنسیخ حقوق کی توثیق۔ ووٹ... حق میں-۱۰، خلاف-۱، احتراز-۴
۷	۱۹۸۰/۴/۳۰ء	فلسطینی قوم کے حق خوداختیاری کی توثیق۔ ووٹ... حق میں-۱۰، خلاف-۱، احترا-۴
۸	۱۹۸۲/۱/۲۰ء	جولان کی پہاڑیوں سے اسرائیل کی واپسی کا مطالبہ۔ ووٹ... حق میں-۹، خلاف-۱، احتراز-۴
۹	۱۹۸۲/۴/۲ء	مقبوضہ علاقے اور غزہ کی پٹی میں آباد فلسطینیوں سے بدسلوکی پر اسرائیل کی مذمت اور مہذب اقوام کی طرح جنیوا کنونشن کے میثاق کی پابندی نہ کرنے پر افسوس۔ ووٹ... حق میں-۱۴، خلاف-۱
۱۰	۱۹۸۲/۴/۲۰ء	اس اسرائیلی سپاہی کی مذمت جس نے القدس مسجد کے قریب حرم الشریف/ٹمپل ماؤنٹ میں گیارہ مسلمان عبادت گزاروں کو گولی مار کر ہلاک کر دیا تھا۔ ووٹ... حق میں-۱۴، خلاف-۱
۱۱	۱۹۸۲/۶/۸ء	اگر اسرائیل لبنان سے انخلاء نہ کرے تو اس کے خلاف پابندیوں کا مطالبہ۔ ووٹ... حق میں-۱۴، خلاف-۱
۱۲	۱۹۸۲/۶/۲۶ء	اگر اسرائیل بیروت پر حملہ ختم نہ کرے تو اس پر پابندیوں کا مطالبہ ووٹ... حق میں-۱۴، خلاف-۱
۱۳	۱۹۸۲/۸/۶ء	اسرائیل لبنان پر قبضہ ختم نہ کرے تو اس کی اقتصادی امداد منقطع امداد منقطع کر دینے کا مطالبہ۔

		ووٹ... حق میں-۱۱، خلاف-۱، احتراز-۳
۱۴	۱۹۸۳/۸/۲ء	مقبوضہ مغربی کنارے اور غزہ کی پٹی میں اسرائیلی بستیوں کے قیام پر مذمت کہ یہ امن کی راہ میں رکاوٹ ہیں۔
		ووٹ... حق میں-۱۳، خلاف-۱، احتراز-۱
۱۵	۱۹۸۴/۸/۶ء	لبنان میں عرب آبادی کے بہیمانہ قتل عام پر اسرائیل کی مذمت اور اس سے انخلاء کا مطالبہ۔ ووٹ... حق میں-۱۴، خلاف-۱
۱۶	۱۹۸۵/۳/۱۲ء	جنوبی لبنان میں اسرائیلی تشدد اور ''آہنی پنجے'' والی پر تشدد پالیسی کی مذمت۔ ووٹ... حق میں-۱۱، خلاف-۱، احتراز-۳
۱۷	۱۹۸۵/۹/۱۳ء	مقبوضہ علاقوں میں انسانی حقوق کی پائمالی پر اسرائیل کی مذمت
		ووٹ... حق میں-۱۰، خلاف-۱، احتراز-۴
۱۸	۱۹۸۶/۱/۱۷ء	جنوبی لبنان میں اسرائیلی مظالم کی مذمت۔
		ووٹ... حق میں-۱۰، خلاف-۱، احتراز-۳
۱۹	۱۹۸۶/۱/۳۰ء	مقبوضہ مشرقی یروشلم میں اسرائیلی کارروائیوں کی مذمت جس میں مسلمانوں کے مقاماتِ مقدسہ کو خطرہ اور توہین لاحق تھی۔
		ووٹ... حق میں-۱۳، خلاف-۱، احتراز-۱
۲۰	۱۹۸۶/۲/۶ء	۴/فروری کو لیبیا کے ایک مسافر ہوائی جہاز کے اغوا کی مذمت۔
		ووٹ... حق میں-۱۰، خلاف-۱، احتراز-۱
۲۱	۱۹۸۸/۱/۱۸ء	لبنان پر اسرائیلی حملہ کی مذمت اور لبنانی شہری آبادیوں کے خلاف کارروائی پر افسوس۔
		ووٹ... حق میں-۱۳، خلاف-۱، احتراز-۱
۲۲	۱۹۸۸/۲/۱ء	اسرائیل سے فلسطینی انتفادہ سے نمٹنے کے لیے ان کارروائیوں سے احتراز کرنے کا مطالبہ جس سے مقبوضہ علاقے کے فلسطینیوں کے انسانی حقوق کی خلاف ورزی ہوتی ہو۔ اسرائیل سے چوتھی جنیوا کنونشن کی پابندی کا مطالبہ او یہ تقاضا کہ آئندہ امن مذاکرات

		میں اقوام متحدہ کو ایک اہم رول دیا جائے۔ ووٹ... حق میں-۱۴، خلاف-۱
۲۳	۱۹۸۸/۴/۱۵ء	اسرائیل سے ملک بدر کئے گئے فلسطینیوں کو واپس لینے پر اصرار، شہریوں پر گولی چلانے کی مذمت اور مطالبہ کہ وہ چوتھی جنیوا کنونشن کی پابندی کرے اور اقوام متحدہ کی نگرانی میں امن معاہدہ طے کرے۔ ووٹ... حق میں-۱۴، خلاف-۱
۲۴	۱۹۸۸/۵/۱۰ء	۲رمئی کو لبنان میں اسرائیلی دراندازی کی مذمت۔ ووٹ... حق میں-۱۴، خلاف-۱
۲۵	۱۹۸۸/۱۲/۱۴ء	۹رتمبر کو لبنان پر اسرائیلی کمانڈو حملوں کی مذمت۔ ووٹ... حق میں-۱۴، خلاف-۱
۲۶	۱۹۸۹/۲/۱۷ء	فلسطینی انتفادہ کو دبانے کی اسرائیلی کوششوں کی مذمت اور اسرائیل سے یہ مطالبہ کہ وہ فلسطینیوں کے انسانی حقوق کا احترام کرے۔ ووٹ... حق میں-۱۴، خلاف-۱
۲۷	۱۹۸۹/۶/۹ء	فلسطینیوں کے انسانی حقوق کی خلاف ورزی پر مذمت۔ ووٹ... حق میں-۱۴، خلاف-۱
۲۸	۱۹۸۹/۱۱/۷ء	یہ مطالبہ کہ ٹیکس کے خلاف احتجاج پر جن فلسطینیوں کی جائیداد ضبط کی گئی ہے وہ واگزار کی جائے۔ انتفادہ کو دبانے کے لیے اسرائیل جو ہتھکنڈے استعمال کر رہا ہے اس کے بارے میں اقوام متحدہ کے ''تلاش حقیقت مشن'' کو مشاہدہ کرنے کی اجازت دی جائے۔ ووٹ... حق میں-۱۴، خلاف-۱
۲۹	۱۹۹۰/۵/۳۱ء	اسرائیلی مقبوضہ علاقوں میں فلسطینیوں کے خلاف مظالم کی تحقیقات کے لیے ایک مشن کے قیام کا مطالبہ۔ ووٹ... حق میں-۱۴، خلاف-۱

❄ ❄

باب: ۲۵

اسرائیل اور قیام امن

سابقہ سکریٹری آف اسٹیٹ جیمز بیکر یہ کہنے کا بڑا مشتاق تھا کہ مشرق وسطیٰ میں امن تب ہی قائم ہوگا جب تنازعے کے سبھی فریقین یہ چاہیں گے۔ لیکن اسرائیل کا ریکارڈ برابر یہ ثابت کرتا ہے کہ اسے علاقہ امن سے زیادہ پسند ہے جیسا کہ اسرائیل کے پہلے وزیراعظم ڈیوڈ بن گوریان نے ۱۹۴۹ء میں اپنی ڈائری میں رقم کیا کہ ''امن بے حد اہم ہے!... لیکن کسی بھی قیمت پر نہیں!'' تب سے یہ ہر اسرائیلی لیڈر کا راہنما اصول رہا ہے۔

حالانکہ اسرائیل کو ان برسوں میں کئی مرتبہ نیک نیتی کے ساتھ امن کا پلان پیش کیا گیا لیکن اس نے ہر مرتبہ اسے نامنظور کر کے اس بات کو ترجیح دی کہ وہ جبریہ چھینے گئے علاقے پر قبضہ برقرار رکھے۔ وہ ۱۹۴۸ء میں بے گھر کئے گئے فلسطینیوں کو واپس لینے سے انکاری ہے۔ ۱۹۶۷ء کی جنگ کے بعد بھی کئی علاقہ برائے امن کی تجاویز کو رد کیا۔ اس طرح وہ شام، مصر اور لبنان سے چھینے گئے علاقے بھی اپنے قبضے میں رکھنے پر اصرار کر رہا ہے... جب کہ سترہ لاکھ فلسطینی پہلے ہی اس کے فوجی اقتدار میں رہ رہے ہیں۔ پچھلی تقریباً نصف صدی میں اسرائیل نے صرف مصر کے ساتھ امن قائم کرنا گوارا کیا۔ گویا اس طرح یہودی ریاست کے ہمسایہ میں واقع طاقتور ترین عرب قوم کی جنگی صلاحیت کو زائل کیا۔

فریب ''اسرائیل امن چاہتا ہے۔ ہم ہر قوم سے زیادہ اسے چاہتے ہیں۔''

(مناخم بیگن، اسرائیل وزیراعظم ۱۹۷۹ء)

حقیقت:

ہنری کسنجر جیسے اسرائیل دوست نے بھی اس علاقے پر امن کو ترجیح نہ دینے کی خواہش رکھنے کو تسلیم کیا ہے۔ ۱۹۹۲ء میں اس سابقہ سکریٹری آف اسٹیٹ نے لکھا: ''اسرائیل نے تاخیری حربوں کو اختیار کرنا بہترین حکمت عملی جانا... امن کے عمل کو رفتار خود اس بات کا ثبوت ہے۔ ۱۹۴۸ء میں

اسرائیل کے عرب ہمسایوں نے یہودی ریاست تسلیم کرنے پر جنگ کو ترجیح دی۔ ۵۰ اور ۶۰ کی دہائی کے عشروں میں ان میں سے کچھ نے ۴۷ء والی سرحدوں کو تسلیم کرنے کا عندیہ دیا لیکن ان سرحدوں کو نہیں جو اس وقت قائم تھیں۔ مثال کے طور پر ۱۹۵۴ء میں مصر کے صدر جمال عبدالناصر نے مطالبہ کیا کہ اسرائیل اقوام متحدہ کی ۱۹۴۷ء والی تقسیم فلسطین کی سرحدوں پر واپس لوٹ جائے۔ یعنی اس وقت کے موجود اسرائیل کو اپنے رقبہ کے ۴۰ فیصد پر جانا ہوتا اور یروشلم کو عرب علاقے سے گھرا ہوا ایک بین الاقوامی شہر قرار دیا جاتا۔ اسی طرح انتھونی ایڈن نے بھی اپنی اور امریکہ کی جانب سے اس وقت کی موجود سرحدوں اور ۱۹۴۷ء کی سرحدوں کے مابین مفاہمت کرنے کی سفارش کی۔ (جنہیں اب ہم ۶۷ء کی سرحدیں کہتے ہیں)۔ ۷۰ اور ۸۰ کے عشروں میں ماسواء پی۔ ایل۔ او کے کئی اعتدال پسند عرب حکومتوں اور امریکہ نے ۶۷ کی سرحدوں کو قبول کرلیا لیکن موجودہ سرحدوں پر پھر بھی تشویش کا اظہار کیا۔ ان لگاتار بہتر ہوتی ہوئی پیش کشوں کے مدنظر اسرائیل کا تاخیری حربوں سے فائدہ تو ہوسکتا ہے نقصان ہرگز نہیں!"

سابقہ اسرائیلی وزیر دفاع ابا ایبان نے بھی ایک مرتبہ یہ اعتراف کیا تھا کہ ۱۹۷۳ء کی جنگ سے پیشتر اسرائیل کی امن پر علاقے کو ترجیح خصوصی طور پر عیاں تھی: "میں خدالگتی کہوں گا۔ اسرائیلی سفارت کاری کا زوال لیبر حکومت کے عہد میں شروع ہوا نہ کہ لیکڈ حکومت کے عہد میں... یہ حقیقت ہے کہ لیبر کی سرکاری پالیسی تو یہ تھی کہ یہ علاقے امن بحال ہونے تک ہمارے ہاتھ میں عارضی سودا کرنے کے پتے ہیں۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ (موشے) دایان کا کہنا تھا کہ شرم الشیخ امن سے بھی زیادہ اہم ہے اور مغربی کنارہ اس سے بھی زیادہ۔"

"جس کسی نے بھی 'یوم کپور جنگ' کے ماقبل برسوں میں ہمارا مشاہدہ کیا ہے اسے یہ تاثر ملا ہوگا کہ ہم امن میں کوئی خاص دلچسپی نہیں رکھتے۔ ہم بحیثیت قوم اس بارے میں مطمئن تھے۔ ہمیں یوں معلوم ہوتا تھا کہ ترپ کے پتے ہمارے ہاتھ میں ہیں اور ہم اس پر بے حد خوش تھے۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا ہم ان پتوں کے شیدائی بن گئے۔ حتیٰ کہ ہم ان کو کھیلنا ہی نہیں چاہتے تھے۔"

فریب "ہم اپنے ہمسایوں کے ساتھ امن پر بات چیت کرنے کے لیے تیار ہیں۔ کسی بھی دن اور تمام امور پر!"

(گولڈا مائیر اسرائیلی وزیر اعظم ۱۹۷۵ء)

حقیقت:

اسرائیلی لیڈروں نے ہر امریکی صدر کو یہ یقین دہانی کرائی ہے کہ اسرائیل امن چاہتا ہے۔ لیکن جب ریاستہائے متحدہ نے امن فارمولا تلاش کرنا چاہا تو اس کے صدور پر کئی دہائیوں تک یہی انکشاف ہوتا رہا کہ اسرائیلی ترجیحات قدرے مختلف ہیں۔

صدر ہیری ٹرومین وہ پہلا صدر تھا جسے امن اور علاقے کے بارے میں اسرائیل کی اصل نیت کا ادراک ہوتا تھا۔[1] ۱۹۴۹ء میں سوئزرلینڈ کے مقام لوزان میں منعقدہ امن بات چیت کے دوران ٹرومین کو اس بات پر تشویش لاحق ہوئی کہ اسرائیل علاقے پر ''زائد از ضرورت'' دعویٰ پیش کر رہا ہے۔ اس نے اسرائیل کو ریاستہائے متحدہ کی جانب سے انتباہ کیا کہ وہ علاقے کے متعلق معاملہ طے کرنے کے بارے میں اسرائیل کے رویہ سے بے حد غیر مطمئن ہے۔ انہیں فلسطینی پناہ گزینوں کے بارے میں بھی تشویش ہے... امریکی حکومت کو اس بارے میں بے حد تشویش ہے کہ اسرائیل کہیں فلسطین کے مسئلے کے مناسب حل کے بارے میں کوئی ایسی رکاوٹ کھڑی نہ کر دے جس سے اسرائیل اور اس کے ہمسایوں کے مابین دوستانہ تعلقات کا قیام ناممکن ہو جائے۔ حکومتِ اسرائیل کو اس بارے میں ذرّہ بھر بھی شک نہ ہونا چاہیے کہ امریکی حکومت اس سے فلسطینی مہاجرین کے بارے میں مثبت اور ذمہ دارانہ رویہ کی توقع رکھتی ہے اور یہ بھی کہ اسرائیل کے فلسطین کے اندر مزید علاقے پر دعویٰ کی حمایت تو کجا۔ امریکی حکومت تو اس سے یہ توقع رکھتی ہے کہ اگر انہیں کسی مزید علاقے پر دعویٰ ہے تو وہ اقوام متحدہ کی تقسیم فلسطین والی سرحدوں میں سے کچھ اسرائیلی علاقہ اس کے بدلے میں دینے پر رضامند ہوں گے۔''

صدر آئیزن ہاور کو بھی ایسے ہی ضدی اسرائیلی رویے کا سامنا رہا۔ ۱۹۵۶ء کے شروع میں صدر نے ایک خفیہ ایلچی مشرق وسطیٰ روانہ کیا تاکہ وہ مصر اور اسرائیل کے مابین امن کی حوصلہ افزائی کر سکے۔ اس وقت صدر آئیزن ہاور پر یہ کھلا کہ ''اسرائیلی حکام... اپنے اس رویہ پر نہایت درشتی سے ڈٹے ہوئے ہیں کہ وہ امن کے حصول کے لیے قطعاً کسی طرح کی رعایتیں دینے کے روادار نہیں!''

آئیزن ہاور نے اپنی ڈائری میں اپنے دو نوجوان اسرائیلی مہمانوں کے پرغرور رویے کے

---

[1] یاد رہے کہ یہی وہ پہلا یہودی امریکی صدر ہے جس نے فوراً اسرائیل کو تسلیم کرنے کے احکامات اپنے اقوام متحدہ کے نمائندے کو دیے تھے... (مترجم)

بارے میں اندراج کیا ہے کہ ''اِن دونوں نے ہر ممکن طریقے سے عربوں کی تحقیر کی۔ ان کا شیخی بھرا دعویٰ تھا کہ اسرائیل کو چند دفاعی ہتھیاروں کے علاوہ مزید کچھ درکار نہ تھا۔ وہ بعد ازاں ابد تک اپنا خیال آپ رکھ سکتے ہیں۔ انہیں امریکہ سے کسی بھی قسم کی مدد درکار نہ ہوگی۔ میں نے انہیں بتلایا کہ وہ غلطی پر ہیں اور یہ کہ میں نے بہت سے عرب لیڈروں سے بات کی ہے اور مجھے پورا یقین ہے کہ وہ ایک بھڑوں کے چھتے کو چھیڑ رہے ہیں۔ اگر وہ اپنا ابتدائی مسئلہ بغیر عربوں کی عزت نفس پر ضروری حملہ کیے اور پرامن طریقہ سے حل کر سکیں تو یہ ان کے مستقبل بعید کے مفاد کے حق میں بے حد مفید ہوگا!''

آئیزن ہاور انتظامیہ کو اسرائیل کے اس ہٹ دھرمی والے رویہ پر اتنی تشویش تھی کہ اس نے اسرائیل کو اعلانیہ متنبہ کیا کہ ''اپنا فاتح ہونے کا رویہ ترک کر دیں اور اس گھمنڈ میں نہ رہیں کہ طاقت اور انتقامی ہلاکتیں ہی ان کے ہمسایوں کو سیدھا رکھیں گی۔ اب آپ کو اپنے اعمال ان اقوال کے ہم آہنگ کرنے ہوں گے جو آپ حصول امن کی خواہش کے لیے کہتے رہے ہیں۔''

صدر جان کنیڈی اور لنڈن جانسن نے تلاش امن کی کوئی خاص کوشش نہ کی۔ صدر جانسن تو بے حد اسرائیل نواز تھے۔ لہٰذا ان کا اسرائیل سے کوئی خاص تنازع ہوا ہی نہیں۔

صدر نکسن نے ۱۹۷۳ء کے اوائل میں قومی سلامتی کے مشیر ہنری کسنجر کو ایک شکایتی نوٹ میں لکھا: ''ساری دنیا میں اب صرف ہم ہی اسرائیل کے دوست رہ گئے ہیں۔ مجھے ابھی تک ان کی طرف سے ذرّہ بھر رعایت دیا جانا دیکھنا نصیب نہیں ہوا... گو ہم یہ بھی مانتے ہیں کہ اردن اور مصر نے بھی اپنی طرف سے کوئی معقول رعایت نہیں دی... وقت آگیا ہے کہ ہم اسرائیل کے غیر مفاہمانہ رویے کے آگے جھکنا ترک کر دیں! ماضی میں ہمارے رویے نے اغلباً انہیں یہ باور کرا دیا ہے کہ وہ چاہے کتنے ہی غیر معقول رویے کا مظاہرہ کریں ہم ان کے ساتھ ہیں۔''

ایک اور مرحلے پر صدر نکسن نے سوویت یونین کے اشتراک سے اس خطے میں امن نافذ کرنے کا مشورہ دیا۔ بقول کسنجر کے جو اس وقت سکریٹری آف اسٹیٹ بن چکا تھا، نکسن نے اسے ۱۹۷۳ء کی جنگ کے دوران ماسکو میں یہ پیغام بھجوایا تھا۔ کسنجر نے اپنی یادداشتوں میں اس پیغام کو جزوی طور پر درج کیا ہے۔ بقول اس کے نکسن نے یہ تجویز دی ''یہ اسرائیل کے بہترین مفاد میں ہوگا کہ ہم اس وقت ایک ایسے منصفانہ حل کی منظوری کے لیے مقدور بھر دباؤ ڈالیں جو سوویت روس بھی عربوں پر تھوپ سکے۔'' پھر نکسن نے ان رکاوٹوں کی فہرست درج کی تھی جو سمجھوتہ کی راہ میں اب تک حائل

تھیں۔ اسرائیل کی انتہاپسندی، عربوں کا حقیقت پسندانہ سودے بازی سے انکار اور کئی دوسرے مسائل کے بارے میں ہماری اپنی مصروفیات۔ نکسن کا کہنا تھا: ''میں یہ تمہارے علم میں لانا چاہتا ہوں کہ داخلی سیاسی نتائج کے علی الرغم میں اسرائیل پر مطلوبہ حد تک دباؤ ڈالنے پر تیار ہوں۔''

صدر جیرالڈ فورڈ اسرائیل کے دوسرے سینائی معاہدہ کے لیے رعایتیں دینے سے انکار پر اتنا چیں بر جبیں ہوا کہ میں اس نے ۲۱ مارچ ۱۹۷۵ء کو وزیر اعظم یتزاق رابین کو ایک تند و ترش خط ارسال کیا ''مجھے یہ جان کر بے حد مایوسی ہوئی ہے کہ اسرائیل نے وہ نہیں کیا جو اسے کرنا چاہیے تھا۔'' فورڈ کا مزید کہنا تھا: ''اگر اسرائیل نے مزید لچک پیدا نہ کی تو امریکہ کو اپنے مشرقِ وسطیٰ کے رویہ پر نظر ثانی کرنا پڑے گی۔ جس میں اسرائیل کے بارے میں ہماری پالیسی بھی شامل ہوگی۔''

یہ دھمکی الٹی پڑ گئی۔ رابن حکومت مزید انتہا پسند بن گئی اور گفت و شنید دوسرے ہی دن منقطع ہوگئی۔ فورڈ نے یہ شکایت کی کہ گو اسرائیل ریاستہائے متحدہ کی حمایت اور امداد سے ہی اپنے تمام عرب ہمسایوں سے مجموعی طور پر زیادہ طاقتور ہوا ہے اور ہمیں یہ توقع تھی کہ وہ زیادہ لچکدار رویہ اپنائے گا۔ لیکن وہ اور زیادہ انتہا پسند اور ہٹ دھرم ہوگیا ہے اور امن اب بھی اتنا ہی دور ہے جتنا پہلے کبھی تھا!

صدر جمی کارٹر کو ۱۹۷۹ء کا مصر/ اسرائیل، امن سمجھوتہ کرانے کے لیے اسرائیل کی جانب سے بے پناہ مزاحمت کا سامنا رہا۔ اس نے اپنی ڈائری میں لکھا ہے کہ ''اسرائیلی وزیر اعظم مناخم بیگن غربی کنارے کے کسی بھی حصہ سے فوجی یا سیاسی طور پر دست بردار ہونے پر تیار نہیں تھا۔ وہ موجودہ بستیوں کی توسیع اور نئی بستیاں بسانے کے عمل کو روکنے پر تیار نہ تھا۔ وہ نہ تو یہودی آبادکاروں کو سینائی سے نکالنے پر راضی تھا اور نہ ہی ان کو اقوام متحدہ یا مصر کی زیر حفاظت چھوڑنے پر راضی! وہ یہ بھی ماننے پر تیار نہ تھا کہ قرارداد ۲۴۲ غزہ، مغربی کنارے کے بارے میں تھی۔ وہ فلسطینی عربوں کو حقیقی اقتدار دینے پر بھی تیار نہ تھا اور ان کو اپنے مستقبل کے بارے میں فیصلہ کرنے کا اختیار بھی نہیں دینا چاہتا تھا۔''

ایک اور جگہ کارٹر لکھتا ہے: ''جب بھی ہمیں عربوں کے ساتھ ذرا سی کامیابی نصیب ہوتی تو بیگن تازہ بستیاں آباد کرنے یا کوئی اشتعال انگیز اعلان کر دیتا۔ ایسا برتاؤ... امن کے قیام کو حتی الوسع خطرے میں ڈال دیتا۔''

صدر ریگن سب سے زیادہ اسرائیلی نواز صدر ہونے کے باوصف اسرائیل کے ساتھ کئی شدید جھڑپوں میں ملوث ہوا۔ ستمبر ۱۹۸۲ء میں اسرائیلی وزیر اعظم یتزاق شامیر کو جب ایک بین الاقوامی

امن کانفرنس کی تجویز پیش کی گئی تو اس نے اس کو ''ایک گمراہ کن مجرمانہ خیال'' کہا اور یہ بھی کہا کہ ہم مکمل طور پر اس خیال کو رد کرتے ہیں!

یکم جولائی ۱۹۹۱ء کو صدر جارج بش نے اعلانیہ کہا کہ اسرائیلی بستیاں نہایت غیر سودمند تھیں اور اسرائیل کے حق میں بہترین یہ ہوگا کہ وہ اپنے وعدوں کا پاس کرے... نہ کہ مزید بستیاں قائم کرتا چلا جائے! اگلے ہی روز اسرائیلی کابینہ نے غربی کنارے میں دو مزید بستیوں کا افتتاح کیا۔ جب صدر بش کے سکریٹری آف اسٹیٹ جیمز بیکر نے ۱۹۹۱ء کے وسط میں بین الاقوامی امن کانفرنس کی تجویز پیش کی تو وزیر اعظم شامیر نے ٹیلیفون پر اسے نامنظور کرتے ہوئے کہا: ''دنیا کی اقوام میں آپ کو ایسے لوگ کہاں ملیں گے جو اپنے وطن کا علاقہ چھوڑ دینے پر تیار ہوں!''

(لیکن فلسطینیوں کے بارے میں وہ ایسا نہیں سوچتے!... (مترجم)

فریب ''ہر اسرائیلی حکومت نے... ایک ہمہ گیر سمجھوتے کی حمایت کی ہے اور اپنی اس خواہش کا اظہار کیا ہے کہ وہ ہمسایہ عرب ریاستوں کے لیڈروں کے ساتھ متفقہ طور پر یا جدا جدا امن بات چیت کے لیے تیار ہے!'' (AIPAC ۱۹۸۹ء)

حقیقت:

اسرائیل نے مصر کے ساتھ باہمی معاہدہ کے علاوہ عربوں یا امریکہ کی پیش کردہ ہر امن پلان کو ہمیشہ ٹھکرایا ہے۔ (مصر، اسرائیلی معاہدے کا مزید ذکر آگے آئے گا)

ذیل میں چیدہ چیدہ امن تجاویز اور ان کے بارے میں اسرائیل کا ردعمل درج ہے:

۱۹۶۷-۷۱ء کا یو۔ این۔ جارنگ مشن

سویڈن کے ایک سفارتکار گنار جارنگ کو سلامتی کونسل کی قرارداد نمبر ۲۴۲ کے ماتحت مشرق وسطیٰ میں یو۔ این کا خصوصی مصالحت کنندہ چنا گیا تھا۔ یہ اس کی ذمہ داری تھی کہ وہ (مشرق وسطیٰ) کی تمام متعلقہ ریاستوں سے رابطہ قائم کرے تاکہ امن کی کوششیں آگے بڑھیں اور اس قرار دادا کے مطابق فریقین کسی متفقہ سمجھوتے پر پہنچیں۔ سارے ۱۹۶۸ء کے دوران اسے کوئی کامیابی نہ ہوئی۔ آخر کار ایک حتمی کوشش ۱۹۷۱ء میں کرتے ہوئے اس نے اسرائیل سے یہ مطالبہ کیا کہ وہ کم از کم قرار داد نمبر ۲۴۲ کی حمایت کا اظہار تو کرے جس میں اس سے مطالبہ کیا گیا تھا کہ وہ ۱۹۶۷ء میں قبضہ میں لیا گیا

عرب علاقہ واپس کردے۔

اسرائیل کا جواب تھا: ''اسرائیل ۵؍جون ۱۹۶۷ء سے پیشتر والی سرحدوں پر واپس نہیں جائے گا!'' اس کے ساتھ ہی جارنگ مشن ''تمت بالخیر'' کی منزل پر پہنچا اور اقوام متحدہ نے قرارداد نمبر ۲۴۲ کو عملی جامہ پہنانے کے لیے مزید کوئی قدم نہ اٹھایا۔

۱۹۶۹ء کی راجرز پلان

۹؍دسمبر کو سکریٹری آف اسٹیٹ ولیم پی۔ راجرز نے ایک پلان پیش کیا جس کا مقصد قرارداد نمبر ۲۴۲ کو عملی جامہ پہنانا تھا۔ اس پلان میں اسرائیل کا ۱۹۶۷ء کی جنگ میں قبضہ کیا گیا عرب علاقہ خالی کرنا اور عربوں کی جانب سے اسرائیل کو تسلیم کرنا اور مستقل قیام امن کا اعلان کرنے کے علاوہ فلسطینی پناہ گزینوں کے لیے ایک منصفانہ سمجھوتے کا معاملہ شامل تھا۔ اتنی نرم تجویز نے بھی اسرائیلی کابینہ کو ایک ہنگامی اجلاس پر مجبور کردیا۔ جب یہ اجلاس ۱۱؍دسمبر کو علی الصباح ختم ہوا تو کابینہ کی طرف سے جاری شدہ اعلامیہ میں اسے مکمل طور پر رد کردیا گیا تھا۔

۱۹۷۷ء کی ہمہ گیر کارٹر پلان

صدارت سنبھالنے کے تقریباً پانچ ماہ بعد جمی کارٹر نے ایک ہمہ گیر امن کے لیے اپنے خیالات پیش کیے۔ ۲۷؍جون کو اس کی انتظامیہ نے ایک دستاویز جاری کی جس میں اقوام متحدہ کی قرارداد نمبر ۲۴۲ کی بنیاد پر اس ہمہ گیر امن کے حصول کے لیے تجاویز کا ذکر تھا۔ اس میں درج تھا کہ ''ہمارے خیال میں اس قرارداد کے تحت (اسرائیل کو) تینوں محاذوں پر پیچھے ہٹنا ہوگا۔ یعنی سینائی، جولان اور غربی کنارہ غزہ... کوئی بھی علاقہ بشمول غربی کنارہ کے، اس گفت وشنید میں سے خارج نہیں کیا جاسکتا۔'' اس میں مزید درج تھا کہ فلسطینیوں کو بھی ایک وطن کی ضرورت ہے۔

کارٹر کے ساتھ ایک ملاقات کے دوران اسرائیلی وزیر اعظم مناخم بیگن نے اعلان کیا کہ اسرائیل کبھی بھی جوڈیہ اور سماریہ پر خارجی حکمت عملی برداشت نہیں کرے گا۔ اس نے قرارداد نمبر ۲۴۲ کے ان معروف معنوں کو بھی تسلیم کرنے سے انکار کردیا جس کا مطلب تینوں محاذوں پر پسپائی تھا۔ اس کا اصرار تھا کہ اس کا مطلب صرف کچھ محاذوں پر پیچھے ہٹنے سے ہے۔ کارٹر نے اس پر بھی بیگن کو ایک

بڑی رعایت پیش کی۔ اس نے بیگن کی وہ درخواست مان لی کہ وہ اعلانیہ طور پر یہ فقرہ یعنی ''پسپائی مع معمولی رد و بدل کے'' استعمال نہیں کرے گا۔ اس کا خیال تھا کہ اس طرح کے فقروں کا استعمال واشنگٹن کی مساعی امن کی کوششوں کا مستقبل تاریک کرسکتا ہے۔ کارٹر یہ تسلیم کرتا تھا کہ ''پسپائی مع معمولی رد و بدل کے'' ایک روایتی امریکی پالیسی تھی!

کارٹر کو اس بات پر بھی بڑی مایوسی ہوئی کہ مصری صدر انور سادات کے ۱۹۷۷ء کے دورۂ یروشلم جیسے فیاضانہ عمل پر بیگن کی طرف سے کسی مناسب ردعمل کا اظہار نہ ہوا۔ سال بھر کے تعطل کے بعد کارٹر، سادات اور بیگن پھر کیمپ ڈیوڈ پر تیرہ روز کے لیے اکٹھے ہوئے تاکہ امن کا کوئی فارمولا تلاش کرسکیں۔ جب ۱۷ر ستمبر ۱۹۷۸ء کو ان کی بات چیت اختتام کو پہنچی تو کارٹر کا ہمہ گیر سمجھوتے کا خواب بکھر چکا تھا۔ فلسطینیوں کو خودمختاری کی ایک جعلی آفر پر ٹرخا دیا گیا تھا۔ یروشلم کا ذکر ہی مفقود تھا اور انور سادات کو صرف مصری علاقہ ہی واپس ملا۔ یہ ایک مکمل طور پر دوطرفہ سمجھوتہ تھا۔ اغلباً جب سے مصر نے ۱۹۶۷ء میں سینائی کھویا تھا اس کو اس سے زیادہ کچھ مل بھی نہ سکتا تھا!

اسرائیل نے آخرکار ۱۹۷۹ء میں مصر کے ساتھ امن سمجھوتہ کو تسلیم کرلیا لیکن اس وقت جب مصر اور امریکہ دونوں نے فلسطینیوں کو نظرانداز کرنا مان لیا! اس کے علاوہ امریکہ نے اسرائیل کو اس کی معمول کی سالانہ دو ارب ڈالر امداد کے علاوہ مزید تین ارب ڈالر دینا منظور کیا اور اسرائیلی افواج کے ہتھیاروں کو زیادہ ترقی یافتہ بنانے کے لیے کافی تعداد میں فوجی ساز و سامان مہیا کرنے کا وعدہ کیا۔ اس میں F-16 جنگی ہوائی جہازوں کی بسرعت ترسیل بھی شامل تھی جو اس وقت امریکہ کے ہوائی بیڑے کا تازہ ترین ہتھیار تھے۔

۱۹۸۱ء کا شہزادہ فہد امن پلان

۸ر اگست کو سعودی عرب کے ولی عہد شہزادہ فہد بن عبدالعزیز نے ایک پلان پیش کیا جس میں خصوصی طور پر ''اس خطے میں سب ریاستوں کے امن سے رہنے کے حق'' کو تسلیم کیا گیا تھا۔ فہد پلان میں اسرائیل سے یہ مطالبہ کیا گیا تھا کہ وہ ۱۹۶۷ء میں قبضہ کئے گئے تمام عرب علاقوں کو خالی کردے، جس میں عرب مشرقی یروشلم بھی شامل تھا۔ ۱۹۶۷ء سے اس مقبوضہ علاقے میں جتنی نوآبادیاں بسائی گئی ہیں وہ ہٹالی جائیں اور ایک فلسطینی آزاد ریاست قائم کی جائے جس کا دارالحکومت مشرقی یروشلم ہو۔

اسرائیل نے فوراً ہی یہ تجویز مسترد کر دی۔ وزیر خارجہ یزاق شامیر کے بقول یہ ایک ''زہریلا خنجر تھا جو اسرائیل کے دل میں بھونک دیا گیا تھا۔'' اسرائیل نے اعلان کیا کہ وہ اس پلان کا جواب مقبوضہ علاقے میں مزید بستیاں تعمیر کر کے دے گا!

۱۹۸۲ء کا ریگن امن پلان

ریگن انتظامیہ نے یکم ستمبر کو ایک پلان پیش کیا جس میں اسرائیل سے کہا گیا تھا کہ وہ اقوام متحدہ قرارداد نمبر ۲۴۲ کی ہدایات کے بموجب تمام محاذوں سے واپس ہٹے۔ اس پلان میں اسرائیلی بستیوں کے قیام پر پابندی، فلسطینیوں کے لیے مکمل داخلی خود مختاری... گو اس میں آزاد فلسطینی ریاست کے قیام کو رد کر دیا گیا تھا... اور اس پر اصرار تھا کہ یروشلم سالم رہے لیکن اس کا مستقبل طرفین کے مابین گفت و شنید سے طے ہو۔ اس پلان میں اس بات کا بھی ذکر تھا کہ امریکہ جانب سے اسرائیل کے تحفظ کی ''فولادی'' ضمانت دی جائے گی۔ اسرائیل کی سلامتی کے لیے اس قدر پختہ ضمانت اور کارٹر کی طرف سے فلسطینی وطن کی تجویز سے روگردانی کے باوجود وزیر اعظم مناخم بیگن نے فوراً ہی اس پلان کو اسرائیل کے لیے ایک ''سخت خطرہ'' قرار دے کر مسترد کر دیا۔ اس نے ہر اس اسرائیلی کو جو اس پلان کا حامی تھا ''غدار'' قرار دیا۔ بیگن کا کہنا تھا کہ ''ہمیں اپنے گھٹنوں پر جھکنے کی ضرورت نہیں۔ ارضِ اسرائیل کی سرحدیں ہمارے علاوہ کوئی بھی دوسرا طے نہیں کرے گا!'' اگلے ہی روز اسرائیلی کابینہ نے رسمی طور پر ریگن پلان کو نامنظور کر دیا اور ساتھ ہی ساتھ ۴۲ نئی یہودی بستیاں بسانے کے عزم کا اعلان کیا۔ اس کے علاوہ ایک تیس سالہ اسکیم کا بھی اعلان کیا جس کے تحت چودہ لاکھ یہودی کو مقبوضہ علاقوں میں بسانے کا پروگرام تھا۔ بقول بیگن ''یہ نو آبادکاری یہودیوں کا ناقابل تنسیخ حق اور ہماری قومی سلامتی کا لازمی حصہ ہے۔ لہٰذا نو آبادکاری پر ہرگز کوئی پابندی نہ لگے گی!''

۱۹۸۲ء عرب فیض امن پلان

۵ ستمبر کو مراکش کے شہر فیض میں عرب لیڈران کی ایک سربراہی کانفرنس میں فیض امن پلان منظور ہوا۔ یہ سال گذشتہ کے شہزادہ فہد پلان پر مبنی تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اس میں فلسطینی تنظیم آزادی (PLO) کی زبردست حمایت کی گئی تھی کہ صرف وہی فلسطینیوں کی جائز نمائندہ جماعت

ہے۔اس پلان میں بالواسطہ اسرائیل کو تسلیم کرلیا گیا تھا کیونکہ اقوامِ متحدہ سلامتی کونسل سے کہا گیا تھا کہ وہ اس خطے کی تمام ریاستوں کے لیے امن کی ضمانت دے! اسرائیلی حکومت نے اگلے ہی دن فیض پلان مسترد کردیا کیونکہ بقول وزیر خارجہ یتزاق شامیر کے ''یہ تو اسرائیل کے ساتھ دوبارہ اعلانِ جنگ کے مترادف تھی... اس کا نہ کچھ وزن ہے اور نہ کوئی اہمیت!... اس میں وہی نفرت، وہی امن کے خلاف جنگ کی جھلک ہے!''

۱۹۸۸ء کی پی۔ایل۔او۔امن پلان

۱۵ر ستمبر کو تنظیم آزادی فلسطین کی قومی کونسل نے دہشت گردی سے دستبرداری کا اعلان کیا اور سلامتی کونسل کی قرارداد نمبر ۲۴۲ اور ۳۳۸ کو منظور کرنے کا اعلان کیا۔تصدیق کرتے ہوئے کہا: ''تنظیم آزادیِ فلسطین عرب/اسرائیل تنازع کا ایک ہمہ گیر پرامن حل چاہتی ہے اور اس کی روح یعنی مسئلہ فلسطین کا حل بھی جو اقوام متحدہ کے چارٹر کے تحت ہو۔ یہ یو۔این۔قراردادوں (تازہ ترین یو۔این سلامتی کونسل قراردادوں نمبر ۶۰۵، ۶۰۷ اور ۶۰۸) اور عرب چوٹی کانفرنسوں کے فیصلوں کے مطابق ہو۔جس کے تحت عرب فلسطینی باشندوں کو اپنے وطن واپسی کا حق ملے۔وہ حق خوداختیاری کا استعمال کرتے ہوئے اپنی ایک آزاد قومی مملکت قائم کریں جو ان کے قومی علاقوں پر مشتمل ہو اور ایسے انتظامات کیئے جائیں کہ خطہ کی تمام ریاستوں کو امن چین سے رہنا نصیب ہو۔''

اسرائیل نے فوراً ہی پی۔ایل۔او کی تجویز کو مسترد کردیا۔ ''ایک مرتبہ پھر اس تنظیم نے جو فلسطینیوں کی نمائندگی کی دعویدار ہے حقیقت کے ادراک کو ماننے اور قبول کرنے سے انکار کردیا ہے۔ اس کے تازہ بیانات میں پھر ابہام اور دوغلی باتوں سے کام لے کر تشدد کی حمایت، دہشت گردی بپا کرنے اور انتہا پسندی کی حمایت کا اعادہ کیا گیا ہے۔لہٰذا اس اعلان کو تسلیم کرنا یا جائز قرار دینے سے مشرق وسطیٰ میں قیامِ امن میں مدد نہ ملے گی!''

امریکی ردعمل نیم دلانہ تھا۔اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کے نمائندے چارلس، ای۔ریڈمین کے بقول گو PLO کا اعلان حوصلہ افزاء تھا۔لیکن اس سے مزید رعایتوں کی توقع تھی۔ بہرحال اس اعلان کی بنیاد پر امریکہ پہلی مرتبہ PLO کے ساتھ دوطرفہ گفت وشنید کے لیے راضی ہوا۔ یہ بات چیت دو سال سے زائد عرصہ تک بغیر کسی پیش رفت کے چلتی رہی اور آخرکار مئی ۱۹۹۰ء میں اختتام پذیر ہوئی۔

اسرائیل کے امریکہ سے اصرار کرنے پر ایسا ہوا۔

۱۹۸۹ء کا بش امن پلان

بش انتظامیہ نے قرارداد نمبر ۲۴۲ کو امن کی بنیاد کے طور پر اپنایا۔ ۲۲ مئی کو اس نے تمام فریقین پر زور دیا کہ وہ اعتدال پسند رویہ اپنائیں تا کہ امن کا عمل شروع ہو سکے۔ سکریٹری آف اسٹیٹ جیمز بیکر نے اسرائیل کو مشورہ دیا کہ یہ موقع ہے کہ اسرائیل ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنا غیر حقیقی عظیم تر اسرائیل کا خواب دیکھنا ترک کر دے۔ اسرائیلی مفادات، مغربی کنارے یا غزہ کے بارے میں، چاہے وہ سلامتی کے بارے میں ہوں یا کچھ اور، انہیں قرارداد نمبر ۲۴۲ کی بنیاد پر سمجھوتہ کر کے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ قبضہ کرنے سے ہاتھ اٹھا لیں، نئی آبادکاری کو روکیں، اسکول کھلنے دیں، فلسطینیوں سے رابطہ قائم کریں جیسا کہ ان ہمسایوں کو حق ہوتا ہے جن کے کچھ سیاسی حقوق ہوں۔ وزیر اعظم یٹزاق شامیر نے فوراً ہی اس تقریر کو بے سود قرار دیا۔

۱۹۹۰ء کے دوران اسرائیل کی روز افزوں بڑھتی ہوئی آبادکاری کے عمل سے بش انتظامیہ سخت مایوسی کا شکار ہوئی۔ جیمز بیکر نے ۱۳ رجون کو اعلانیہ اسرائیلی آبادکاری کی مذمت کی اور کہا: ''مجھے یہ کہنا ہے کہ وہاں (اسرائیل) پر سب کو معلوم ہونا چاہیے کہ (وائٹ ہاؤس) ٹیلیفون نمبر ۱،۲۰۲،۴۵۶،۱۴۱۴ ہے۔ جب بھی آپ امن کے بارے میں سنجیدہ ہوں ہمیں فون کرلیں!'' اسرائیل نے بیکر کے اس اظہار رائے کو بالکل نظر انداز کر دیا اور سال رواں کے دوران اپنی آبادکاری کی پالیسی پورے زور و شور سے جاری رکھی۔

۱۹۹۱ء میں بیکر نے ذاتی طور پر مداخلت کرتے ہوئے اسرائیل اور عرب اقوام کے کئی کٹھن سلسلہ وار دورے کئے تا کہ فریقین کو باہم ملاقات پر آمادہ کرنے کے طریقے تلاش کئے جائیں۔ ایسے چار دوروں کے بعد ۲۲ رمئی کو بیکر نے ایوان کی معاملات خارجہ کی ذیلی کمیٹی برائے امور خارجہ کے روبرو کہا کہ اسرائیل کے ساتھ گفت وشنید کے لیے عرب فلسطینی ساتھی تلاش کرنے میں میری کوششوں کو جس چیز نے مزید مشکل بنا دیا وہ یہ تھی کہ میں جب بھی اسرائیل جاتا تو نئی آبادکار بستیاں میرا استقبال کرتیں! میرے خیال میں تو (اسرائیل) یہ نو آبادکاری کا عمل جو نہ صرف جاری ہے بلکہ زیادہ سرعت اختیار کر رہا ہے امن کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ یہ ریاستہائے متحدہ کی

پالیسی کی صریحاً خلاف ورزی ہے... میں نے بار ہا اسرائیلی حکومت کے لیڈران کی توجہ اس طرف دلائی لیکن بے سود!

۲۲؍جولائی ۱۹۹۱ء کو بیکر کو ایک فقید الشال کامیابی ہوئی جب مصر، اردن، لبنان، سعودی عرب اور شام نے متفقہ طور پر اسرائیل کے ساتھ براہِ راست مذاکرات پر آمادگی ظاہر کردی لیکن وزیراعظم شامیر نے یہ تجویز مسترد کردی۔ بقول بیکر ''پچھلے ۴۳ برس سے اسرائیل اپنے ہمسایوں سے براہِ راست گفت وشنید کا خواہاں رہا ہے... اور اب براہ راست بات چیت کا ایک حقیقی امکان پیدا ہوا ہے۔ ہم سب یہ امید لگائے بیٹھے ہیں کہ وزیراعظم شامیر اور اس کے ساتھی کوئی ردِعمل ظاہر کریں۔'' شامیر کا جواب تھا ''میں علاقہ چھوڑنے میں ایمان نہیں رکھتا!''

شامیر کو آخرکار فلسطینیوں اور اپنے عرب ہمسایوں کے ساتھ ملاقات کرنے پر راضی کرنے کے لیے بیکر کو اسرائیل کے مزید تین دورے کرنے پڑے۔ یہ تعطل ۱۸؍اکتوبر ۱۹۹۱ء کو ختم ہوا جب سوویت یونین نے اسرائیل کے ساتھ سفارتی تعلقات بحال کرنے کے مطالبہ کے آگے سرخم کردیا۔ یہ تعلقات ۱۹۶۷ء سے منقطع تھے۔ ۳۰؍اکتوبر کو اور بعد ازاں بھی عرب اسرائیلی اہلکاروں نے میڈرڈ میں ملاقات کی۔ واشنگٹن میں دوطرفہ بات چیت میں شامیر نے صاف صاف کہہ دیا کہ وہ امن کی بات چیت پر نئی بستیاں بسانے کو فوقیت دیتا ہے۔ یہ امن مذاکرات کچھوے کی چال جاری رہے اور غیر نتیجہ خیز ثابت ہوئے۔ اسرائیل ہر ماہ صرف چند روز سے زیادہ بات چیت کرنے پر تیار ہی نہ تھا۔ شامیر جب جون ۱۹۹۲ء میں انتخاب میں ناکامی کے بعد ہٹا دیا گیا تو اس نے یہ تسلیم کیا کہ مذاکرات میں ناکامی اور رفتار کی آہستگی جان بوجھ کر کی گئی تھی۔ یہ تاخیری حربے وہ دس سال تک جاری رکھنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ حتیٰ کہ تمام مقبوضہ علاقے کی نوآبادکاری مکمل ہوجاتی۔

نئے وزیراعظم یٹزاق رابین نے گفت وشنید کا دورانیہ تو مہینہ مہینہ بھر بڑھا دیا لیکن بنیادی طور پر شامیر والی پالیسی کو تبدیل نہ کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ستمبر، اکتوبر اور نومبر ۱۹۹۲ء میں باہمی گفت وشنید کے نتیجے میں کسی بھی پیش رفت کا اعلان نہ ہوا ماسواء اردن کے ساتھ اسرائیل کے اِس اتفاق سے کہ وہ اردن کے ساتھ آئندہ بات چیت کے ایجنڈا پر راضی ہوگیا۔ لبنان اور شام کے ساتھ بات چیت معطل ہوگئی۔ اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ اسرائیل کا اصرار تھا کہ وہ لبنان کے جنوبی حصے میں اپنی افواج تعینات رکھے گا تاکہ اسرائیلی سرحدی بستیوں پر گوریلا حملوں سے حفاظت رہے اور اسرائیل نے

جولان کی پہاڑیوں پر سے اپنی فوج کے مکمل انخلاء کے خیال کو بھی مسترد کردیا۔ فلسطین کے بارے میں گفت وشنید اسرائیل کے اقوام متحدہ قرارداد نمبر ۲۴۲ کے انکار کا لگاتار شکار رہی۔

عربوں نے اس وقت تمام ہمہ فریقی اور باہمی گفت وشنید سے ہاتھ اٹھا لیا۔ جب اسرائیل نے ۴۱۳ فلسطینیوں کو مقبوضہ علاقے سے خارج کر کے جنوبی لبنان میں اپنے زیر کنٹرول علاقے کے شمال میں ایک پہاڑی چوٹی پر علاقہ بدر کردیا۔ گو بش انتظامیہ نے سلامتی کونسل کی اس قرارداد کے حق میں ووٹ ڈالا جس میں اسرائیل کے اس اقدام کی مذمت کی گئی تھی اور یہ مطالبہ کیا کہ وہ بلاتاخیر ان فلسطینیوں کو بین الاقوامی قانون کے مطابق اپنے گھروں میں واپس آکر رہنے کی اجازت دے لیکن اقتدار میں اس کے جانشین نے اسرائیل کی خلاف ورزیوں میں امریکہ کی ساجھے داری کی روایت کو جلد ہی بحال کردیا۔ صدر کلنٹن کے سکریٹری آف اسٹیٹ وارن کو کرسٹوفر نے اسرائیلی وزیراعظم یزاق رابین کی اس پیش کش کا خیر مقدم کیا جس میں اس نے ایک سو فلسطینیوں کو فوراً اور بقیہ کو سال بھر بعد واپس لینے کا وعدہ کیا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ اس پیش کش کے بعد سلامتی کونسل کی اسرائیل پر پابندیاں لگانے کی ضرورت اب باقی نہیں رہی۔ کرسٹوفر کے اعلان اور امریکی ذرائع ابلاغ میں اس اسرائیلی بیان کا کوئی نوٹس نہ لیا گیا کہ یہ سو فلسطینی گھر واپس نہیں بھجوائے جارہے تھے بلکہ جیل میں ڈالے جارہے تھے۔ بقیہ کا بھی اغلباً سال بھر بعد واپسی پر یہی حشر ہوا!

اگر یہ ملک بدری کا تنازع نہ بھی ہوتا تو امن بات چیت کی کامیابی کے امکانات معدوم ہی تھے۔ یہ حقیقت ہے کہ جب تک امریکہ بنیادی مسائل پر براہِ راست مداخلت نہ کرے، کوئی قابلِ ذکر پیش رفت ممکن ہی نہیں!



باب:۲۶

اسرائیل کے دیگر تاوان

اسرائیل کے لیے امریکی امداد کا بوجھ بے انداز اور مختلف النوع ہے۔ یہ صرف امریکہ سے ڈالروں کے سیلاب پر ہی منحصر نہیں بلکہ اس کی قیمت میں امریکی عوام کی وہ اخلاقی قیمت بھی شامل ہے جو وہ اسرائیل کی انسانیت کش پالیسیوں کی حمایت میں ملوث ہو کر ادا کرتے ہیں۔ ہماری قوم کو کئی اور بھی نقصانات برداشت کرنے پڑتے ہیں جو اسرائیلی حکام کے براہِ راست اور جان بوجھ کر کئے گئے اقدامات کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ اس میں امریکی فوجی افراد کو تنگ کرنا اور ہلاک کرنا، وسیع پیمانہ پر مضر جاسوسی سرگرمیاں، سرکاری اداروں میں بے ایمانی پھیلانا اور ایسے سیاسی دباؤ جن کے باعث ہماری معیشت کو اربوں ڈالر کا نقصان اٹھانا پڑتا ہے، شامل ہیں۔ اس کے علاوہ کچھ اور بھی نقصانات ہیں... جس میں امریکی شہریوں کا قتل بھی شامل ہے... جو اسرائیل کے ان دشمنوں کی جانب سے ہمیں برداشت کرنا پڑتا ہے جو امریکہ کے اسرائیل نواز رویے کی وجہ سے ناخوش ہیں۔

فریب ''امریکہ کا اپنا ذاتی مفاد بھی ہماری مشرق وسطیٰ پالیسیوں کے سبب فائدے میں رہا ہے۔''
(ہائمن بک بائینڈر، جیوش کمیٹی کا سابقہ نمائندہ ۱۹۸۷ء)

حقیقت:

امریکہ کو اسرائیل کے قرب کی بھاری قیمت چکانا پڑی ہے۔ یہ اسی قرب کا نتیجہ ہے کہ اسرائیل کے دشمنوں کے لیے امریکی ایک جائز نشانہ شمار کئے جاتے ہیں۔ اٹلی سے لے کر لبنان اور سوڈان تک امریکی سفارت کار مارے جا چکے ہیں۔ کئی دوسرے دہشت گردانہ اقدامات اور فضائی قزاقیوں میں امریکی مسافر خطرات میں گھرے، زخمی ہوئے یا مارے گئے۔

ریاستہائے متحدہ میں فلسطینی باشندے سرہان سرہان نے یہ دعویٰ کیا کہ اس نے سینٹر رابرٹ کینیڈی کو اس لیے قتل کیا کہ وہ کینیڈی کی اسرائیل نوازی سے نالاں تھا۔ ایک امریکی عرب ایلکس

اوڈے جو امریکن، عرب اینٹی ڈسکریمی نیشن کمیٹی کے مغربی خطے کا ڈائریکٹر تھا، ۱۹۸۵ء میں ایک بم حملے میں جاں بحق ہوا۔ یہ بم اس کے سانتا اینا کیلیفورنیا کے دفتر میں نصب کیا گیا تھا۔ اغلباً اس میں جیوش ڈیفنس لیگ کے ممبران کا ہاتھ تھا۔

لبنان میں امریکی دانشور اور نامہ نگار برسوں یرغمال بنا کر رکھے گئے۔ یہ ان گروپوں کی طرف سے تھا جو اسرائیل کے لیے امریکی حمایت پر احتجاج کر رہے تھے اور ۸۴-۱۹۸۲ء کے دوران جو امریکی فوجی اور دوسرے افراد لبنان سے شامی اور اسرائیلی افواج کے انخلاء کی حوصلہ افزائی کے لیے تعینات کئے گئے۔ ان میں سے ۲۶۳ امریکی میرین اور دیگر افراد ہلاک ہوئے اور ۱۵۱ زخمی ہوئے۔ حقیقت تو یہ ہے امریکہ کی اسرائیل حمایت کے باعث مسلمانوں میں غم وغصہ کی لہر نے ۱۹۸۰ء کی دہائی کے اواخر میں تقریباً سبھی امریکیوں کے لبنان سے اخراج کا راستہ صاف کیا۔ یہ وہ ملک تھا جہاں امریکی پچھلی صدی سے پھل پھول رہے تھے۔

اسرائیل خود بھی امریکی شہریوں کے لیے خطرے کا موجب بنا ہے۔ کئی ایسے واقعات کی دستاویزی شہادت موجود ہے جن میں اسرائیل نے ارادتاً امریکی املاک کو نقصان پہنچایا اور امریکیوں کو زخمی یا ہلاک کیا۔ ان میں ۱۹۵۴ء کا مشہور عام ''لیون افیئر'' بھی شامل ہے۔ جب اسرائیلی ایجنٹوں نے 'مصری، امریکی' تعلقات کو زک پہنچانے کے لیے مصر میں امریکی تنصیبات پر حملہ کیا۔

کئی دوسری مثالوں میں ۱۹۶۷ء کا ''یو۔ایس۔ ایس لبرٹی'' امریکی جہاز پر اسرائیلی حملہ بھی شامل ہے جس میں ۳۴ امریکی ہلاک اور ۱۷۱ زخمی ہوئے تھے۔ اسی میں ۸۴-۱۹۸۳ء کے دوران لبنان میں امریکی امن فوج کے میرین یونٹ کو باقاعدہ طور پر ہراساں کرنا بھی شامل ہے۔

لبنان میں اسرائیلی برتاؤ اس قدر اشتعال انگیز ہوگیا تھا کہ میرین کمانڈر جنرل آر۔ ایچ۔ بیرو نے ایک کھلے خط میں سکریٹری آف ڈیفنس کیسپر وائین برگر کو شکایت کرتے ہوئے لکھا کہ مجھے واضح طور پر نظر آتا ہے کہ میرین فوج اور اسرائیلی دفاعی افواج کے مابین جو بھی واقعات وقوع پذیر ہوتے ہیں ان کے وقت، محل وقوع اور طریقہ واردات میں بالواسطہ طور پر اسرائیلی سیاسی مقاصد کا حصول کارفرما ہوتا ہے۔ یہی رائے ان تمام کمانڈروں کی بھی ہے جو ساحل پر یا سطح سمندر پر تعینات ہیں۔ بیرو نے آٹھ مختلف واقعات کی نشان دہی کی جب میرین/اسرائیلی دفاعی افواج جھڑپ کے دوران بقول اس کے ''جانی نقصان والی صورت حال جس میں امریکی فوجی افسران کی ذات، وردی یا ملکی

عزت پر کیچڑ اچھالا گیا، پیش آئی تھی۔" اس کے خط میں درج تھا کہ مجھے تو سمجھ نہیں آتی کہ ایک اتحادی کیوں ہماری ان افواج کو... جو امن قائم رکھنے کا فرض ادا کر رہی ہیں... اس قدر ہراساں کرے اور نقصان پہنچائے!

فریب "ہمیں کبھی نہ بھولنا چاہیے کہ اسرائیل ایک مضبوط اور بااعتماد دوست اور ثابت قدم فوجی اتحادی ہے۔" (بل کلنٹن ۱۹۹۲ء)

حقیقت:

۱۹۸۵ء میں جس جوناتھن پولارڈ جاسوسی واقعے کا انکشاف ہوا تھا اس کے علاوہ بھی کئی ایسے کم شہرت یافتہ واقعات ہیں جن میں اسرائیلیوں یا ان کے حمایتیوں نے امریکی مفادات کے خلاف غیر قانونی اقدامات کیے۔

جن معاملات میں اسرائیل ملوث ہے ان میں ایسے مشکوک افراد کی گرفتاری شامل ہے جن کا تعلق یہودی ریاست سے تھا اور جو ایران کو ڈھائی ارب ڈالر کی مالیت کا فوجی ساز و سامان بیچنے کی کوشش کر رہے تھے۔ کچھ اسرائیل کو غیر قانونی طور پر ایسا سامان بھجوانے کی کوشش کر رہے تھے جو جوہری بموں کو چلانے کے لیے بطور ٹرگر استعمال ہوتا ہے۔ کچھ اور ایسی فنی معلومات حاصل کرنے میں مصروف تھے جو ٹینکوں کی توپوں کی بیرل بنانے میں کام آسکیں اور کلسٹر بم بنائے جاسکیں۔ ایک اور واقعہ میں اسرائیلی ایئرفورس کا جرنیل ایک امریکی فرم جنرل الیکٹرک کے ساتھ مل کر ایک بہت بڑا فراڈ کر رہا تھا۔ ان کا ارادہ اسرائیل کو مہیا کردہ فوجی امداد میں سے چار کروڑ ڈالر ہتھیانے کا تھا۔

اس جنرل الیکٹرک والی اسکیم میں اسرائیلی بریگیڈیئر جنرل رامی دوتان کو تیرہ سال کی سزائے قید دی گئی اور ۲۲ر جولائی ۱۹۹۲ء کو .G.E نے سنسناٹی فیڈرل ڈسٹرکٹ کورٹ میں فراڈ کے الزام پر اقبالِ جرم کرلیا۔ انہوں نے کالا دھن بنانے اور تجارتی غلط کاریوں کا اعتراف کیا اور چھ کروڑ نوے لاکھ ڈالر بطور تاوان اور جرمانہ ادا کرنے پر راضی ہوگئے۔ اس بڑے فراڈ کیس میں کئی اور دوسری کمپنیاں بھی ملوث تھیں جن کے خلاف آج بھی تحقیقات جاری ہیں۔ ان میں General Motors Allison اور Pratt and Whitney/Textron Lycoming شامل ہیں۔ اسی میں ایک پراسرار سوئس فرم بنام "Allis A.G" بھی شامل ہے اور جن افراد کے خلاف تحقیقات جاری تھیں ان میں ایک دوہری اسرائیلی/امریکی شہرت کا حامل شخص ہیرلڈ قاٹش شامل تھا۔ اس کے "Allis

"A.G." کے ساتھ قریبی روابط تھے اور اسی کی واشنگٹن اپارٹمنٹ پولارڈ نے خفیہ دستاویزات کی جاسوسی کرنے کے سلسلے میں ۱۹۸۰ء کی دہائی کے وسط میں استعمال کی تھی۔ اس کیس میں ڈائن کے خلاف یہ الزام بھی ہے کہ اس نے ایک امریکی غنڈے کو پچاس ہزار ڈالر ادا کیے تاکہ وہ اس کے خلاف گواہی دینے والے ایک شخص کو ہراساں یا ہلاک کر سکے۔

اسرائیل نے امریکہ کی ''ہاؤس کمیٹی برائے توانائی اور تجارت'' کی فروگذاشت کمیٹی کے ساتھ تعاون کرنے سے انکار ہی کیا ہے۔ اس کا چیئرمین ریاست مشی گن کا ڈیموکریٹ نمائندہ جون۔ ڈی۔ ڈنگل ہے۔ اسرائیل نے امریکہ کو قائفض سے سوال جواب کرنے کی اجازت دینے سے انکار کیا۔ ڈنگل نے اعلانیہ یہ شکایت کی کہ اسرائیل کا رویہ انتہائی غیر معاونانہ تھا۔ بقول ڈنگل ''ہم انہیں انجن مہیا کرتے ہیں، فنی امداد مہیا کرتے ہیں، ہمارا ایک وسیع پروگرام ہے جس کے ماتحت ہم معتد بہ رقم انہیں فراہم کرتے ہیں اور وہی یہ دعویٰ کر رہے ہیں کہ ان کی قومی سلامتی انہیں اس بات سے روک رہی ہے کہ وہ ہمیں ایک ایسی بات کا معائنہ کرنے دیں جس کے بارے میں انہیں اعتراف ہے کہ وہ ایک جرم ہے۔''

حد تو یہ ہے کہ کرپشن/بدعنوانی پینٹاگون کی اعلیٰ سطحوں تک سرایت کر چکی ہے۔ ۱۹۹۱ء میں سابقہ نیوی اسسٹنٹ سکریٹری میلون۔ آر۔ پیضلے نے ورجینیا میں الیگزانڈریہ فیڈرل ڈسٹرکٹ کورٹ کے روبرو ایک مہیب فراڈ کے بارے میں اقبال جرم کیا۔ اس میں ایک اسرائیلی کمپنی ''اسرائیلی مصلات لمیٹڈ'' کو دفاعی ٹھیکہ دینے میں بدعنوانی کا ارتکاب کیا گیا تھا۔ امریکی فرمیں جو اس میں ملوث تھیں ان کے نام ''سپیری کارپوریشن'' اور مارٹن میری ایٹا کارپوریشن تھے۔ پیضلے نے یہ تسلیم کیا کہ اس نے ایک سازش کے تحت ''مصلات'' کی کئی دفاعی سودے حاصل کرنے میں مدد کی تھی۔ یہ میدان جنگ میں خود کار یعنی بغیر ہواباز کے اڑنے والے ہوائی جہاز بنانے کے لیے تھا جو دشمن کا فضائی جائزہ لے کر اطلاعات دیتے ہیں اور اس کے بدلے میں اسے بیس لاکھ ڈالر بطور رشوت دینے کا وعدہ کیا گیا تھا۔ ایک سابقہ موساد جاسوس وکٹر آسٹروفسکی کے بموجب ''ماضلات'' اسرائیل کے سرکاری ادارے ''اسرائیلی ایرونائیکل انڈسٹریز'' اور ''تاڈیران'' کا ایک ذیلی ادارہ تھا اور اس کے خود کار ہوائی جہاز (DRONE) کی تحقیقات کو موساد نے امریکی کمپنیوں سے چرایا تھا۔ ۱۸ اکتوبر کو پیضلے کو ۴ سال قید اور دو سال ضمانت نیک چلنی کے ساتھ ساتھ پچاس ہزار ڈالر جرمانے کی سزا بھی سنائی گئی۔

مزید برآں ایران/کونٹرا اسکینڈل بھی ہے۔ اس میں اسرائیل نے ریگن انتظامیہ کی اس بات پر حوصلہ افزائی کی کہ وہ ایران کو ہتھیار فروخت کریں۔ مقصد لبنان میں قید امریکی یرغمالیوں کی رہائی اور اس منافع سے حاصل شدہ رقم کو نکاراگوا کے Contras کی امداد کے لیے خرچ کرنا تھا۔ یہ کانگریس کی خلاف ورزی میں ہو رہا تھا۔ سینٹ سراغ رسانی کمیٹی کے چیئرمین سینٹر ڈیوڈ۔ ایف۔ ڈیورنبرگر کا اندازہ یہ تھا ''کسی اور کی خارجہ پالیسی اور ہتھیاروں کے سوداگروں کی ہوس'' کے ذریعے انتظامیہ کو بدھو بنایا گیا ہے۔ گو اس عدالتی فیصلے کے ماتحت انتظامیہ کی فاش غلطی کو پورا پورا ظاہر نہیں کیا گیا۔ پھر بھی اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس اسکیم میں اسرائیل کا رول کس قدر اہم تھا۔

فریب ''امریکی فوجی امداد کا ۸۰ فیصد تو امریکہ ہی میں خرچ ہوتا ہے۔ اس سے امریکی فرموں میں آسامیاں اور منافع کے مواقع پیدا ہوتے ہیں!'' (AIPAC ۱۹۹۲ء)

حقیقت:

''امریکہ میں خریداری کا قانون'' کے ماتحت خارجی حکومتوں کو امریکی ٹیکس گزاروں کی طرف سے جو فوجی امداد ملتی ہے۔ اس کا ۸۰ فیصد ریاستہائے متحدہ کے اندر خرچ کرنا لازمی ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ یہ قانون اب اسرائیل پر لاگو نہیں ہوتا۔ خاص طور پر اسرائیل کے لیے منظور کئے گئے ایک اِستثنائی قانون میں ''امریکہ میں خریداری کے قانون'' کو بالائے طاق رکھ دیا گیا ہے۔ اسرائیل کو اجازت ہے کہ وہ ساڑھے سینتالیس کروڑ ڈالر... امریکہ کی جانب سے ملنے والی ۱۸۰ کروڑ ڈالر کی سالانہ فوجی امداد کا ۲۶ فیصد... اسرائیل ہی کے اندر خرچ کرلے تاکہ ''آسامیاں اور منافع کے مواقع'' اسرائیل میں پیدا ہوں نہ کہ امریکہ میں!

واشنگٹن کے اسرائیل کی جانب سے جھکاؤ کی صرف یہی قیمت نہیں ہے! اسرائیل کے حامی کانگریس کے اندر لگاتار دباؤ برقرار رکھ کر ان اعتدال پسند عرب ممالک کو بھی فوجی ساز وسامان کی فروخت رکوا دیتے ہیں جو وہ اپنے دفاع کے لیے نقد ادائیگی کی بنیاد پر خریدنا چاہتے ہیں۔ ۱۹۸۵ء میں سعودی عرب نے امریکہ سے بڑی تعداد میں "F-15" جنگی ہوائی جہاز خریدنے میں دلچسپی ظاہر کی۔ ۵۱ سینٹرز... یعنی ممبروں کی اکثریت نے... صدر ریگن کو اس فروخت کے خلاف خط لکھا۔ سعودیوں نے اس پر برطانیہ کی طرف رجوع کیا۔ فوری سودا تو تقریباً سات ارب ڈالر کا تھا لیکن آخرکار یہ تیس ارب ڈالر تک جا پہنچا جو آج تک کی تاریخ میں ہتھیاروں کا عظیم ترین سودا ہوتا!

اس طرح کا سودا کھودینے پر سکریٹری آف ڈیفنس فرینک۔سی۔ کارلیوچی ۱۹۸۸ء میں یہ نکتہ چینی کرنے پر مجبور ہوگیا کہ کانگریس کے اندر کئی گروہ اور مفاد پرست عناصر عرب ممالک کو ہتھیار فروخت کرنے کی مخالفت کرتے ہیں۔ بقول کارلیوچی ''اس طرح کی مخالفت عرب ممالک میں اثر و رسوخ کو بہ نسبت سوویت یونین، برطانیہ، چین اور فرانس کے کم کرنے کا باعث بن رہی ہے۔'' اسکا کہنا تھا کہ یہ خیال کہ اعتدال پسند عرب ریاستوں کے ساتھ دفائی معاونت سے اسرائیل کو خطرہ پیدا ہوتا ہے، بالکل بے بنیاد اور لغو ہے۔

کارلیوچی کا یہ تبصرہ امریکی ہتھیاروں کی عربوں کو فروخت کے بارے میں اسرائیل مخالفت کے ایک تشویشناک پہلو کی نشاندہی کرتا ہے۔ یہ اسرائیل کی نیت کے بارے میں شک پیدا کرتا ہے۔ اسرایل لگاتار اس پر اصرار کرتا ہے کہ وہ یہ مخالفت اپنی قومی سلامتی کے نکتہ نظر سے کرتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس نے سعودی عرب کو فروختگی کی مخالفت اس بات کے بعد بھی جاری رکھی جب واشنگٹن نے ان ہتھیاروں کی تنصیب والی جگہوں پر کڑی حدود عائد کردیں۔ مثلاً F-15 جہازوں کے بارے میں سعودی عرب نے یہ مان لیا کہ وہ ان جہازوں کو کہیں بھی اسرائیل کے قریب نہیں رکھیں گے۔ بعدازاں جب وہ آخرکار برطانیہ سے خریدے گئے تو اس قسم کی کوئی شرط عائد نہ تھی!

شک اس بات کا ہے کہ ایسے معاملات میں اپنی سلامتی سے زیادہ اسرائیل کو عربوں کو یہ دکھلانا مقصود ہوتا ہے کہ وہ امریکہ کی پالیسی پر کس حد تک حاوی ہے۔

فریب ''اسرائیل کے ساتھ ہمارے تعلقات ہمارے باہمی ذاتی مفاد میں ہیں!''

(صدر رونالڈ ریگن ۱۹۸۸ء)

حقیقت:

اسرائیل کس طرح امریکی امداد کا فائدہ اٹھا کر امریکی مفاد کو زک پہنچاتا ہے۔ اس کی ایک بے حد عمدہ مثال ۱۹۸۰ء کے عشرے کا ''لاوی'' ہوائی جہاز پراجیکٹ ہے۔ یہ ایک انتہائی مہنگا پروجیکٹ تھا جس کا مقصد اسرائیل کو اپنے ہوائی جہاز خود بنانے کے قابل کرنا تھا اور ریگن انتظامیہ نے شروع کیا تھا۔ یہ جہاز اسرائیل میں ڈیزائن اور تیار ہونے تھے۔ امریکہ نے ان پر اٹھنے والے اخراجات کا نوے فیصد اور استعمال ہونے والی فنی مہارت کا نصف مہیا کرنا تھا۔ اس کے بدلے میں اسرائیل نے یہ وعدہ کیا تھا کہ وہ تیسری دنیا میں امریکہ کے ہوائی جہازوں کی برآمد میں مسابقت سے باز رہے گا۔

اسرائیل کے حامی آج تک اس بھرم کو برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ AIPAC نے ۱۹۹۲ء میں کہا تھا کہ ''لاوی'' کا مقابلہ کبھی بھی امریکن ساختہ ہوائی جہازوں سے نہ تھا! اس کے باوجود واشنگٹن پوسٹ کو یہ پتہ چلا کہ ''لاوی'' بنانے والے سرکاری ملکیت کے ادارے ''اسرائیل ایئر کرافٹ انڈسٹریز'' نے اس پروجیکٹ کے اوائل میں ایک اشتہاری مارکیٹنگ کتابچہ شائع کیا عنوان تھا: ''لاوی، ایک باکفایت لڑاکا ہوائی جہاز۔'' اس کتابچہ میں درج تھا کہ اسرائیل اس قسم کے تقریباً ۴۰۷ جہاز سمندر پار ممالک میں فروخت کرے گا۔

اس طرح امریکہ ایک عجیب و غریب مخمصہ میں گرفتار ہوگیا۔ یعنی اسے ایک ایسے جہاز کے پروجیکٹ پر بیرون ملک سرمایہ لگانا اور فنی امداد بھی مہیا کرنا تھی جو پھر براہِ راست امریکی ساختہ ہوائی جہازوں کا عالمی منڈی میں مقابلہ کرتا۔ ان امریکی فرموں کو یہ جہاز تیار کرنے میں ذرہ بھر امداد نہیں مل رہی تھی۔ آخر کار یہ ہوا کہ اسرائیلی نااہلیت امریکی جہاز سازوں کے آڑے آئی۔ امریکہ کی حتی المقدور امداد کے باوجود اسرائیل یہ ہوائی جہاز نہ بنا پایا۔ اس پروجیکٹ کو بے تحاشا اضافی اخراجات کی وجہ سے سمیٹنا ہی پڑا۔ ''لاوی'' پر امریکہ کے ڈیڑھ ارب ڈالر پھونکے گئے!

اسرائیلی اسٹیٹ کمپٹرولر یعقوف مالتظ نے اسرائیل کے ''لاوی پروجیکٹ'' کے انتظام پر انتہائی تلخ و تند نکتہ چینی کرتے ہوئے اپنی ۴۰ صفحات کی رپورٹ میں کہا کہ بہت سارے اہم اور ضروری فیصلے جن اطلاعات کی بنیاد پر کیے گئے وہ بنیاد ہی موجود نہ تھی! وہ ناکافی معلومات اور تخیلات پر مبنی تھے اور لاگت کے تخمینے تو لگائے ہی نہ گئے تھے! یروشلم پوسٹ میں شائع شدہ ایک رپورٹ کے الفاظ میں مالتظ کا کہنا تھا: ''اسرائیلی اہلکاروں نے جہاز کے مقصد، سائز اور لاگت پر غور ہی نہ کیا تھا... اور نہ ہی ان کے پاس لاگت/برآمدی امکانات یا دوسرے پہلوؤں کے بارے میں تفصیلات موجود تھیں۔''

اس سب کے باوجود ''لاوی'' پروگرام کی منسوخی کے بعد سکریٹری آف اسٹیٹ جارج شلز نے اسرائیل کو اس بات کی اجازت دی کہ وہ اپنی فوجی امداد میں سے ۴۵ کروڑ ڈالر ٹھیکوں کی منسوخی کے اخراجات کی مد میں خرچ کرلے۔ اسرائیل کو Offset پروگرام (جس سے مراد یہ ہے کہ امریکی کمپنیاں اسرائیلی سامان خریدیں... (مترجم) جاری رکھنے کی اجازت دی گئی جس کے تحت امریکی فرموں کو پندرہ کروڑ ڈالر تک کا اسرائیلی مال خریدنا لازمی تھا۔ اگر وہ اسرائیل میں ٹھیکہ حاصل کرنے کی خواہش مند ہوں اور یہ اخراجات امریکی امداد سے کیے جانے تھے۔ مزید براں امریکی امداد میں ۴۰

کروڑ ڈالر تک سالانہ اسرائیل کے اندر خرچ کرنے کی اجازت بھی مرحمت کی گئی۔

لاوی پروگرام سے فارغ کئے گئے بیشتر فنی ماہر جنوبی افریقہ ہجرت کر گئے۔ اس سے جنوبی افریقہ کے خلاف عائد شدہ پابندیوں کی خلاف ورزی صاف عیاں تھی کیونکہ انتہائی ترقی یافتہ تکنیکی وفنی معلومات جنوبی افریقہ منتقل ہوگئیں۔ اگست ۱۹۸۸ء میں جنوبی افریقہ نے اپنے نئے الیکٹرانک جنگی ہوائی جہاز ''چیتا۔ای'' کی رونمائی کی۔ اس میں متعدد وہ صلاحیتیں موجود تھیں جو بیشتر اسرائیلی ساختہ ہوائی جہازوں میں تھی۔

فریب ''اصل کہانی تو یہ ہے کہ یہ گمنام افراد کون ہیں جو یہ حاسدانہ افواہیں پھیلا رہے ہیں؟ (اسرائیل کے امریکی ٹیکنالوجی کو آگے برآمد کرنے کے بارے میں!)''

(موشے آرینز، اسرائیلی وزیر دفاع ۱۹۹۲ء)

حقیقت:

مارچ ۱۹۹۲ء میں ''دی وال اسٹریٹ جرنل'' نے یہ خبر دی کہ ''امریکی سراغ رسانی برادری میں اس بارے میں کوئی شک نہیں کہ اسرائیل متعدد مرتبہ ہیرا پھیری میں ملوث رہا ہے۔'' یکم اپریل ۱۹۹۲ء کو اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کے انسپکٹر جنرل نے یہ الزام دھرا کہ اسرائیل... جسے رپورٹ میں امریکی فوجی امداد کا ایک بڑا رسیدہ کنندہ گردانا گیا تھا۔ ایک روز افزوں اور باقاعدہ اسکیم کے تحت امریکی ٹیکنالوجی کے خفیہ راز بیچنے میں مصروف رہا ہے جو امریکی قوانین کی خلاف ورزی ہے۔ اس رپورٹ میں کہا گیا تھا کہ اسرائیل نے یہ خلاف ورزیاں ۱۹۸۳ء کے لگ بھگ شروع کیں اور اسرائیل ان کی پردہ پوشی کرتا رہا ہے۔

اسرائیل کے خلاف ایک بڑا الزام یہ تھا کہ وہ چین کو امریکہ کی ''میزائل توڑ میزائل'' یعنی "Patriot" کے خفیہ راز فروخت کر رہا ہے۔ سترہ ممبران پر مشتمل ایک امریکی معائنہ ٹیم جو اسرائیل بھیجی گئی۔ وہ پیٹریاٹ یا اس کی ٹیکنالوجی کو چین کے حوالے کئے جانے کا کوئی بھی ثبوت تلاش کرنے میں ناکام رہی۔ اس کے باوجود سکریٹری دفاع ڈک چینی کا کہنا تھا کہ ہمارے پاس اس بات پر یقین کرنے کے معقول وجوہ موجود ہیں کہ پیٹریاٹ میزائل آگے فراہم کی گئی ہیں۔

ان الزامات نے اسرائیل میں کھلبلی مچا دی۔ اسرائیل کی برآمدات میں تقریباً ۴۰ فیصد حصہ ہتھیاروں کا ہے جن کی مالیت تقریباً ڈیڑھ ارب ڈالر بنتی ہے اور یہ تقریباً ساری کی ساری امریکی

ٹیکنالوجی پر مبنی ہیں۔ ۱۹۹۱ء میں دو صحافی برادران اینڈریو اور لیزلی۔ کاک برن نے اس بات کی تفصیلی جانچ پڑتال کی کہ کس طرح اسرائیل امریکی خفیہ (کلاسی فائیڈ) ٹیکنالوجی سے مستفید ہوتا ہے۔ یہ ان کی کتاب "Dangerous Liaison" میں افشاء کیا گیا تھا۔ اس سے سال بھر پیشتر ''لاس اینجلیز ٹائمز'' نے بھی یہ رپورٹ شائع کی تھی کہ اب اسرائیل چین کو امریکی ہتھیاروں کی ٹیکنالوجی فراہم کرنے والا عقبی دروازہ بن چکا ہے۔

امریکی ٹیکنالوجی کی اسرائیل منتقلی ۱۹۷۰ء میں شروع ہوئی جب دور رس ''ماسٹر ڈیفنس ڈویلپمنٹ ڈیٹا ایکسچینج ایگریمنٹ'' پر دستخط کئے گئے۔ یہ اسرائیل یا کسی بھی دوسرے ملک کو ٹیکنالوجی کی منتقلی کا سب سے بڑا منصوبہ تھا۔ اسرائیل کی اقتصادیات کے لیے اس بڑے پیمانے پر ٹیکنالوجی میں پسماندہ اور ہتھیار درآمد کرنے والا ملک تھا۔ اب دنیا بھر میں فوجی ہتھیار برآمد کرنے والا ساتواں بڑا ملک بن کر ابھرا۔ اب اس کی برآمدات کا حجم ایک ارب تیس کروڑ ڈالر ہو چکا ہے!

ایک اسرائیلی مؤرخ کا مشاہدہ ہے کہ امریکہ نے اپنی تمام تر بہترین ترقی یافتہ ٹیکنالوجی اور ہتھیار... مطلب یہ کہ بہترین لڑاکا ہوائی جہاز، میزائل، ریڈار، بکتر بند گاڑیاں اور توپیں!... اسرائیل کو مہیا کر دیے ہیں۔ اسرائیل نے اپنے طور پر اس علم کو استعمال کر کے امریکی ساز و سامان کے ذریعے اپنی فنی مہارت کو خوب خوب صیقل کر لیا ہے جو اب اسرائیلی دفاعی سامان کی برآمدات میں صاف جھلکتی ہے۔

فریب ''ریاستہائے متحدہ کا انحصار اِس قدر سعودی عرب پر نہیں ہے جتنا کہ سعودی عرب کا ریاستہائے متحدہ پر ہے!'' (AIPAC ۱۹۸۹ء)

حقیقت:

جب ۱۹۷۳ء میں سعودی عرب نے اپنا تیل کا تباہ کن مقاطعہ نافذ کیا تو سکریٹری آف اسٹیٹ ہنری کسنجر نے یہ تسلیم کیا کہ ''مجھ سے غلطی ہوئی''، لیکن اب بہت دیر ہو چکی تھی!

۷۴-۱۹۷۳ء کا عرب تیل مقاطعہ اس لیے ظہور پذیر ہوا کہ صدر نکسن نے تیل پیدا کرنے والی ریاستوں کا یہ مکرر انتباہ نظر انداز کر دیا کہ ریاستہائے متحدہ ۱۹۷۳ء کی عرب اسرائیل جنگ میں اپنی پوزیشن میں توازن برقرار رکھے۔ لیکن کسنجر کے اصرار پر صدر نکسن نے سعودی عرب کی درخواستوں کو درخورِ اعتناء نہ سمجھتے ہوئے اکتوبر کی جنگ کے عین دوران اسرائیل کے لیے جنگی ساز و سامان کی

ترسیل کے لیے ایک بہت بڑا ہوائی منصوبہ اعلانیہ شروع کر دیا۔

سعودی عرب کے شاہ فیصل اور دوسرے عرب لیڈروں نے واشنگٹن سے اس سے زیادہ کچھ نہ کہا تھا جو کہ چھ سال قبل سلامتی کونسل بھی کہہ چکی تھی... یعنی اسرائیل ۱۹۶۷ء کی جنگ بندی پر واپس چلا جائے! شاہ فیصل نے بار بار یہی پیغام واشنگٹن کو پہنچایا لیکن کسی کے کان پر جوں تک نہ رینگی!

اس کی بجائے نکسن نے... جو پہلے ہی واٹر گیٹ اسکینڈل سے ڈسا جا چکا تھا... اسرائیل کو ۱۹؍اکتوبر کو ۲۲۰ کروڑ ڈالر کی ہنگامی امداد مہیا کی۔ اگلے ہی دن سعودی عرب نے امریکہ کو تیل کی فراہمی پر مکمل پابندی لگا دی جو کہ اسرائیل کو امداد دیے جانے کا بدلہ تھا۔ دوسری تیل پیدا کرنے والی ریاستوں نے بھی فوراً تقلید کی!



باب: ۲۷

اسرائیل بطور ایک دفاعی اتحادی کے!

اسرائیل کو اکثر ریاستہائے متحدہ کا فوجی اتحادی کہا جاتا ہے۔ یہ نکتہ نظر فاش غلطی پر مبنی ہے۔ اس سے وہ اقوام اور سیاسی تحریکیں ہم سے برگشتہ اور بیزار ہو جاتی ہیں جن کا تعاون امن کے لیے بہت اہم ہے۔ قانونی اور عملی دونوں نکتہ ہائے نظر سے اسرائیل امریکہ کا حلیف نہیں ہے۔ ان دونوں اقوام کے مابین کسی قسم کا بھی پیمان دوستی نہیں ہے۔ ۲۹ رنومبر ۱۹۸۳ء کو ریگن انتظامیہ نے اسرائیل کے ساتھ فوجی تعاون کی جو مفاہمتی دستاویز دستخط کی وہ کوئی معاہدہ نہیں ہے اور نہ ہی اسے عالمی قانون میں کوئی درجہ حاصل ہے۔ یہ صرف اس انتظامیہ کو پابند کرتی ہے جس نے اس پر دستخط کئے۔

اسرائیل کے پاس آبادی ہے نہ رقبہ جو اسے ریاستہائے متحدہ کا فوجی اتحادی کا رول ادا کرنے کا اہل بنا سکے۔ گو مشرق وسطیٰ میں وہ ایک سپر پاور ہیں لیکن تمام ہمسایہ آبادیوں کے ساتھ ان کا دشمنی کا ریکارڈ اسے امریکہ کے سلامتی تحفظات کے لیے ایک بوجھ کی حیثیت دے دیتا ہے۔ ریاستہائے متحدہ تو اسرائیل کے بطور فوجی اتحادی ایک عظیم سرمایہ ہے لیکن اس کا اُلٹ سچ نہیں ہے۔

فریب ''امریکن... اب اسرائیل کی بیش بہا اہمیت کے قائل ہو چکے ہیں... بطور جمہوریت اور آزادی کے ایک حصہ دار کے... بطور ایک ایسی قوم کے جو ہمارے عظیم آدرشوں کی ساجھے دار ہے اور بطور ایک انتہائی اہم فوجی اتحادی کے!''

(جارج۔ پی۔ شلز سکریٹری آف اسٹیٹ ۱۹۸۵ء)

حقیقت:

یہ دعویٰ کہ اسرائیل ایک فوجی اتحادی ہے۔ ۱۹۸۰ء کی دہائی میں AIPAC کی طرف سے نہایت کامیابی کے ساتھ پھیلایا گیا۔ یہ امریکہ میں یہودی لابی کی سربراہ ہے۔ اس کا پورا نام ''امریکن اسرائیل پبلک افیئرز کمیٹی'' ہے۔ AIPAC کی دلیل کا نچوڑ یہ ہے کہ روسی سوویت اثر و نفوذ کے

کاریاں
پھیلاؤ کے خلاف اسرائیل ریاستہائے متحدہ کا اس خطہ میں فوجی حلیف ہے۔ کیونکہ اسرائیل میں سیاسی استحکام، حربی صلاحیتیں ہیں اور سراغ رسانی کا نظام ہے۔ اپنے اس دعوے کی حمایت میں اس لابی نے کتابچوں کا ایک سلسلہ شائع کیا جس کا عنوان تھا:

"Papers on U.S. Israeli Relations" (AIPAC)

ان کتابچوں میں امریکہ کے اسرائیل کے ساتھ قریبی روابط کے فوائد پر... خصوصاً سلامتی کے میدان میں... روشنی ڈالی گئی تھی۔

سابقہ صدور اور کئی سکریٹری آف اسٹیٹ نے اسرائیل کے ساتھ رسمی معاہدے سے احتراز کیا تھا۔ گو ان کا برتاؤ اکثر ایسا ہوتا کہ جیسے یہ موجود ہے۔ سرکاری سطح پر واشنگٹن نے ہر بار اسرائیل کے ساتھ رسمی تعلقات قائم کرنے سے گریز ہی کیا۔ مثلاً ۱۹۵۰ء کی دہائی کے وسط میں اسرائیل ریاستہائے متحدہ کے ساتھ ایک باضابطہ معاہدہ سلامتی طے کرنا چاہتا تھا لیکن سکریٹری آف اسٹیٹ جان فوسٹر ڈلس نے یہ کہہ کر کہ ریاستہائے متحدہ سے یہ امید تو نہیں رکھی جاسکتی کہ وہ ''عارضی جنگ بندی لائنوں کی ضمانت دے۔ وہ صرف متفقہ اور مستقل امن سرحدوں کی گارنٹی دے سکتا ہے'' معاملے کو ٹال دیا۔ گویا دوسرے الفاظ میں ڈلس اسرائیل کو یہ کہہ رہا تھا کہ وہ اپنی سرحدیں طے کر لے اور پھر ان کے اندر ہی رہے!

صدر کارٹر کے سکریٹری آف ڈیفنس ہیرلڈ براؤن نے تو اسرائیل کے بطور فوجی اتحادی ایک اثاثہ ہونے کو یہ کہہ کر فوراً ہی رد کر دیا کہ ''مجھے تو یہ خیال ہی مسخرہ پن لگتا ہے کہ اسرائیل کبھی ہمارا اثاثہ بنے! اسرائیلی تو یہ کہیں گے کہ لائیے۔ ہم آپ کی مدد کریں اور نتیجہ یہ ہوگا کہ ہم ان کے چمچے بن جائیں گے! اسرائیلیوں کے اپنے تقاضے ہیں، سلامتی کے اور ہمارے اپنے تقاضے ہیں۔ یہ یکساں نہیں ہیں۔''[1]

صدر ریگن نے یہ رویہ یکسر بدل دیا۔ ۳۰ رنومبر ۱۹۸۱ء کو سکریٹری آف اسٹیٹ الیگزانڈر ہیگ کے اصرار پر ریاستہائے متحدہ نے اسرائیل کے ساتھ اس مفاہمتی دستاویز پر دستخط کر دیے جسے جنگی معاونت کا نام دیا گیا۔ اس معاہدے کی رو سے مشرق وسطیٰ میں پیدا ہونے والے خطرات کے خلاف

[1] (واللہ! کیسی خدا لگتی کہہ گیا ہے!... (مترجم)

امریکی/اسرائیلی تعاون کیا جائے گا۔ اگر یہ خطرہ ''سوویت یونین سے درپیش ہو یا خطہ کے باہر سے کسی سوویت کنٹرول والی فوج سے ہو۔''

اقوام متحدہ جنرل اسمبلی نے ردِعمل ظاہر کرتے ہوئے یہ قرارداد منظور کی کہ اس معاہدے سے ''اسرائیل کو اپنے مقبوضہ علاقوں میں جارحانہ اور توسیع پسند پالیسیاں اختیار کرنے کی شہہ ملے گی'' اور اس کے ''مشرق وسطیٰ میں مستقل اور انصاف پرمبنی امن قائم کرنے کی کوششوں پر مضر اثرات پڑیں گے اور یہ خطہ کی سلامتی کے لیے ایک خطرہ بنے گا۔''

۱۴ردسمبر ۱۹۸۱ء کو اسرائیل نے عالمی رائے عامہ کو پائے حقارت سے ٹھکراتے ہوئے شام کی جولان کی پہاڑیوں کو ضم کرلیا۔ ریاستہائے متحدہ نے اقوام متحدہ سلامتی کونسل میں قرارداد مذمت کی حمایت کی اور اسرائیل کے ساتھ فوجی تعاون کے معاہدے کو بھی معطل کردیا۔ بہرحال ۲۹رنومبر ۱۹۸۳ء کو ریگن انتظامیہ نے دوبارہ اس معاہدے کی تجدید کی۔ اس تاریخ سے اسرائیل اور ریاستہائے متحدہ نے دوبارہ رسمی طور پر مشرق وسطیٰ میں کمیونسٹ عمل دخل کے خلاف مشترکہ جنگ کرنے کا عہد کیا۔

اس پالیسی کو سکریٹری آف اسٹیٹ جارج شلز کی کڑی حمایت حاصل تھی جب کہ CIA، اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کے کچھ اہلکار اور سکریٹری آف ڈیفنس کیسپر وائین برگر اس کے حق میں نہ تھے لیکن ان کی کچھ نہ چلی۔ ان سب سے عرب ریاستوں کے ساتھ دوستانہ تعلقات کی اہمیت کو نظرانداز نہ کرنے پر خبردار کیا تھا اور کہا تھا کہ ریاستہائے متحدہ کو اسرائیلی پالیسیوں کا یرغمالی نہیں بننا چاہیے!

فریب ''اسرائیل ہمارا سب سے زیادہ مضبوط اتحادی اور بہترین دوست ہے۔ صرف مشرق وسطیٰ ہی نہیں بلکہ پوری دنیا میں۔''

(سینٹر الگور، ڈیموکریٹ امیدوار برائے نائب صدر ۱۹۹۲ء)

حقیقت:

ایک دانشور چیرل۔ اے۔ ریوبن برگ کا کہنا ہے کہ ''امریکی/اسرائیلی تعلقات میں ریاستہائے متحدہ نے پوری پوری حتمی حمایت کی لیکن اسرائیل نے متعدد بار ایسے اقدامات اٹھائے جو امریکن مفادات کے منافی تھے... اکثر مرتبہ خاصا نقصان بھی پہنچایا۔ سابقہ انڈر سکریٹری آف اسٹیٹ جارج۔ ڈبلیو۔ بال کا بھی کہنا ہے کہ اسرائیل نے کبھی بھی ریاستہائے متحدہ سے وہ سلوک روا نہیں رکھا جس کی ایک حمایتی سے توقع ہوتی ہے۔ اس کی اولین ترجیحات میں ہمارے ساتھ مل کر خطے میں پائیدار امن کا

کاریاں قیام شامل نہیں ہے۔ جب تک وہ اس کی اپنی توسیع پسندانہ پالیسی پر مبنی نہ ہو، وہ نہ تو ہمارے ساتھ صلاح مشورہ کرتا ہے اور نہ کرنا چاہتا ہے کہ ہم کوئی مشترکہ پالیسی اختیار کریں۔ وہ لگاتار ریاستہائے متحدہ کو اپنے اقدامات کے بارے میں دھوکہ دیتا اور اندھیرے میں رکھتا ہے۔ اس طرح وہ اکثر امریکی مفادات اور اقدامات کو نقصان پہنچاتا ہے۔"

ان تعلقات میں ایک پیچیدگی اس وجہ سے بھی پیدا ہوجاتی ہے کہ متعدد انتظامیہ یکے بعد دیگرے اسرائیل کی عرب مخالف سازشوں میں خفیہ طور پر شریک ہوتی رہی ہیں۔ یہ اکثر امریکہ کی سرکاری پالیسی کی خلاف ورزی میں ہوتا ہے۔ ان سب کے باوجود اسرائیل نے بار بار امریکی صلاح مشورے کو پائے حقارت سے ٹھکرایا ہے۔ یروشلم ضم کرنے جیسے اہم فیصلے سے قبل واشنگٹن سے مشورہ ضروری نہیں گردانا گیا اور جیسا کہ پہلے بھی ذکر آچکا ہے، ریاستہائے متحدہ کی جاسوسی بھی کرتا رہا ہے۔ اس کی پالیسیاں اور اقدامات... جیسے لبنان پر حملہ، مقبوضہ علاقوں پر جبری قبضہ جاری رکھنا، اقوام متحدہ چارٹر اور چوتھی جنیوا کنونشن کی خلاف ورزی... امریکی اقدامات سے براہِ راست متصادم ہیں۔ ان تمام اقدامات کے ہوتے ہوئے بھی... جو کہ اسرائیل کو بطور ایک اتحادی کے زیب نہیں دیتیں!... ریگن انتظامیہ اسرائیل کی چاپلوسی میں حد سے گزر گئی اور انہیں کئی سلسلہ وار ایسی حیران کن رعایتیں عنایت کیں جو یہودی ریاست کے فوجی اتحادی بنا دینے سے بھی زیادہ تھیں!

۱۹۸۵ء میں ریگن انتظامیہ نے اسرائیل کے ساتھ ایک منفرد آزاد تجارتی علاقہ قائم کیا۔ اس معاہدے سے اسرائیلی اشیاء تجارت کو امریکہ میں ڈیوٹی فری رسائی حاصل ہوگئی جو امریکہ کے اپنے تیار شدہ مال مثلاً ٹیکسٹائل اور ترشاوہ پھلوں سے براہ راست مسابقت کرنے لگے۔ اپنی مارکیٹ میں کسی بیرونی حکومت کو ریاستہائے متحدہ نے پہلی مرتبہ ایسی رسائی دی تھی۔

۱۹۸۶ء میں صدر ریگن کے متنازع پروگرام جسے عرفِ عام میں "اسٹار وارز" کہتے تھے اسرائیل کو انتہائی ترقی یافتہ تحقیقی کاموں میں حصہ لینے کا حق عنایت کردیا گیا۔ اسرائیل اس پروگرام میں برطانیہ اور مغربی جرمنی کے بعد تیسرا شریک کار بن گیا۔ اسرائیل کو اب تک اس SDI پروگرام کے تحت اپنی "ایرو" نامی اینٹی میزائل دفاعی سسٹم کی ترویج و ترقی کے لیے بارہ کروڑ ساٹھ لاکھ ڈالر مہیا کیے جاچکے ہیں اور اس پروگرام کو ۱۹۹۲ء میں جاری رکھنے کے لیے مزید چھ کروڑ ڈالر کا وعدہ ہے اور بقول سینٹر رابرٹ بائیرڈ کئی کروڑ مزید ڈالروں کی مستقبل میں توقع رکھنی چاہیے۔

۱۹۸۷ء میں اسرائیل کو جاپان اور آسٹریلیا جیسے ممالک کی صف میں لا کر امریکہ کے ''غیر ناٹو اتحادی'' کے مرتبے سے نوازا گیا۔ گویا اب وہ ہتھیاروں کی مشترکہ پیداوار میں ساجھی بن سکتا ہے۔ مرمت اور دیکھ بھال کے ٹھیکوں میں حصہ لے سکتا ہے۔ امریکی رقوم کو اپنی تحقیق و ترقی منصوبوں میں استعمال کر سکتا ہے اور امریکی افواج کے روایتی ہتھیار فروخت اور فراہم کر سکتا ہے۔

AIPAC کے ایگزیکٹو ڈائریکٹر تھامس اے۔ ڈائن کا کہنا تھا: ''ہم ایک ایسے انقلاب سے گزر رہے ہیں جو امریکی/ اسرائیلی تعلقات کو نئی بلندیوں سے روشناس کرا رہا ہے۔ وہ پرانا نظام... جس میں اسرائیل کو ایک بوجھ/ ذمہ داری اور دنیائے عرب کے ساتھ تعلقات میں امریکہ کے لیے ایک رکاوٹ، ایک جھگڑالو لڑاکا بچہ سمجھا جاتا تھا، اب منہدم ہو چکا ہے۔ اس کی جگہ ایک نیا تعلق/ واسطہ بن رہا ہے۔ اس تعلق میں اسرائیل کو ایک اتحادی نہ کہ صرف ایک دوست اور ایک اثاثہ نہ کہ صرف بوجھ، ایک پختہ کار مدبر ساتھی نہ کہ کوئی باجگزار ریاست سمجھا جاتا ہے اور اسرائیل عمل بھی ایسا ہی کر رہا ہے۔''

فریب ''فوجی تعاون کے ماوراء، امریکی/ اسرائیلی تعلق نے ہماری قوم کو سالہا سال سے انمول سیکورٹی انٹیلی جینس مہیا کی ہے۔'' (ہائمن بک بائینڈر سابقہ نمائندہ جیوش کمیٹی ۱۹۸۷ء)

حقیقت:

CIA کے ایک سابقہ ڈائریکٹر اسٹینس فیلڈ ٹرنر کے بقول ''اسرائیلی سراغ رسانی ناکام رہی ہے۔ ان کے امریکی سلامتی کے بارے میں امداد کے دعوے نوے فیصد برائے تعلقاتِ عامہ ہیں۔'' اپنے انٹرویو کے دوران ایک اسرائیلی صحافی کے جواب میں ٹرنر نے کہا: ''تم اپنے تشدد پر قابو پانے میں ناکام رہے ہو۔ تم لبنان (۱۹۸۲ء کے حملے سے پیشتر) کے حالات کی پیش بندی میں ناکام رہے ہو۔ تمہارا خیال تھا کہ تم وہاں پر ایک عیسائی حکومت قائم کر سکو گے۔ تمہارا یہ بھی خیال تھا کہ تم وہاں سے شامیوں کو نکال باہر کرو گے۔ تم تو اسرائیل کے اندر بھی دہشت گردی نہ روک سکے۔ اسرائیلی جاسوسی اطلاعات تو عمدہ ہیں لیکن ہر پہلو سے نہیں۔ سب سے بڑھ کر تو یہ بات ہے کہ وہ اپنی قابلیت کی گراں فروشی میں بہت کامیاب ہیں!''

فریب ''اسرائیل ایک منفرد اور دلنشیں ساتھی ہے۔''

(پروفیسر اسٹیون۔ ایل۔ اسپیگل ۱۹۸۳ء)

حقیقت:

۱۹۹۰-۹۱ء کی جنگ میں... جس میں عراق نے کویت پر حملہ کیا تھا۔ اسرائیل کا سب سے بڑا کردار بس یہی تھا کہ وہ جنگ سے باہر رہے اور کچھ نہ کرے۔ جب کہ امریکی فوجی جنگ کررہے تھے۔ امریکی حکام کو بہت جلد یہ احساس ہوگیا کہ اسرائیل ایک اثاثہ نہیں بلکہ بہت بڑی رکاوٹ تھا۔ ریاستہائے متحدہ کو اپنے بہت سینئر اہلکار اسرائیل بھجوانے پڑے تاکہ وہ اس کو سمجھائیں کہ وہ اس عالمی کوشش میں حصہ نہ لے جو امریکی سربراہی میں کی جارہی تھی۔ خیال یہ تھا کہ اسرائیل اس جنگ کو اپنے توسیع پسندانہ عزائم کی بارآوری کے کام لائے گا۔ اس کی شمولیت سے اس عرب اتحاد کے بکھرنے کا خطرہ تھا جو واشنگٹن نے ترتیب دیا تھا۔

ریاستہائے متحدہ کو اسرائیل کی یہ علیحدگی خریدنے کے لیے اس کو دی جانے والی سالانہ تین ارب ڈالر امدادی گرانٹ کے علاوہ مزید ۶۵ کروڑ ڈالر کی خطیر رقم خرچ کرنا پڑی۔ اسے ۷۰ کروڑ ڈالر کا وہ استعمال شدہ اسلحہ دینا پڑا جو امریکہ یورپ سے منگا رہا تھا۔ گیارہ کروڑ ستر لاکھ ڈالر قیمت کی پیٹریاٹ میزائلیں اور چالیس کروڑ ڈالر کی قرضہ ضمانت فراہم کرنی پڑی۔

اسرائیل اب اس اتحاد کو برقرار رکھنے کے لیے نئی معقولیت تلاش کرنے میں مشغول ہے۔ آج کل کی سب سے زیادہ مقبول دلیل ایک قدیم خیال کا احیاء ہے۔ یعنی اسرائیل امریکہ کے لیے بطور ایک فرنٹ لائن گودام کے کارآمد ہوسکتا ہے جیسا کہ ایک اسرائیلی نے ۱۹۹۲ء کے وسط میں واشنگٹن پوسٹ میں لکھا کہ اسرائیل بحیرہ روم میں سب سے بڑے ایئر کرافٹ کیریئر کا کام انجام دے سکتا ہے۔

اس صورت حال میں حیفہ کی بندرگاہ کو مرکزی حیثیت حاصل ہوجاتی ہے۔ یہ پہلے ہی ہر سال امریکہ کے چھٹے بیڑے کے تقریباً ۵۲ بحری جہازوں کی مرمت اور دیکھ بھال کا کام انجام دے رہا ہے۔ امریکی بیڑے کا یہاں باقاعدہ آنا جانا ہے۔ ۱۹۹۲ء میں تقریباً پینتالیس ہزار امریکی ملاحوں نے اپنی ساحلی چھٹی حیفہ میں گزاری۔ اس کے علاوہ امریکہ کے سارے F-15 جنگی ہوائی جہاز جو یورپ میں رکھے گئے ہیں ان کی مرمت ''اسرائیل ایئر کرافٹ انڈسٹریز'' کے ذمہ ہے۔ ریاستہائے متحدہ اور اسرائیل مشترکہ طور پر ''ایرو'' نامی ''میزائل توڑ۔ میزائل'' بھی تیار کررہے ہیں۔

❋ ❋

باب: ۲۸

مشترکہ اقدار کا فریبِ نظر!

امریکی، اسرائیلی تعلقات کے بارے میں سب سے زیادہ تسلیم شدہ بے ضرر رساں فریب یہ ہے کہ ان دونوں ممالک میں کئی اقدار مشترک ہیں۔ ڈھانچہ جمہوری ہے اور دونوں انسانی حقوق کی پاسداری کرتے ہیں۔ اس خام خیالی نے ہماری تلاش امن کو پیچیدہ بنا دیا ہے۔ اسرائیل ہرگز ایک جمہوریت نہیں ہے۔ اس کا کوئی دستور نہیں ہے۔ یہاں مذہب کے نام پر عام طور پر امتیاز برتا جاتا ہے۔ اقلیتوں کے ساتھ اکثر ظالمانہ اور سخت برتاؤ کیا جاتا ہے۔ یہ ایک خصوصی امتیاز والا توسیع پسند ملک ہے۔ عالمی برادری تقریباً نصف صدی سے لگاتار اسرائیل کے ان اقدامات کی مذمت کرتی چلی آ رہی ہے جو وہ بین الاقوامی قانون کی خلاف ورزی میں کرتا ہے۔ گو یہ اقدامات امریکی قانون کی بھی خلاف ورزی ہیں لیکن ہمیں نہایت شرمندگی سے کہنا پڑتا ہے کہ ریاستہائے متحدہ اکثر اسرائیل کی پردہ پوشی اور حمایت کرتا ہے۔

فریب ''(ریاستہائے متحدہ) اسرائیل کے ساتھ ایک خصوصی تعلق رکھتا ہے۔ اس کی بنیاد مشترکہ اقدار، جمہوریت پر اعتمادی باہمی اور فوجی اتحاد ہے۔''

(ڈیموکریٹ پارٹی پلیٹ فارم ۱۹۹۲ء)

حقیقت:

اسرائیل کے کئی اقدامات ایسے ہیں جو ریاستہائے متحدہ اور کئی دیگر مغربی ممالک میں غیر قانونی شمار ہوں گے۔ ان میں خفیہ قتل، اغواء، ملک بدری، الزام لگائے بغیر یا مقدمہ چلائے بغیر قید رکھنا۔ اراضی کی ضبطی اور اجتماعی سزا شامل ہیں۔ ابھی اسرائیل کا عرصہ دراز سے اپنے مربی ملک امریکہ کے خلاف جاسوسی کرنا نہیں لکھا گیا۔ علاوہ ازیں صرف اسرائیل ہی ایک ایسا ملک ہے جہاں ایذا رسانی/تشدد کی سرکاری طور پر اجازت ہے۔

وزراء اعظم یتزاق شامیر اور مناخم بیگن دونوں ہی نے کبھی اپنی ان بداعمالیوں پر ندامت کا

اظہار نہیں کیا جو انہوں نے فلسطین میں اسرائیل کے قیام سے پیشتر یہودیوں کے دو سب سے بڑے دہشت گرد گروہوں کے لیڈران کے طور پر کیئے۔ درحقیقت ۱۹۹۱ء میں میڈرڈ میں منعقدہ امن کانفرنس میں تو اپنے خلاف ماضی کے دہشت گردانہ دور میں لگائے گئے الزامات کے جواب میں شامیر نے کہا:

''میں نے ہمیشہ یہ کہا ہے اور اب بھی کہتا ہوں کہ میں نے جو کچھ ماضی میں کیا اس پر مجھے فخر ہے۔ میں کسی ایک قدم سے بھی لاتعلقی کا اظہار نہیں کرتا... میں نے جو کیا ہے مجھے اس پر فخر ہے اور میں کسی کو بھی جواب دہ نہیں ہوں!''

چند سال پیشتر شامیر نے ایک انٹرویو لینے والے کو بتلایا تھا کہ ''کچھ لوگ کہتے ہیں کہ کسی فرد کو مارنا دہشت گردی ہے۔ لیکن ایک فوجی کیمپ پر حملہ کرنا گوریلا جنگ ہے اور شہریوں پر بمباری کرنا پیشہ ورانہ جنگ ہے۔ میرے خیال میں تو اخلاقی نقطۂ نظر سے بھی یہی بات ہے... چیدہ چیدہ نشانوں کو ہدف بنانا زیادہ زود اثر بھی ہے اور زیادہ اخلاقی بھی۔''

یہی رویہ ہے جس نے اسرائیل کو اپنے دشمن خفیہ طور پر قتل کرنا سکھلایا ہے۔ کچھ اقدامات جن کے بارے میں دستاویزی ثبوت موجود ہیں ان میں مصر میں کام کرنے والے جرمن سائنس دانوں کے خلاف ۱۹۶۰ء کی دہائی کے اوائل میں دہشت کی مہم چلانا شامل ہے جس میں کم از کم پانچ افراد کا بذریعہ لیٹر بم ہلاک کیا جانا شامل ہے۔ ۱۹۷۹ء میں عراق کے لیے کام کرنے والے ایک مصری سائنس داں کو قتل کیا گیا۔ ۱۹۹۰ء میں بیلجیئم میں ایک کینیڈین ماہر توپچی کو اس کے اپارٹمنٹ کے باہر گولی مار کر ہلاک کیا گیا۔ اس کا نام ونسنٹ بل تھا اور اس کا تعلق عراق کے اسلحہ پروگرام سے بتلایا جاتا تھا۔ یہ باور کیا جاتا ہے کہ بل کو اسرائیلی اجرتی قاتلوں نے ہلاک کیا۔

گذشتہ کئی دہائیوں سے اسرائیل نے پی۔ ایل۔ او سے تعلق رکھنے والے فلسطینیوں کے خلاف خفیہ قتل کرنے کی مہم لگاتار چلا رکھی ہے۔ اس میں ۱۹۷۳ء میں ناروے کے شہر للے ہیمر غلطی سے عرب بیرے کا قتل اور تیونس میں اپنے گھر کے سامنے PLO کے ملٹری چیف خلیل وزیر (جسے عام میں ''ابو جہاد'' کے نام سے پکارا جاتا تھا) کا قتل بھی شامل ہیں۔

فریب ''اسرائیل... امریکی امداد وصول کرنے والے ان چند ممالک میں سے ایک ہے جس نے امریکی اشاروں کا مثبت جواب دیتے ہوئے اپنی معیشت میں نمایاں اصلاحات کی ہیں۔''

(AIPAC ۱۹۹۳ء)

حقیقت:

اسرائیل دنیا کی ان معدودے چند اقوام میں شامل ہے جو اب تک سوشلسٹ معاشی نظام سے چمٹی ہوئی ہیں۔ واشنگٹن کی ان تمام کوششوں کے باوجود جو اس نے اسرائیل کے فرسودہ اور غیر مؤثر نظام کو تبدیل کرنے کے لیے کیں۔ اس کی اقتصادیات میں اب بھی زبردست حکومتی اخراجات کا عمل دخل ہے۔ ۱۹۹۱ء کے اواخر میں امپورٹ/ایکسپورٹ بینک کی ایک مطالعاتی رپورٹ میں کہا گیا تھا کہ اسرائیل پچھلے بیس برس سے ''آزاد تجارت کے لیے اصلاحات کو مؤخر کر رہا ہے'' جس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ اب امریکی امداد پر زیادہ انحصار کر رہا ہے۔

انہی دنوں ایک اور رپورٹ میں بھی یہی نتیجہ اخذ کیا گیا کہ اسرائیل اقتصادی طور پر خودنگر نہیں ہے۔ اس کا انحصار بیرونی امداد اور قرضوں کے حصول پر ہے۔ یہ رپورٹ لائبریری آف کانگریس کے اندر قائم ادارے ''کانگریشنل ریسرچ سروس'' (CRS) نے تیار کی تھی۔ اس رپورٹ میں کہا گیا تھا کہ اسرائیل کی اقتصادیات کو قرضوں کے روز افزوں سود کی ادائیگی، حکومت کے بڑھتے ہوئے فلاحی اخراجات، دائمی بھارے دفاعی اخراجات اور ایک داخلی اقتصادی جمود جس کے ساتھ عالمی کساد بازاری اور اسرائیلی مال تجارت کی مانگ میں عالمی سطح پر کمی نے ایک بحران سے دوچار کر دیا ہے۔ حالیہ برسوں میں اس کے افراطِ زر کی شرح اوسطاً بیس فیصد رہی ہے۔ یہ دوسری اقوام کے مقابلے میں بہت زیادہ ہے۔ لیکن پھر بھی یہ ۱۹۸۴ء کے ریکارڈ افراطِ زر یعنی ۴۴۵ فیصد سے بہتر تھی!

حال ہی میں سابقہ سوویت یونین سے آنے والے یہودی تارکین وطن کو بسانے کے اخراجات برداشت کر سکنے کی ایک بڑی وجہ اسرائیل کی فضول خرچی والی اقتصادیات تھی۔ اس کام کے لیے اسے ریاستہائے متحدہ سے اربوں ڈالر کی قرضہ ضمانتیں درکار تھیں۔ حالات اس قدر بگڑ چکے تھے کہ بینک آف اسرائیل نے پیشین گوئی کی کہ اگر نئی ملازمتیں پیدا نہ کی جاسکیں تو ان میں سے دو لاکھ کے لگ بھگ نئے تارکین وطن ملک چھوڑ جائیں گے۔ ۱۹۹۱ء کی رپورٹ میں درج تھا کہ افراطِ زر دہرے ہندسوں میں جا رہا تھا اور بے روزگاری جس کی موجودہ شرح گیارہ فیصد ہے اٹھارہ فیصد کو چھو سکتی ہے۔

اسرائیل کے ایک ماہرِ اقتصادیات اسٹیون پالٹ کی رائے میں ''اسرائیل کی اقتصادی پالیسی ایسی ہے جسے لحم خنزیر کا ڈرم دیوانہ وار لڑھک رہا ہو!... دنیا میں جہاں بیشتر ممالک میں زبردست اجارہ داری مخالف پالیسیاں اور نفاذ کے لیے طاقتور ایجنسیاں موجود ہیں وہاں اسرائیل میں اجارہ داری کا

رجحان نمایاں ہے۔ پیداواری صلاحیت، مارکیٹنگ، برآمدی کوٹہ، آبی اور ارضی الاٹمنٹ کو بطور امداد/سرپرستی بانٹا جاتا ہے۔کبھی ان کا نیلام نہیں ہوتا... جمہوری دنیا میں اسرائیلی تجارتی پالیسی سب سے زیادہ تحفظ یافتہ ہے... جس طرح کی درآمدی پابندیاں اور برآمدی ہیرا پھیرا اسرائیل کرتا ہے۔ اگر کوئی اور ملک اس کا عشرِ عشیر بھی کرے تو اس پر عالمی پابندیاں عائد ہوجائیں۔'' اس کے بقول: ''اسرائیل کے اپنے پالیسی ساز کچھ بھی سنجیدہ، معاشی اصلاحات بنانے میں یا تو ناکام ہیں یا ان کی نیت ہی نہیں۔'' پالٹ کا کہنا ہے کہ ریاستہائے متحدہ بھی اپنے بھاری امدادی پروگرام کے ذریعے اسرائیل پر اصلاحات کرنے کے لیے ذرّہ بھر دباؤ نہیں ڈالتا۔ ایسا نہ کرنا اسرائیل کو مزید دست نگر بنا دے گا۔

فریب ''اسرائیلیوں کو اپنی معاشیات میں ڈرامائی اصلاحات کی ضرورت کا بڑی مدت سے احساس ہے۔'' (AIPAC ۱۹۹۲ء)

حقیقت:

۱۹۸۰ء کے عشرے میں ریاستہائے متحدہ کی پوری کوشش کے باوجود اسرائیل کی سوشلزم کی اصلاح نہ ہوسکی۔ ۱۹۹۱ء میں اسرائیل کے معاشی کاروبار میں سے ساٹھ فیصد کا انحصار سرکاری مراعات یا سرکاری مد میں اخراجات پر ہی رہا۔ یروشلم میں قائم ''انسٹی ٹیوٹ آف ایڈوانسڈ اسٹریٹیجک اینڈ پولیٹیکل اسٹڈیز'' کے ایک مطالعہ میں یہ نتیجہ اخذ کیا گیا کہ اسرائیل کا مستقبل کا سراب بس یہی ہے کہ وہ اسی ناکام اندھیرے راستے پر بڑھتا جائے جہاں زیادہ سے زیادہ تر حکومت ہو!

۱۹۹۱ء میں ایکسپورٹ، امپورٹ بینک کے ایک مطالعہ میں یہ کہا گیا کہ ''اسرائیل نے اصلاحات سے پہلوتہی کی ہے اور اس کے بجائے قرضے کو بھاری دفاعی اخراجات پورے کرنے کے لیے ایک وسیع فلاحی نظام پر خرچ کے لیے اور ایک نسبتاً اونچے معیار زندگی برقرار رکھنے کے لیے استعمال کیا ہے... اگر نئے قرضے مزید لیے گئے... تو اس بات کا امکان ہے کہ اس عشرے کے اواخر تک امریکی حکومت اس پوزیشن میں ہوگی جہاں واپس کی جانے والی رقم مہیا کی جانے والی امداد سے بڑھ جائے گی۔ اس طرح امریکی حکومت اسرائیل سے سرمایہ درآمد کرنے والا ادارہ بن جائے گی۔''

۱۹۸۹ء میں امریکی ماہرین نے بھی ایک مطالعہ کرکے ایسے ہی نقائص کی نشاندہی کی تھی جو اسرائیل کی حکومتی کنٹرول شدہ معاشیات میں مزید ابتری کا باعث ہے۔ ان امور میں حکومت کی

''بدانتظامی'' کسی طویل المدتی معاشی پروگرام کا فقدان، سرکاری اخراجات پر بھاری انحصار (جو کہ اسرائیل کی کل قومی پیداوار کا دو تہائی ہے) ناکام ہوجانے والے کاروباروں کی دل کھول کر حکومتی تلافی اور اسرائیلیوں کا کم آمدنی والی نوکریاں قبول کرنے کی بجائے بیروزگاری اختیار کرنا جیسے معاملات شامل ہیں۔

یہ غیر تسلی بخش کارکردگی بڑی حد تک اسرائیلی معیشت میں، ہستادروت، کے غیر معمولی اثر ونفوذ کا نتیجہ ہے۔ یہ بھاری ادارہ یہودی جنرل فیڈریشن آف ورکرز پر مشتمل ہے، ہستادروت، اسرائیل کی یہودی ریاست کے قیام سے ہی اس کی معیشت پر حاوی رہا ہے۔ یہ اسرائیل کا سب سے بڑا آجر ہے اور اس کے اداروں میں اسرائیل کی سب سے بڑی تعمیراتی کمپنی، بینک، انشورنس کمپنیاں اور امداد باہمی کے مارکیٹنگ اور صارفین کے ادارے شامل ہیں۔

۱۹۷۰ء کے عشرہ کے وسط میں ایک مؤرخ ہارورڈ ایم۔ سچر نے لکھا تھا کہ اسرائیل کے محنت کشوں میں محنت کی اخلاقیات کا فقدان نظر آتا ہے۔ یہ جزوی طور پر 'ہستادروت' کی قوت کا نتیجہ ہے۔ 'ہستادروت' کی قیادت یقیناً محنت کی اخلاقیات کے اس زوال کی ذمہ داری سے بچ نہیں سکتی۔ جب سالہا سال سے مزدوروں کے حقوق کی ضمانت اور نظام موجود ہوتو پھر آجروں کے لیے ست الوجود اور نکمے مزدوروں کو برخواست کرنا تقریباً ناممکن ہوجاتا ہے۔ یہ رجحان کہ ہمیں کم سے کم کام کرنا ہے۔ صرف فیکٹریوں، دکانوں اور دفاتر میں ہی نہیں بلکہ سرکاری دفاتر میں ہر جگہ اور سب سے نمایاں تھا۔ محنت اور ایمانداری کا یہ ذواضعاف اقل بلا مبالغہ سارے معاشرہ میں رواں دواں نظر آتا ہے۔''

بیس برس گزر جانے کے بعد بھی اس اندھیر نگری میں کچھ فرق نظر نہیں آتا۔ یہ بھاری امریکی امداد کا ہی قصور ہے جو اسرائیل کو اپنے بنیادی مسائل سے صرف نظر کے قابل بناتی ہے۔ ان میں صرف نوکر شاہی کا گدھا پن ہی نہیں بلکہ بددیانتی کی انتہا بھی شامل ہے!

وائیومنگ کے ری پبلیکن سینٹر میلکم ویلوپ کا کہنا ہے کہ ''دنیا سوشلزم سے کنارہ کشی کر رہی ہے اور ہم ایک ایسے ملک کی امداد کر رہے ہیں جو بنیادی طور پر سوشلسٹ ہے۔ یعنی اسرائیل! جو تبدیلی کا خواہاں نہیں۔ وہاں پر آزاد تجارت عنقا ہے۔ اس کی معیشت میں عظیم اور گمراہ کن امدادی رقوم کا ہر طرف دور دورہ ہے۔ کئی لحاظ سے یہ ہماری امداد کی وجہ سے ہے۔''

گویا اسرائیلی ماہر اقتصادیات ایلون۔ راشکا کے الفاظ میں ''اس بات پر انگلی اٹھائی جاسکتی ہے

کہ امریکی ٹیکس گزار حکومت اسرائیل کو امدادی رقوم کیوں فراہم کرے؟ جو اس رقم کو پھر اپنی سوشلسٹ معیشت پر خرچ کرتی ہے۔"

فریب "اسرائیلیوں کا معیار زندگی آہستہ آہستہ گر گیا ہے جس کی جزوی وجہ ہماری حکومت کا غیر معمولی دفاعی بوجھ ہے۔" (AIPAC ۱۹۹۲ء)

حقیقت:

اسرائیلیوں کا موجودہ معیار زندگی ہمیشہ کے مقابلے میں اب بدرجہا بلند ہے۔ یہ بھاری امریکی امداد اور بیرون ملک یہودی حمایتیوں کے ہر سال تقریباً ایک ارب ڈالر کے تمسکات اور عطیات خریدنے/بھیجنے کا نتیجہ ہے۔ اسرائیل کے دفاعی اخراجات کا ایک بڑا حصہ تو ریاستہائے متحدہ برداشت کرتا ہے۔ امریکہ کے جنرل اکاؤنٹنگ آفس کی رپورٹ کے بموجب ۱۹۸۳ء تک اسرائیل کے دفاعی بجٹ میں امریکہ کا حصہ ۳۷ فیصد تک پہنچ چکا تھا۔

۱۹۹۲ء کے وسط میں "واشنگٹن پوسٹ" کے جیکسن ڈاہل کا کہنا تھا کہ "۱۹۶۷ء کی عرب اسرائیل جنگ جیتنے کے بعد پچیس برسوں میں اسرائیل ایک راہبانہ، سوشلسٹ، الگ تھلگ اور اعلیٰ فوجی تیاری والے ملک کی جگہ اب ایک جدید خرچیلے معاشرے میں ڈھل چکا ہے جہاں مغربی لادینی ثقافت کا راج ہے۔ پچھلے دس سالوں میں تو خصوصاً خوش حالی اور خرچ کرنے کا ایک طوفان سا بپا ہے۔"

ان سب کے باوجود اسرائیل کی سوشلسٹ اقتصادیات انحطاط پذیر ہے۔ قتل عام سے بچ نکلنے والے ایک موجودہ امریکی صنعت کار مارٹن بارال کا کہنا ہے کہ "اسرائیل کی ریاست اپنے قیام ہی سے اقتصادی خودکشی کی راہ پر گامزن ہے۔" بقول اس کے ڈیوڈ بن گوریان اور دوسرے تمام صیہونی آبادکار جو فلسطین میں آ کر آباد ہوئے ایسے مشرقی یورپی سوشلسٹ اور کمیونسٹ تھے جو زیرِ تسلط معیشت پر ایمان رکھتے تھے۔ بارال کا نسخہ بھی بیشتر دوسرے ماہرین اقتصادیات کی طرح جنھوں نے اسرائیل کے معاشی بحران کا مطالعہ اور تجزیہ کیا ہے، یہی ہے کہ سرکاری ملکیت کے اداروں مثلاً ٹیلیفون، کیمیادی اشیاء، ہوائی جہاز، دفاع اور دیگر صنعتوں کو نجی ملکیت کے ہاتھوں فروخت کر دیا جائے۔ نوکر شاہی کے عظیم بوجھ کو انتہائی کم کر دیا جائے۔ کیونکہ اس سے آزادانہ مسابقت کا گلہ گھونٹ دیا جاتا ہے اور ٹیکس کم کیے جائیں۔

اسرائیل کے حکومتی تنظیم والے نظام کا یہ ثمر ہے کہ وہاں ہر مغربی ملک کی نسبت چھوٹے

کاروباروں کی تعداد کافی قلیل ہے۔ بارال کے خیال میں اگرچھوٹے کاروبار کی حوصلہ افزائی کی جائے تو اسرائیل کا بے روزگاری کا اعشاریہ جو دس فیصد سے زائد رہتا ہے کافی کم کیا جاسکتا ہے۔ کیونکہ ایسے کاروبار روزگار کے مواقع کو تیزی سے بڑھانے کے لیے ایک تیز ترین شارٹ کٹ ہیں۔

بقول وزیر اعظم یٹزاق رابن کے (۱۹۹۲ء کے وسط میں اپنے افتتاحی خطاب میں کہا) ''کاغذی کارروائیاں تو بے تحاشہ ہیں لیکن پیداواری صلاحیت نہ ہونے کے برابر!''

فریب ''امریکہ اور اسرائیل کے مابین ایک خصوصی تعلق ہے۔ تمام اقوامِ عالم میں ہمارا رشتہ منفرد ہے۔'' (کلنٹن، ڈیموکریٹ صدارتی امیدوار ۱۹۹۲ء)

حقیقت:

اسرائیلی لیڈر بڑی باقاعدگی سے ریاستہائے متحدہ پر تند و تیز نکتہ چینی کرتے رہتے ہیں۔ بقول ایک برطانوی مصنف ایرک سلور کے یہ ''ایک جونیئر ساتھی کی طرف سے اپنے مال دار اور عظیم الشان مربی کے خلاف تند و تیز ترین جلے کٹے حملے تھے۔''

سلور کا اشارہ وزیر اعظم مناخم بیگن کے امریکی سفیر سیموئل لیوئس پر حملے کی جانب تھا۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب ۱۹۸۱ء میں امریکہ نے اسرائیل کے ساتھ اپنا نیا فوجی اتحاد کا معاہدہ وقتی طور پر معطل کر دیا تھا۔ بیگن نے لیوئس کو اپنے گھر طلب کیا اور کہا کہ ''تمہیں ہرگز یہ حق نہیں پہنچتا کہ تم شہری ہلاکتوں پر ہمیں نصیحت کرو۔ ہم نے دوسری عالمی جنگ کی تاریخ کا مطالعہ کر رکھا ہے اور ہمیں یہ علم ہے کہ جب آپ دشمنوں کے خلاف کوئی اقدام کرتے تھے تو شہریوں پر کیا گزرتی تھی۔ ہم نے ویٹ نام جنگ کی تاریخ بھی پڑھی ہوئی ہے آپ کا محاورہ "Body-Count" ہمیں معلوم ہے... کیا ہم ایک باجگوار ریاست ہیں؟ ایک نقلی ری پبلک؟ کیا ہم چودہ سالہ لونڈے ہیں جن کو مناسب رویہ نہ دکھلانے پر پوروں پر ضربات لگائی جائیں؟... بنی اسرائیل ۳۷۰۰ سال بغیر کسی امریکی مفاہمتی یادداشت کے زندہ رہے...! اور ہم مزید تین ہزار سات سو سال بغیر اس کے جی سکتے ہیں۔''

جب سکریٹری آف اسٹیٹ الیگزینڈر ہیگ (جس کے بارے میں بیشتر نقادوں کا کہنا ہے کہ اس نے خفیہ طور پر اسرائیل کو ۱۹۸۲ء میں لبنان پر حملہ کرنے کے لیے سبز جھنڈی دکھلائی!) نے سرکاری طور پر بیگن سے اصرار کیا کہ وہ حملہ شروع نہ کرے تو وزیر اعظم بیگن نے جوابی حملہ کے طور پر کہا کہ ''میرے عزیز دوست، مسٹر سکریٹری! وہ آدمی ابھی پیدا ہی نہیں ہوا جو مجھ سے یہ اجازت حاصل کر سکے

کہ میں ایک خون آشام دشمن کے ہاتھوں یہودیوں کو ہلاک ہونے دوں اور جو اس خون خرابے کے ذمہ دار ہیں انہیں معافی حاصل رہے!''

سکریٹری آف اسٹیٹ جارج شلز جسے اسرائیلی واشنگٹن میں اپنا بہترین دوست سمجھتے تھے، ۱۹۸۴ء کے اواخر میں اسرائیل کو یہ انتباہ دے رہا تھا کہ اسے اپنی سالانہ دو اعشاریہ چھ ارب ڈالر امدادی گرانٹ کے علاوہ مزید ۸۰ کروڑ ڈالر کی گرانٹ نہیں ملے گی۔ اگر وہ معاشی کفایت شعاری کے اقدامات نافذ کرنے میں ناکام رہا! اسرائیل کے معاشی رابطہ کے وزیر گادیا کووی نے اس نصیحت کے جواب میں کہا کہ ''اسرائیل کو ریاستہائے متحدہ سے اخلاقی وعظ سننے کی ضرورت نہیں۔ یہودیوں کے معاملات کی ذمہ داری صرف یہودی لوگوں کے ہاتھ ہے۔''

جب کارٹر انتظامیہ نے اسرائیل کے غربی کنارے سے انخلاء کے لیے کہا تو موشے دایان، وزیر دفاع نے بڑے تکبر سے ۱۹۷۹ء میں کہا: ''میں یہ جانتا ہوں کہ تم امریکی یہ سمجھتے ہو کہ تم ہمیں غربی کنارہ سے بہ جبر نکال سکتے ہو۔ لیکن تم واشنگٹن میں ہو اور ہم یہاں! اگر ہم اپنی بستیاں بسانا جاری رکھیں تو تم کیا کرلو گے؟ بھیں! بھیں! اگر ہم اپنی فوج کو وہیں رکھیں تو تم کیا کرلو گے؟ اپنی فوج بھیج دو گے؟''

یہ بے عزتیاں تمام نہیں ہوئی ہیں۔ شامیر کابینہ کے ایک رکن وزیر سائنس یووال نیمان نے ۱۹۹۲ء میں صدر جارج بش کے بارے میں کہا ''ہم نے ریاستہائے متحدہ میں اس قدر یہود مخالف اور اسرائیل مخالف حکومت آج تک نہیں دیکھی جو آج کل دیکھ رہے ہیں۔''[1]



[1] یاد رہے کہ جارج بش ہی تھا جس نے کویت کو آزاد کرانے کے بہانے عراق پر حملے کو منظم کیا... (مترجم)

ہماری دیگر اہم مطبوعات

☆ **ادراک زوال امت** مصنف:راشد شاز ، قیمت: 200روپے (571صفحات)

(جلداول)

اس کتاب میں بنیادی طور پر انہی مظاہر عمل کو سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے کہ اسلام کی ابتدائی صدیوں میں کس طرح وحی کے بجائے متعلقات وحی کو اس قدر اہمیت ملتی گئی کہ مسلم حنیف ہونا بڑی حد تک ایک تہذیبی شناخت بن کر رہ گیا۔ یہ آفاقی امت جسے سیادت عالم کے منصب پر فائز کیا گیا ہے، فرقۂ محمدی کے نفسیات میں محصور ہوگئی۔ حتیٰ کے ہمارے فقہاء نے دنیا کو اسلامی اور غیر اسلامی سرزمین میں بانٹ ڈالا اور ایسا محسوس ہوا کہ مسلم آبادی کے علاقوں کے علاوہ دنیا کے دوسرے خطوں کا ہم سے کوئی تعلق نہیں۔

☆ **ہندوستانی مسلمان: ایام گم گشتہ کے پچاس برس** مصنف:راشد شاز قیمت:250روپے (360صفحات)

ہندوستانی مسلمانوں کی پچاس سالہ تاریخ مجرمانہ خاموشی کی شرمناک داستان ہے۔ سیکولر دانشور ہوں یا مذہبی علماء، ملی قائد ہوں یا روحانی گدی نشین، یہ سب گذشتہ پچاس سالوں سے مداہنت کے عذاب میں مبتلا ہیں۔ ہم بحیثیت امت یہ بالکل بھول گئے کہ ہندوستان کی سرزمین میں جہاں ۱۹۴۷ء کی نئی سیاسی صورت حال نے ہمیں ایک اجنبی ملک کا باشندہ بنا دیا تھا اس میں ہمارے لئے زندگی جینے کا اگر کوئی جواز ہوسکتا تھا تو وہ کیا تھا؟ نئے ہندوستان میں جہاں مسلمان ایک قوم کی محکومی سے نکل کر دوسری قوم کی سیاسی محکومی میں چلے گئے تھے وہاں ہماری اسٹریٹیجی کیا ہونی چاہیے تھی؟ ہم اس مسئلہ پر گفتگو سے گریز کرتے رہے کہ نئے ہندوستان مین ہمارا ملی ایجنڈا کیا ہونا چاہیے۔ گذشتہ پچاس برس ہماری ملی تاریخ میں عہد سیاہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ایک ایسا عہد جسے ہم ایامِ گم گشتہ سے تعبیر کرسکتے ہیں۔

☆ **اسلام: مستقبل کی بازیافت** مصنف:راشد شاز قیمت: 60روپے (160صفحات)

اب وقت آگیا ہے کہ ہم چودہ صدیوں پر محیط تہذیبی ورثے پر بلا خوف لومتہ لائم تنقیدی نگاہ ڈالیں۔ خدا کے کلام اور رسول ﷺ کی سنت کے علاوہ ہمارے لئے کوئی چیز تحلیل و تجزیے اور محاکمے سے بالاتر نہیں ہونی چاہیے۔ اس سرزمین پر کوئی ایسا مسئلہ نہیں جس پر زباں بندی کو غایتِ دین سمجھا جائے یا جسے سیکورٹی زون قرار دے کر وہاں کسی مناقشے کو داخل ہونے سے روکا جائے۔ وحیٔ ربانی کی روشنی میں جب تک ہم اپنی پوری تاریخ کا تنقیدی محاکمہ نہیں کرتے ہمیں اس بات کا واقعی اندازہ نہیں ہوسکتا کہ پانی مرتا کہاں ہے۔

☆ **مسلم ذہن کی تشکیلِ جدید** مصنف:راشد شاز قیمت:150روپے (197صفحات)

ہمیں دیر یا سویر اس حقیقت کو تسلیم کرنا ہوگا کہ قدماء کی طرح اللہ تعالیٰ نے ہمیں بھی ایک عدد دماغ سے نوازا ہے جس کا بنیادی فریضہ غور و فکر اور تدبر و تفکر ہے اور جس سے محض ٹوپی رکھنے کا کام لینا یا تربوش برادری کے لئے اسے استعمال کرنا کفرانِ نعمت، بلکہ بغاوت ہے۔ جب تک ہم پھر سے دل و دماغ کو حرکت میں نہیں لاتے اور وحیِ ربانی کی تجلیوں سے اپنی راہوں کو منور کرنے کا حوصلہ پیدا نہیں کرتے قدماء کے التباسات ہمارا پیچھا کرتے رہیں گے۔

☆ **غلبۂ اسلام اور دوسری تحریریں** مصنف:راشد شاز قیمت: 140روپے (244صفحات)

غلبۂ اسلام موجودہ فقہی مسلمانوں کے عروج، ان کے سیاسی جاہ و حشم یا ان کی مادی خوشحالی کا نام نہیں بلکہ ایک ایسی صورت حال کا بیان ہے جس میں تمام ہی انسانوں کی نجات اور ان کی فلاح و بہبود کے امکانات میسر ہوں۔ توحید خالص پر مبنی ایک ایسا معاشرہ جہاں عبودیت کے جملہ ابعاد کا ادراک اور اس اکتساب و انبساط ہر شخص کی دسترس میں ہو۔ زمینی حکمرانیاں، نسل و رنگ کے امتیاز اپنا اعتبار کھودیں، عرب و عجم، مشرق و مغرب کا امتیاز یکسر مٹ جائے اور ایک ایسی صورت حال پیدا ہو جسے بالفاظ قرآن ویکون الدین کلہ للہ پر محمول کیا جاسکے۔

☆ **تاریخ زوال امت** مصنف:میاں محمد افضل قیمت:180روپے (432صفحات)

اسلامی تاریخ میں ملت کو پیش آنے والے صدمات و حادثات میں سے ہم نے صرف انہی واقعات کو منتخب کیا ہے جن کے اثرات صدیوں تک محسوس کئے گئے یا کئے جائیں گے۔ یہ وہ دردناک حوادث ہیں جن کے لگائے ہوئے زخموں سے اب تک خون رس رہا ہے۔ ان واقعاتِ عبرت کو غالباً پہلی بار ایک کتاب کی شکل میں قوم کے سامنے پیش کیا جارہا ہے۔

☆ **یہودی پروٹوکولز** مترجم:محمد یحییٰ خان قیمت 150روپے (304صفحات)

پروٹوکولز کا یہ ترجمہ جسے فاضل مترجم نے بعض ضروری اور انتہائی اہم معلومات کے ساتھ ترتیب دیا ہے موجودہ عالمی نظام کے دجل و فریب کو سمجھنے میں مدد دے گا۔ اور ہم خیر امت کی حیثیت سے اہل یہود کے گم کردہ قافلے کو صحیح سمت دینے اور انہیں راہ یاب کرنے میں پہلے سے کہیں زیادہ مؤثر ثابت ہوں سکیں گے۔

☆ سیرت ﷺ ابن اسحاق   مصنف: محمد بن اسحاق بن یسار قیمت: 250 روپے (504 صفحات)

دنیا کو تیرہ سو سال سے جس کتاب کی تلاش تھی وہ بالآخر تلاش بسیار کے بعد دستیاب ہوگئی۔ اس کتاب کو سیرت کے موضوع پر دنیا کی سب سے پہلی باقاعدہ تصنیف کا اعزاز حاصل ہے۔ اہل علم اس کتاب کے تذکرے سے تو واقف تھے لیکن اصل کتاب تک ان کی رسائی اب تک ممکن نہ تھی۔ یہ محض اللہ کا شکر ہے کہ اس نے اس دور کے ایک بڑے اسلامی محقق ڈاکٹر محمد حمید اللہ (پیرس) کو یہ توفیق بخشی کہ وہ اس ناپید کتاب کے اجزاء کو دنیا کی مختلف کتب خانوں سے ڈھونڈ نکالیں۔ گو کہ اس وقت دنیا میں اس کتاب کا کوئی مکمل نسخہ دستیاب نہیں ہے، لیکن اس کی کمی کسی حد تک اس بات سے پوری ہو جاتی ہے کہ سیرت ابن ہشام بڑی حد تک ابن اسحاق کا ہی جدید مدوّن ایڈیشن ہے۔ البتہ ابن ہشام نے جن باتوں کو اپنی کتاب میں شامل کرنا ضروری نہ سمجھا، ان باتوں کے لیے ابن اسحاق کا یہ نسخہ ایک اہم مصدر کی حیثیت رکھتا ہے۔ گذشتہ ۱۳ سو برسوں میں فن سیرت نگاری نے ارتقاء کی بہت سی منزلیں طے کی ہیں، لیکن اس موضوع پر اس پہلی تصنیف کو جو اہمیت حاصل ہے وہ یقیناً کبھی کم نہیں ہوگی۔

☆ شکنجۂ یہود   مترجم: سعید رومی   قیمت: 170 روپے (448 صفحات)

اس کتاب میں صرف امریکہ کی یہودی لابی کا تذکرہ ہے۔ یہ بات ذہن نشیں رہنی چاہئے کہ مغربی دنیا اور سابق سویت یونین اور مشرقی یورپ کے تمام ممالک میں اسی طرح کی یہودی اسرائیلی لابیاں موجود ہیں اور ان ممالک کے سرکاری اور نجی امور پہ قابض ہیں۔ ہر ملک کی یہودی اسرائیلی لابی متعدد کمیٹیوں اور ذیلی تنظیموں پر مشتمل ہے۔ یہ تمام یہودی اسرائیلی لابیاں عالمی صہیونی تنظیم یعنی ورلڈز اکنسٹ آرگنائزیشن (World Zionist Organization) کے تحت کام کرتی ہیں جو کہ اسرائیلی یہودیوں سمیت تمام دنیا کے یہودیوں کی مرکزی قیادت تسلیم کی جاتی ہے۔

☆ پردہ مگر کس حد تک؟   مصنف: راشد شاز   قیمت: 30 روپے (71 صفحات)

اسلام نہ تو عورت و مرد کو الگ الگ خانوں میں رکھنے کا قائل ہے اور نہ آزادانہ اختلاط کی اجازت دیتا ہے۔ یہاں نہ تو عورتوں کو گھروں میں مقفل کر دینے کی کوئی گنجائش ہے اور نہ اس بات کی اجازت کہ اللہ کی بندیاں رقص و سرور کی محفلوں میں حدود اللہ کی پامالی کریں۔

☆ **مسلم سیاسی پارٹی** مصنف:راشد شاز قیمت: 15روپے (47صفحات)

ہندوستان میں مسلم سیاسی پارٹی کا تصور اب عام گفتگو کا موضوع بن چکا ہے۔اس کتابچے میں سیاسی پارٹی کے خدوخال پر بھرپور مدلل گفتگو ملتی ہے،توقع ہے جولوگ اس ملک میں ہندوستانی مسلمانوں کی سیاسی صف بندی کے خیال سے خوف کھاتے ہیں انہیں اس کتاب سے حوصلہ ملے گا۔

☆ **ہندوستانی مسلمان: فکری اور عملی ارتداد کی زد میں** مصنف:راشد شاز قیمت: 10روپے (22صفحات)

پہلی بار مسلمانوں میں یہ احساس عام ہورہا ہے کہ اس ملک میں اب بھی وہ کلیدی رول انجام دے سکتے ہیں۔ اب جب کہ باشعور حلقوں میں نئی مسلم فکر پر بحث جاری ہے ضرورت اس بات کی ہے کہ اس بارے میں کتاب وسنت کے احکام کو ہر خاص وعام تک پہنچایا جائے۔

☆ **اسلامی انقلاب کا طریقۂ کار** مصنف:راشد شاز قیمت: 10روپے (48صفحات)

جدید دنیا میں اسلامی انقلاب کیسے برپا ہوسکتا ہے؟ اس کا واقعی طریقۂ کار کیا ہے؟ دنیا کے سب سے بڑے انقلابی اور اللہ کے آخری رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مبارکہ کی روشنی میں عصر حاضر کے لئے ایک انقلابی لائحہ عمل کیسے ترتیب دیا جاسکتا ہے؟ یہ وہ سوالات جن پر اس مختصر سی کتاب میں بحث کی گئی ہے۔

☆ **مسلم مسئلہ کی تفہیم** مصنف:راشد شاز قیمت:80روپے (120صفحات)

یہ کتاب ہندوستانی مسلمانوں پر بیتنے والے ایک انتہائی دردناک المیہ سے متعلق ہے۔امت کا بڑے سے بڑا دانشور اور بیدار مغز عالم بھی فکری ارتداد کی شدت کو محسوس کرنے سے قاصر ہے۔اس مختصر سی کتاب میں دراصل اسی تکلیف دہ عمل پر مختلف پہلوؤں سے گفتگو کی گئی ہے۔

☆ **پیغمبر اسلام** مصنف:ڈاکٹر حمید اللہؒ قیمت:300روپے (672صفحات)

ڈاکٹر محمد حمید اللہؒ نے یہ کتاب فرانسیسی زبان میں تحریر کیا۔ اس کتاب کا پورا نام *Le Prophete l'Islam: Sa Vie et Son Oeuvre.* ہے۔(یعنی پیغمبر اسلام: حیات و کارنامے) اس کتاب کا انتہائی سلیس اور رواں ترجمہ پروفیسر خالد پرویز صاحب (پاکستان)، نے کیا ہے۔سیرت کے موضوع پر یہ ایک انتہائی محقق تصنیف ہے۔

عربی اور انگریزی زبان میں
ہماری چند اہم مطبوعات

قیمت	مصنف	نام کتاب
350/-	راشد شاز	محاولة لفهم ازمة المسلين
£45	راشد شاز	إدراك اسباب تراجع الامة (مطبوعه دارالحكمة لندن)
100/-	راشد شاز	فيو تشر اسلام
£2.99	راشد شاز	الحجاب ولكن الى اى مدى (مطبوعه دارالحكمة لندن)
£9.99	راشد شاز	الإسلام إعادة اكتشاف المستقبل (مطبوعه دارالحكمة لندن)
110/-	By Rashid Shaz	Understanding the Muslim Malaise
380/-	By An-Nabhani	The Social System in Islam
490/-	By An-Nabhani	The Economic System in Islam
590/-	By An-Nabhani	The Islamic State
450/-	By A.Q. Zalloom	Funds in the Khilafah State
450/-	By A.Q. Zalloom	How the Khilafah was Destroyed
1650/-	By Rashid Shaz	In Pursuit of Arabia
395/-	By Rashid Shaz	Islam: Negotiating the Future
495/-	By Rashid Shaz	Creating a Future Islamic Civilization



کچھ مصنف کے بارے میں

جناب پال فنڈلے ۱۹۶۲ء سے ۱۹۸۴ء تک امریکی ایوان نمائندگان (کانگریس) کے منتخبہ رکن رہے۔ تاآنکہ امریکن یہودی لابی نے ایک زبردست دجل وفریب کی مہم اور زرکثیر کے صرف سے انہیں شکست دلوا کر چھوڑی! لیکن اللہ تعالی کی حکمتوں کا کون پورے طور پر احاطہ کرسکتا ہے! یہ اسی شکست کا نتیجہ ہے کہ انہوں نے (اس فرصت کو کام میں لاتے ہوئے) ''امریکن یہودی لابی'' کے رخ سے نقاب سرکانے والی معرکۃ الآرا کتاب *They Dare to Speak Out* شائع کی۔

تاحال صرف امریکہ ہی میں اس کتاب کی تین لاکھ سے زائد جلدیں فروخت ہوچکی ہیں اور باقی دنیا میں مختلف زبانوں میں اس کے تراجم کی فروخت اس کے علاوہ ہے۔

یہ موجودہ کتاب بھی اس inspiration کا ایک تسلسل ہے۔ اس میں جناب پال فنڈلے نے امریکن یہودی لابی کے ساتھ ساتھ اسرائیل کے مکروہ چہرے سے بھی نہ صرف نقاب سرکایا ہے بلکہ نوچ ڈالا ہے۔

سعید رومی



ISBN 81-87856-11-4

9788187856115

milli publications